واجدہ تبسم
نتھ اُترائی

واجدہ تبسم

# نتھ اترائی

طوائفوں کی کہانیاں

شمع بک ڈپو
نئی دہلی

ان افسانوں کے تمام کردار، مقامات، واقعات اور ادارے فرضی ہیں اور ان کا کسی شخص، جگہ، واقعہ یا ادارے سے کوئی تعلق نہیں ہے، کسی فرد، مقام یا ادارے سے مطابقت قطعی اتفاقیہ ہے اور اس کے لئے مصنف یا پبلشرز کسی طرح کی ذمہ داری قبول نہیں کر سکتے۔

شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

قیمت : تیس روپے (Rs.30/-)



پہلی بار دو ہزار اکتوبر ۱۹۸۱ بمبئی آفسیٹ پریس، نئی دہلی

# نتھ اترائی

## طوائفوں کی کہانیاں

واجدہ تبسم

شمع بک ڈپو
آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

# قوسِ خیال

# قوسِ خیال

کسی بھی مجرم کو اپنے اعمال کا حساب اُس وقت دینا پڑتا ہے جب اس پر فردِ جرم عائد کی جاتی ہے ـــــ میں کہاں کی مجرم تھی کہ مجھے صفائیاں دینے کی ضرورت پڑتی ـــ؟ لیکن میری ہر کتاب چھپتے وقت مجھے کچھ ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑتا ہے جیسے میں مجرموں کے کٹہرے میں کھڑی ہوں ـــــ خدا کا بے پناہ شکر اور فضل ہے کہ اس نے مقبولیت کی بلندیاں عطا کی ہیں، لیکن اسی کے ساتھ سنگباری بھی میرا مقدر ہے ـــــ اب اس کتاب "ننھ اُترائی" کی کہانیوں کو ہی لے لیجیے:

طوائفیں ہمارے معاشرے کی بڑی مظلوم مخلوق ہیں۔ مجھ سے پہلے بھی جانے کتنے لکھنے والوں نے اس بے پناہ تیز، حد درجہ گرم اور ناقابلِ یقین حد تک دردناک موضوع پر قلم اُٹھایا ہے ـــ یہ عجیب و غریب بات ہے کہ ایک مرد، عورت پر کچھ لکھے تو اُسے قابلِ اعتراض نہیں گردانا جاتا۔ اور عورت، ایک عورت پر لکھے تو

"فحش نگار" جیسے خطاب سے نوازا جاتا ہے ۔۔۔ میں نے یہ کہانیاں لکھیں ۔۔۔ اور اعتراضات کی باڑھ آگئی ۔۔۔!!

بعضوں کا اعتراض تھا کہ "جذبے کی شدّت کے بنا اس قدر سچی لگتی ہوئی کہانیاں کیسے لکھی گئیں ۔۔۔"

بعضوں کا کہنا تھا "یہ کہانیاں سرے سے حقیقی ہیں ہی نہیں ۔۔"

بعض لوگوں نے کہا اس میں بناوٹ کا عنصر زیادہ ہے ۔۔ کیونکہ طوائف ایسی مخلوق ہے جو گھروں کو اُجاڑتی ہے ۔۔ لوگوں کی جیبوں پر ڈاکے ڈالتی ہے ۔۔۔ بھرے پُرے گھر تباہ کرتی ہے۔ ایسی مخلوق سے ہمدردی کیوں ۔۔۔

بعضوں نے مجھ سے بالمشافہ کہا کہ "جب آپ ایسی کہانیاں لکھتی ہیں جن میں طوائف سے ہمدردی اُبھرتی ہے تو لازماً کسی نہ کسی قاری کے ذہن میں اُسے ایسی گندی زندگی سے پناہ دلانے کا جذبہ ضرور پیدا ہوگا ۔۔ تو کیا آپ چاہتی ہیں کہ سڑک پر رُلنے والی یہ مخلوق شریف گھرانوں کی عزّت سے کھیلے ۔۔؟"

بعض لوگوں کا اعتراض تھا کہ "طوائف میں سرے سے شرافت ہوتی ہی نہیں ۔۔۔ آپ نے ایسی غیر حقیقی اور "آسمانی" مخلوق کو، جو بے راہ روی میں اپنی مثال آپ ہوتی ہے ۔۔ اتنا بلند درجہ کیوں کر دیا جو ناقابلِ یقین ہے ۔۔"

ان سارے اعتراضات میں ایک بات کافی حد تک مُشترک ہے اور وہ یہ کہ یہ ساری کہانیاں محض خیالی ہی ہیں۔ حقیقی زندگی میں، ہمارے اپنے معاشرے میں ۔۔۔ کم سے کم ہمارے آس پاس ایسے کردار ہوتے ہی نہیں ۔۔۔!!

مجھ سے کہا جاتا ہے کہ "آپ کی کہانیوں کی ہر طوائف، ایسا لگتا ہے نیکیوں کا مجسمہ اور شرافت کا پیکر ہے ۔۔۔ اور اگر وہ ایسی ہی شرافت اور نیکی کی پتلیاں تھیں تو انہیں "بازار" میں بیٹھنے کی کیا مار پڑی تھی ۔۔؟؟"

بس یہی ایک سوال ہے، جس میں میرے سارے جواب بند ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ میری کہانیوں کی ہر طوائف شریف ـــ یا بقول آپ پڑھنے والوں کے "نیکی کا مجسمہ" نہیں ہے ـــ "ہنسی کہاں پہ کھو گئی" کی طوائف کو لے لیجئے ـــ وہ ببانگِ دہل اعلان کرتی ہے کہ "ہاں میں جسم بیچتی ہوں اور پیسہ حاصل کرتی ہوں ـــ وہ بھی کس مکاری سے! گاہکوں کو نچوڑ لینے کی حد تک مکاری سے" وہ آخر تک شرافت یا نیکی کا دعویٰ نہیں کرتی۔ اس کا سیدھا سادا سوال تو یہی ہے۔ مجھ سے ہی نہیں ـــ آپ سب ہی سے کہ اس کی ہنسی جو اس کا سرمایہ ہے ـــ کہاں کھو گئی ہے ـــ کس نے چھینی ـــ؟ آپ کے پاس اس کا جواب ہے ـــ؟ اور یہ بتا دوں کہ کردار اسی دُنیا کا ہے ـــ کانچ کی طرح نوک دار ـــ اور نوک کی طرح دل میں اُتر جانے والا ـــ

پھر "چاندنی" ہے ـــ مامتا کی فطری پکار سے عورت تو عورت۔ آپ میں سے پڑھنے والے جو مرد ہیں ـــ وہ بھی کبھی منکر ہو سکتے ہیں؟؟ ہر گز نہیں ـــ عورت کی فطرت کا یہی جذبہ اسے قدسیوں سے بھی ممتاز کر دیتا ہے ـــ خدا مرد کو پیدا کر کے اتنا مغرور نہیں ہوا ہوگا جتنا عورت کو پیدا کر کے ـــ اپنے حسابوں عورت بھی خالق ہے ـــ خالق مرد بھی ہو سکتا ہے۔ مصوّر، شاعر، ادیب یہ سب خالق ہوتے تو ہیں۔ لیکن کسی جاندار کو تخلیق کرنا!! یہ رُتبہ خُدا کے بعد صرف عورت کو مِلا ہے۔ اور مامتا تو وہ جذبہ ہے جو عورت صرف بچے ہی میں نہیں ـــ جانوروں میں، بلکہ مرد میں بھی تلاش کر لیتی ہے۔ ورنہ آپ "زخمِ تمنا" کہانی کبھی نہ پڑھ پاتے۔ جو اتنی ہی حقیقی اور سچی ہے جتنی کہ یہ تحریر جو اس وقت آپ کی نگاہوں کی زد میں ہے۔

میں نے یہ کب دعویٰ کیا ہے کہ میں نے صرف آسمانی اور غیر مادرائی ہستیاں ہی طوائف کے روپ میں پیش کی ہیں ـــ "نتھ اُترائی" کی "جیتوں" کے نیاز

حاصل کیجئے۔ ایسی خرانٹ اور "گھر بگاڑو" ہستیاں آپ نے کم ہی سُنی ہوں گی لیکن میں عملی زندگی میں "جینوں" کی بیٹی۔ مظلوم بیٹی سے ملنے کا دُکھ بھوگ چکی ہوں۔ اگر اللہ نے میرے ہاتھ میں، مجھے کسی لائق جان کر، قلم دیا ہی ہے تو ایسے ایسے واقعات دیکھ سُن کر بھی میں خاموش بیٹھی رہوں تو یہ قلم سے ناانصافی ہوگی اور خدا نے جو فرض میرے ذمہ لگایا ہے اُس سے سخت قسم کی کوتاہی بھی۔ ویسے عورت کے دُکھ عورت ہی اچھی طرح سمجھ سکتی ہے!

میں نے اپنے فرض کو تو غالباً زندگی میں۔ یعنی جب سے اب تک لکھ رہی ہوں، ایک ہی جگہ پورا کیا ہے۔ وہ ہے میرا ناول "قصاص"۔ یہ بھی ایک! جی نہیں بلکہ دو طوائفوں پر مشتمل ایک خونچکاں داستان ہے جو ایک ماں اور بیٹی کے گرد گھومتی ہے۔ وہ ناول آپ پڑھیں گے تو آپ کو اندازہ لگانے میں دشواری نہ ہوگی کہ شرافت بھی کسی کی میراث نہیں۔ اور کمینگی بھی کسی کی فطرت نہیں۔

بہرکیف اس ناول کا ذکر تو سرِراہے آگیا ہے، شاید اس لئے کہ وہ بھی طوائف کے ہی متعلق ہے، لیکن بات دراصل اس کتاب "نتھ اترائی" کی ہو رہی تھی۔

لوگ جو مجھ سے کہتے ہیں کہ پتہ نہیں آپ کہاں کہاں کے کردار اُٹھا لاتی ہیں تو آپ سے بتادوں کہ میرے سارے کردار اسی میری آپ کی دُنیا کے ہوتے ہیں۔ یہ بچپن سے میری عادت ہے جن لوگوں کو شرفا منہ لگانا بھی پسند نہیں کرتے، میں ان سے گھُل مل جاتی ہوں۔ کوئی فقیرنی دروازے پر آجائے تو میں اس کی زندگی میں اتر جاتی ہوں۔ میرے میاں کبھی کبھی ڈراتے بھی ہیں۔

"آپ اپنی ان عادتوں کی وجہ سے ایک نہ ایک دن گھر لٹوا کر رہیں گی۔"

"میں سوچتی ہوں۔ بقول غالب۔ گھر میں کیا تھا جو لٹتا، لیکن ذہن کی دُنیا تو آباد ہوگئی۔ اور کبھی کبھی تو یہ بھی نہیں۔ صرف ایک نگاہ کافی ہوتی ہے۔ زبان

کھیلنے کی بھی نوبت نہیں آتی ــــ "روزی کا سوال"ــــ یقین کیجیئے گا۔۔ بمبئ کے بازارِ حُسن ــــ "ریڈ لائٹ ایریا" سے ایک بار محض ایک نگاہ نے یہ کہانی دی ــــ ہمایوں کہ اپنے میاں سے بجید اصرار کیا۔۔ ضد کی کہ بمبئی میں سب کچھ دیکھا ہی بازار نہ دیکھا جہاں مرد شرماتے ہوئے سر جُھکا کر داخل ہوتے ہیں ــــ اور عورت جو فطری طور پر شرم و حیا کی پُتلی ہے، سر اُٹھا کر، جھپٹ کر اپنا شکار دبوچتی ہے۔ ـ!"

گھوڑا گاڑی میں بیٹھے بیٹھے میں نے جو منظر دیکھا وہ ٹھوکا لگا کے اپنے میاں کو بھی دکھایا اور قلم سے بعد میں کاغذ پر بھی اُتار لیا۔۔ اپنے پیشے میں اس قدر سفاکی سے، مکاری سے، اور ہر ممکنہ کمینگی سے اپنا حصہ جھپٹنے والی ایک بیچ اور ذلیل عورت اپنی محبت اور مامتا میں اتنی اونچی بھی ہو سکتی ہے؟ یہ صرف عورت ہی کا مقام ہے ــــ اور وہ بھی ایک بچھڑی ہوئی عورت کا ــــ جو اتفاق سے سفر حضر میں اگر ہمارے بازو بھی آ بیٹھے تو ہم بڑی نفاست سے اپنی ناک خوشبودار رومال، یا ساڑی کے پلّو سے ڈھک لیتے ہیں ــــ!

اور یہی لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ "آپ کے قلم کی سحر انگیزی سے مسحور ہو کر اگر کوئی واقعی ایسی گھٹیا عورت کو پناہ دینے پر تُل جائے تو کیا یہ ٹھیک ہوگا"ــــ؟

کیوں نہیں ــــ! جو بھی گری ہوئی عورت توبہ کر کے ایک نیک زندگی کو اپنانے کا تہیہ کر لے تو خُدا کے پاس تو اس کے بڑے مدارج ہیں ــــ اور جسے خُدا ہی معاف کر دے تو بندے کی کیا اوقات ہے کہ اُنگلی اٹھائے ــ!

میری سلسلہ وار تین کہانیاں ــــ "اوہ امریکہ" "میرے امریکہ اور کینیڈا کے تین ماہ کے قیام کی سچی داستانیں ہیں ــــ جب پڑھنے والوں نے مجھ پر یہ اعتراض کیا کہ "ارے صاحب تین مہینے بھی کوئی مدّت ہے کہ کوئی رائٹر کسی موضوع پر

قلم اُٹھا کے ـــــ تو مجھے بڑی ہنسی آئی ـــــ تین مہینے!! ہر تخلیقی بیج صرف ایک لمحے میں بویا جاتا ہے ـــــ ذرا گہرائی تک جا کر میری بات پر غور فرمائیے گا، ورنہ پھر پڑھنے والے کہانیوں پر تو اب تک اعتراض کرتے ہی آئے ہیں، یہاں بھی پتھر مارنے سے نہیں چوکیں گے کہ "واجدہ تبسّم کو دیکھو۔ کہانیاں تو کہانیاں تھیں قوسِ خیال اور دیباچوں میں بھی عُریانی اور فحش نگاری کا مظاہرہ کر رہی ہیں ـــــ!"

یہ ضرور ہے کہ دھرتی میں بیج بویا جائے تو فصل پکنے تک ایک مُدّت لگتی ہے، ماں کی کوکھ میں بچّہ نو مہینے میں اس شکل و صورت کو پہنچتا ہے کہ قدرت کی صناعی کی داد پانے ایک چھوٹا سا مکمّل انسان بن کر باہر آتا ہے، لیکن اصل سوال بُنیاد کا ہے۔ بیج کا ہے۔ اُسی لمحے سے تو نشوونما کی جڑیں پنپنے لگتی ہیں ـــــ مَیں آپ سے ایک عجیب و غریب بات بتاؤں!

جیسا کہ ابھی میں نے آپ سے کہا کہ "روزی کا سوال"، ایک لمحے کی پیداوار تھی ـــــ یا "اوہ امریکہ" میرے تین ماہی قیام کا نتیجہ ہیں، تو کبھی کبھی تو یہ بھی ہو جاتا ہے کہ ادھر آپ نے کچھ دیکھا، محسوس کیا اور قلم چلنے لگا اور ذہن کی کھیتی سے کاغذ پر بیج نکاری ہو گئی ـــــ اور کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ آپ نے کوئی حادثہ کوئی واقعہ دیکھا یا محسوس کیا۔ آپ کے دماغ اور دل کی گہرائیوں تک کو جس نے ہلا ہلا کر رکھ دیا لیکن پھر بھی آپ کا قلم اسے لکھ نہیں پاتا ـــــ ایک کردار میری آنکھوں سے، دل سے ایسا گزرا کہ میری روح تک تھرّا اُٹھی ـــــ ایک مظلوم عورت کا کردار۔ اس وقت وہ جوان عورت تھی، نمکین، سلونی، اتنی حسین کہ الفاظ ساتھ نہ دے سکیں ـــــ مردوں کے لئے اس میں جو بھی کشش ہوگی۔ وہ ہوگی، لیکن خاندان کی، پاس پڑوس تک کی عورتیں۔ وہ گزرتی تو ٹھٹھک کر رہ جاتیں۔ خاندان کی عورتیں مل بیٹھتیں تو آپس میں باتیں کرتیں۔ "کم بخت کی تنی ہوئی کھال دیکھو۔ اس کے تیور کی حرارت دیکھو۔ جسم کی

گرمی دیکھو۔ ماچس کی تیلی اس کے بدن سے صرف مس کر دو بھک سے جل اُٹھے گی"!
یہ عورتوں کے تاثرات تھے۔!!

مردوں نے اس کا حشر یہ کیا کہ بیاہ دیں گے تو کھلونا چلا جائے گا اور گھر کی عورتوں کو کام کاج کی مصیبت ہو جائے گی — اس کی بھرپور جوانی کو یوں تباہ و تاراج کیا کہ ایک ہی رات میں ایک سرے سے باپ، بیٹے، پھوپھا، بھتیجے سب ہی اس باغ سے گل سمیٹتے، پھول کلیاں چُنتے جاتے، بغیر بیاہی ماں نے الگ الگ باپوں سے چار بچّوں کو جنم دیا — جب جسم کا سونا اور روپ کی چاندی پگھل گئی تو نگاہیں بھی بدل گئیں — اور اس سے بڑا کرب، کیا ہوگا۔ اس کی جان پر اس سے بڑا ستم اور ظلم کیا ہوگا کہ جب چار بچّوں میں سے اس کی اکلوتی بیٹی جوان ہوئی تو اسے بھی انہی خاردار راہوں سے گزارا گیا تاکہ اس کے جسم کے پھول نوچے جائیں۔ وہ بوڑھی عورت آج بھی مجھ سے ملتی ہے۔ مجھے اس نے اپنے ماضی کی ہر ہر بات، میرے پوچھنے پر بتائی ہے۔ ایک حادثہ تو میں کبھی نہیں بھول سکتی — جو اُس نے سُنایا۔

"سردیوں کی ایک رات میں پہلے، بڑے میاں آکر گئے اس کے بعد اُن کے سالے — پھر بڑے میاں کے بیٹے۔ آخر میں نندوئی (بیگم صاحبہ کے بیٹے) آئے تھے، پھر انہوں نے مجھے یہ کہہ کر میرے کمرے سے دھکا دے کر سڑک پر بھگا دیا تھا کہ گھر کی سب عورتیں پوچھیں گی کہ یہ سارے مرد باری باری اپنے کمروں سے نکل کر کہاں جاتے اور واپس آجاتے ہیں، تو آج کی رات تو باہر ہی گزار لے ورنہ ہماری بیویاں ہمیں نوچ ڈالیں گی —"

دسمبر کی کڑکڑاتی رات میں چار مردوں کی نوچی ہوئی عورت، رات بھر برفیلے سرد جھونکوں اور کٹیلے پتھروں سے نیلی پڑ گئی۔ صبح ڈیوڑھی کے دروازے میں سوتی ملی تو بیبیوں نے لاتوں سے مارا۔ "حرام زادی آرام پسند ہوگئی ہے۔ گھر میں آرام نہیں

ملتا تو لوکر دوں سے پہلو گرماتی ہے !!!

اب دیکھئے ایسا خون رُلا دینے والا کردار، ابھی تک میرے ذہن کے گوشوں میں خوابیدہ ہے لیکن میں اسے کاغذی پیرہن نہیں پہنا سکی ــــ لیکن اسے آپ VIRUS کہہ لیجئے ــــ جراثیم کی وہ قسم جو مدتوں سوئی دبی پڑی رہتی ہے، لیکن قدرت کے ایک اشارے پر کروٹ لے کر دُنیا کو تہہ و بالا کرنے ٹوٹ پڑتی ہے۔

تو صاحبان میں آپ سے کہہ رہی تھی کہ یہ بیج اور تخم کاری کا سلسلہ بڑا ہی عجیب و غریب ہے، فصل کبھی نہ کبھی اُگے گی ضرور ــــ اسے ہر حال میں پکنا ہے، اصل سوال بیج کا ہے۔ زمین میں بیج پڑ جائے ــــ وہ باہر آ کر رہے گا ــــ ذہن کی دُنیا بھی ایسی کچھ ہے ــــ بات چل رہی تھی "او وہ امریکہ" کی ــــ تین مہینے تو بڑی ہی طویل مُدت ہے۔ تین لمحے بھی بہت ہی بڑی مُدت ہوتے ہیں کہ ایک فصل لہلہا سکیں ــــ اور پھر تو تیس سال بھی کافی نہیں ہوتے، اگر ظُلم کی بادِ سَموم رہ رہ کر پنپتی ہوئی کونپلوں کو پالا مار مار جائے ــــ !!!

اب کتنی کہانیوں کے حوالے دوں ؟ "قوسِ خیال" کو کتنا طول دوں۔

سوچ رہی تھی یہ کہہ کر گفتگو خلاصی کر لوں کہ میری فردِ جُرم ختم ہوئی ــــ لیکن ختم کہاں ہوئی ؟ پھر سے نئے نئے مضمون باندھے جائیں گے ــــ جُملوں کے تیر پھینکے جائیں گے۔ طعنوں کی سنگباری ہوگی۔ پھر سے اپنی نئی کتاب میں مجھے آپ کے سامنے پابجولاں پیش ہونا پڑے گا ــــ لیکن میں گھبراؤں گی نہیں ــــ ہر نئی کتاب میرے لئے ایک خُوب صُورت آزمائش ہوتی ہے ــــ اور آزمائشوں سے گزرنے سے ہی زندگی کی مٹھاس ہے۔ خُوب صورتی ہے اور اُمنگ ہے۔

میں سر اُٹھائے پتھروں کی منتظر کھڑی ہوں۔

واجدہ تبسم، بمبئی

رمضان شریف کی آمد آمد تھی ـــ جہاں آرام، جو دراصل جہاں آرا بیگم۔ بلکہ دراصل "جینوں" تھیں۔ رمضان شریف میں بے حد پاک باز بی بی بن جاتی تھیں۔ ڈھولک اور ہارمونیم پر غلاف چڑھا دیتی تھیں ـــ بھلے روزے نہ رکھتیں، مجرے بھی نہ کرتیں ـــ اپنے خیالوں کی جنت میں ایک شان دار محل کی تعمیر میں منہمک ہو جاتیں ـــ اکلوتی بٹیا چمن آرا بیگم کو بھی ان کی سختی سے یہی تاکید اور تعلیم تھی، کہ بی بی اعمال جیسے کچھ بھی ہوں ـــ مذہب اپنی جگہ ہے ـــ ویسے دلداروں کا آنا جانا سال کے اور گیارہ مہینوں کی طرح اس مُبارک مہینے میں بھی لگا لپٹا ہی رہتا۔ لیکن بس دُور دُور سے صاحب سلامت رہتی ـــ نزدیک آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چوما چاٹی کا کیا ہے وہ تو چلتی رہتی ہے ـــ ہاں، "حرام کام" سختی سے ممنوع قرار پاتے ـــ ویسے چمن آرا بیگم ان باتوں سے ابھی دُور ہی تھیں ـــ

چاندرات کو چمن آرا نے بڑی لگن سے پوچھا" امی جان ——" کل کا پہلا روزہ ہے —— رکھ نہ لوں —— جہاں آرا سے پہلے کلے خاں بول اُٹھے ——

"ہاں ہاں رکھ لو —— کیا مضائقہ ہے۔"

"ہاں ہاں رکھ لو —— کیا مضائقہ ہے۔" جہاں آرا شیرنی کی سی گرج کے ساتھ ہاتھ نچا کر کلے خاں کو گھور کے بولیں ——"اور جو تیرے باپ آئیں گے اُن کے ساتھ ہنسے گا بولے گا کون —— ؟ تیری ماں —— ؟ یا میں ؟"

چمن آرا بلّی کی طرح سہم کر دبک گئی۔ کلے خاں اس تو تڑاق کے، آج کل سے نہیں مدتوں سے عادی تھے، جب سے جنیوں کو بھگا کر لائے تھے —— پہلے ایسا بھی پتلا حال نہیں تھا کہ جو بھی وہ کہے یہ سُن لیا کریں۔ پہلے تو یہ برابری کا معاملہ تھا، بلکہ خود جنیوں کی ہی ان سے کور دبتی تھی —— پہلے پہل گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کا یہی حال ہوتا ہے، سو جیتوں کا بھی یہی تھا۔ ڈر تو گھُٹی میں پڑا ہوا تھا۔ سوتیلی ماں کی مار پیٹ، کوسنوں سے ڈر ڈر کے یہ حال ہو گیا تھا کہ کسی نے پکارا تو نظر اُٹھا کے دیکھنا بھی قیامت! لیکن جیسا کہ ہر لڑکی بہر حال ایک قیامت ہوتی ہے، جیتوں بھی اگر قیامتِ کبریٰ نہیں تو قیامتِ صغریٰ ضرور تھی —— میراثنوں کے دھندے میں یہی ایک خوبی ہے کہ لڑکی گھر سے بھاگ بھی جائے تو برادری میں چوں چوں نہیں ہوتی —— چڑیوں کا تو وطیرہ ہی ہوتا ہے آج اس ڈال تو کل اُس ڈال۔ ڈر سہتے سہتے ایسی معصوم ہرنی جیسی بن گئی تھی کہ اگر کسی کو نظر بھر کر دیکھ لیتی تو وہ وہیں گھائل ہو جاتا۔ محلے میں ایک بار ماں کے ساتھ پیٹی بجانے کسی رئیس کی محفل میں گئی۔ ہارمونیم بجاتے بجاتے دو ایک بار کسی سے آنکھیں مِلا بیٹھی۔ ملاقاتیں بڑھتی گئیں، پتہ چلا موٹر چلانے پر نوکر ہیں۔ اِتنی اُتنی نہیں پورے ڈیڑھ سو تنخواہ پاتے ہیں —— ہُنر ہاتھ میں ہو تو انسان کہیں بھی ہاتھ پاؤں چلا سکتا ہے۔ آگرہ کیا اور بمبئی کیا۔ ویسے تو دُنیا جانتی

ہے کہ سارے دُنیا بھر کے بھگوڑوں کو پناہ دینے کا باقاعدہ ٹھیکہ بمبئی نے لے رکھا ہے۔
پھر کلّے خاں اور جینوں کیا دو آدمیوں کی جگہ اتنی بڑی بمبئی میں نہیں نکل سکتی تھی۔؟
قدرت بھی بڑی فیاض ہے ۔۔۔ کم سے کم غریبوں کو حُسن بخشنے کے معاملے میں ۔۔۔ ورنہ حُسن بھی اگر بازار میں دُکان پر بکنے والی شے ہوتی تو یہ کم بخت امیر تو پیسے والے ہونے کے ساتھ ساتھ حسین بھی بن کر بیٹھ جاتے، مگر یہ بھی تو خُدا کی بڑائی کا ایک بیّن ثبوت ہے کہ جسے چاہے حُسن کی دولت سے نوازے!! تھی تو ایک میراثن بچی ۔۔۔ جس کی ساری زندگی لوگوں کی شادیوں کی جھوٹن کھاتے، دُلہن کی اُترن پہنتے اور بیل اور صدقے کے پیسے چُنتے گزُری۔ لیکن کوئی صورت دیکھتا تو دیکھتا ہی رہ جاتا۔ شاہزادیوں جیسا تمکنت بھرا حُسن پایا تھا کم بخت نے، اور سوتیلی ماں کا ظلم بھی یہاں سونے پر سہاگے کا کام کر گیا۔ آنکھوں میں ایسی مظلومیت اور سہاپن مقام کر گیا کہ جو بھی دیکھتا اُس کا جی چاہتا کہ ایسی معصوم اور مظلوم ہستی کو اپنے کلیجے میں بھر لے ۔۔۔ مردوں کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ وہ ہر دُکھی لڑکی کو کلیجے سے لگا کر اس کا غم بُھلا دینا چاہتے ہیں ۔۔۔!
اگر نے بھاگ کر آئی تو جینوں کے دل میں ہزار وسوسے تھے ۔۔۔ "اللہ جانے بمبئی اور بمبئی والے کیا سلوک کریں ۔۔۔" لیکن جان پہچان کے کسی دُور دراز کے دوست نے سہارا دیا تو اسے لگا کہ: دُنیا اتنی بُری بھی نہیں جتنی لوگ بتاتے ہیں۔
کلّے خاں نے اس سے باقاعدہ عقد تو کبھی نہیں کیا، لیکن تھا بڑا عقل مند، چار آنے والی سیاہ باریک موتیوں کا بیچ لڑا پہلے ہی اس کے گلے میں باندھ لایا تھا کہ سُہاگن سمجھی جائے۔ اور بمبئی کے چلن کے مطابق "منگل سوتر" گلے میں پڑا دیکھا تو کسی نے پوچھنے یا سوچنے کی بھی زحمت نہ کی کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ حالانکہ کلّے خاں بے حد رُعب داب سے سمجھاتا آیا تھا۔ شادی ہم نے کی ہے نہ کریں گے۔

مگر کوئی بھی پوچھے مہر کتنا ہے تو کہہ دینا گیارہ ہزار ہے —" ویسے وہ گیارہ ہزار چھوڑ گیارہ لاکھ بھی کہہ دیتی تو کلّے خاں کا کون سا دیوالہ پٹ جاتا۔ یوں بھی آج کل تو فیشن کے طور پر مہر باندھتے ہیں۔ ادا کون کرتا ہے — اس نے سر ہلا کر معصومیت سے کہہ دیا " اچھا —"

" اور کوئی پوچھے جہیز کا سامان کہاں ہے تو کہہ دینا کہ ابھی نئے نئے آتے ہیں کہاں سامان بٹورتے پھرتے۔ اس لئے میکے ہی میں دھرا ہے۔"

" کہہ دوں گی —" وہ بے حد فرماں برداری سے بولی " اور اگر کسی نے زیورات کے بارے میں پوچھا تو — ؟" اس معاملے میں خود کلّے خاں بھی پریشان تھے — کیوں کہ زیور تو ایسی چیز ہے بھئی کہ عورت جسم پر لادے رہتی ہے — نہیں سو پچاس تولے تو دو چار تولے ہی سہی۔

میں بول دوں گی ابھی ماں کے پاس ہی دھرا ہے — کلّے خاں نے جُز بُز ہو کر اسے ٹوکا —" ماں نہیں پڑھے لکھوں کی طرح امی جان کہو بھئی — کلّے خاں چھ کلاس پاس تھے۔ اور بڑے گھر میں ڈرائیور رہے تھے۔ اس لئے سز بان دانی کا خاص خیال تھا۔

جنیوں نے مسکرا کر دیکھا۔ یہ مسکراہٹ بڑی ہی معنی خیز، بڑی ہی حوصلہ خیز، بڑی ہی خاموش کٹاری جیسی تھی — جیسے کہتی ہو — سب سمجھتی ہوں — تم چھ کلاس پڑھے ہو — دیکھنے دکھانے میں بھی اچھے ہو — عزت کا خیال رکھتے ہو نہیں چاہتے کہ کوئی سمجھے کہ یہ بیوی بیوی نہیں بھگوڑی ہے — تمہیں عزت چاہئے نا — ؟ ٹھیک ہے میں تمہاری عزت کو اپنے ہاتھ میں رکھ رہی ہوں —"

وہ دوسرا ہی دن تھا — نہا دھو کر جنیوں جب گیلری میں آئی تو پاس پڑوسنیں حیرت سے اُسے دیکھنے لگیں — کلّے خاں بھگا کر لایا تھا تو کیا ہوا — اس کی جوانی کا میٹھا میٹھا رس پیا تھا تو کیا ہوا، اس کے بدلے میں پیار بھی تو دیا تھا۔ اور

کپڑے لتّے بھی سلیقے کے ___ اس وقت وہ پھول دار جارجٹ کی ساڑی پہنے ہوئے تھی ___ کاجل بھری کالی آنکھیں اور لپ اسٹک سے سجے سجے سُرخ سُرخ ہونٹ ___ پڑوسنوں کی ہمت نہ ہوئی کہ اُسے بہن یا آپا کے نام سے مخاطب کریں ___ ایک نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"بیگم صاحبہ آپ کہاں سے آئی ہیں ___" دیوالی کے پٹاخوں میں ایک چیز ہوتی ہے انار ___ اس کم بخت کو آگ لگا کر چھوڑ دو تو بس پھر اُوپر ہی اُوپر چلا جاتا ہے نیچے آتا ہی نہیں ___" بیگم صاحبہ کا فلیتہ ایسا لگا کہ بینوں اُوپر ہی اُوپر چڑھتی گئی ___ اب نیچے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ___

"آگرہ سے ___" اس نے تمکنت سے جواب دیا جیسے پورا آگرہ اس کی تحویل میں تھا۔

"آپ جتنی خوب صورت ہیں ___ آپ کا نام بھی اتنا ہی خوب صورت ہو گا" کسی اسکول کی لڑکی نے مُسکرا کر پوچھا۔

بس یہی ایک لمحہ تھا جب وہ پاتال میں گر سکتی تھی۔ لیکن وہ بر وقت سنبھل گئی ___ اس نے نزاکت سے پلّو سر کے گرد لپیٹا ___ اک بیگماتی شان اس کے چہرے سے جھلکنے لگی ___ وہ ذرا مُسکرا کر بولی۔

"جہاں آرا بیگم ___" پچھلی بار، بھاگنے سے کچھ دن پہلے جس گھرانے میں ماں کے ساتھ ہارمونیم بجایا تھا، وہاں دُلہن کا نام جہاں آرا بیگم ہی تو تھا۔ اور اُسے اچھی طرح یاد تھا پیار سے اس کی سہیلیاں جب اُسے دولہا کا نام لے لے کر چھیڑ رہی تھیں تو بجائے پورا نام لینے کے جینوں ___ جینوں کہتی تھیں ___ تو کیا وہ جینوں سے جہاں آرا بیگم نہیں بن سکتی ___ نام بدل لینے میں کون سے ہاتھی گھوڑے اور طمطراق لگتا ہے؟ یہ ضرور ہے کہ اب تک کی زندگی بڑی بدمزگی، بے کیفی اور بے عزتی میں گزری تھی۔ اب اپنے گھر میں تو

جو عزت بھی سوبھی، لیکن شادی کے گھروں میں ڈومنیوں اور میراثنوں کی کیا عزت ہوتی ہے
؟ گھر والے ساتھ بٹھانا تو دور رہا کھانا تک زمین پر کھلاتے ـــــ!! سب کے بعد
میں دسترخوان لگا دیا جاتا ہے کہ اپنے کنبے کے ساتھ لپڑ لپڑ کھاتے رہو ــ اور پھر پیسے
والوں کا برتاؤ ـــ؟ کتنی بار ایسا ہوا کہ اندھیرے اُجالے کسی نہ کسی نے موٹر کے ہارن کی
کی طرح سینہ پکڑ کر دبا دیا ــ اس میں بوڑھوں اور جوانوں کی بھی قید نہ تھی. بس موقع
ملنے کا سوال تھا ــ اور وہ رازوں کے اسرار سے پردے اُٹھاتی ہوئی ایک عجیب و غریب
رات ـــ!! گرمی کے مارے جب وہ شادی کے گھر کے باغ والے برآمدے میں اکیلی سوئی
پڑی تھی تو کسی نے اندھیرے میں اس کا آزار بند کھول دیا تھا اور جب تک کہ وہ حالات
کی پیچیدگی کا جائزہ لیتی. یا کچھ سوچ ہی پاتی ــ سب کچھ برابر ہو چکا تھا اور کرکراتے
کاغذ کی ایک چھوٹی سی تہہ اس کی ہتھیلی میں پڑی فریاد کئے جا رہی تھی ــ اُجالے میں
چلو اور مجھے دیکھو ــ تمہیں پتہ تو چلے تمہاری قیمت کیا ہے ـــ تمہارا مول کیا ہے. بڑی مشکل
سے وہ اُٹھی تھی ـــ باہر جا کر ملگجے اُجالے میں نوٹ کی تہہ کھولی اور بس دیکھتی ہی رہ گئی ـــ
وہ ایک روپے کا نوٹ تھا!! اُسے ہنسی آ گئی. اگر وہ جواں مرد یہ ایک روپیہ بھی نہ دیتا تو
میں اس کا کیا بگاڑ لیتی ـــ؟ لیکن چلو اچھا ہے اس نے راستہ تو بتا دیا کہ یہ بھی ایک دُکان
ہے جو چلائی جا سکتی ہے؟

گو یہ دکان ابھی زیادہ دنوں نہیں چلی تھی کہ اس کے دل پر محبت کا وار چل گیا.
اور وہ اپنے پیچھے ایک سڑی ماری دُنیا چھوڑ کر کلّے خاں کے ساتھ چلی آئی ــ اور دراصل
اُسے آگے چلتے ہوئے، پیچھے چھوٹ آنے والی دُنیا کا رتی بھر بھی ملال نہ تھا! نہ ہی ڈر ـــ
ڈر ہوتا بھی کا ہے کا ــ؟ دُنیا میں سب سے زیادہ ڈر کسی بھی عورت کو اپنی عزت لُٹنے کا ہوتا
ہے ـــ جب عزت ہی نہیں رہی تو پھر ڈر کا ہے کا ــ؟ جو دُکان آگرہ میں چار لوگ مل کر
چلاتے تھے یہاں اکیلا کلّے خاں چلائے گا. بات بالکل ایک ہی تھی ــ بہر حال پیسے کی

ضرورت تھی جو پہلے بھی تھی اب بھی تھی ۔ پہلے بھی وہی طریقہ تھا اب بھی وہی طریقہ تھا۔ اور ویسے دیکھا جائے تو، اس نے ٹھنڈے دل سے سوچا۔ یہ مولوی کی موجودگی میں، وکیلوں کی گواہی میں جو نکاح پڑھائے جاتے ہیں اور عورت کو کسی ایک مرد کی قید میں زندگی بھر کے لئے دے دیا جاتا ہے تو بالکل وہی سلسلہ ہے عورت سے رات کو "کچھ لیتے رہو اور دن بھر اس کے معاوضے میں کپڑا لتا. کھانا دانہ دیتے رہو ــــ!!

ایک لفظ "بیگم صاحبہ" نے اُسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا ــــ!!

اس کا رکھ رکھاؤ دیکھ کر کسی کو اس سے زیادہ باتیں بھنگارنے کی ہمت نہ پڑی ــــ!

کلّے خاں کے دوست نے اپنے دوست اور بھابی کی آمد کی خوشی میں محلے ہی میں ایک پارٹی کا انتظام کر ڈالا ــــ ایک گھر میں ہارمونیم بھی تھا ۔ چائے پارٹی کے بعد گانے بجانے کی محفل جمی اور کسی نے یونہی سرِ راہ بھابی جہاں آرا بیگم سے گانے کی فرمائش کر ڈالی تو وہ تمکنت سے اپنا پلو سنبھالتی ہارمونیم پر جا بیٹھیں ،نازک انگلیوں سے ایسے سُر نکالے اور ایسا اچھا گیت گایا کہ محفل دنگ رہ گئی ــــ اور پھر تعریف و توصیف کا ایسا سلسلہ اور شور اُٹھا کہ کلّے خاں کی، جو ایکساں جہاں آرا کو گھر چلنے کو کہہ رہا تھا، آواز ہی دب کر رہ گئی ــــ اور پھر یوں ہوا کہ ہمیشہ کے لئے کلّے خاں کی آواز ہی دب کر رہ گئی ــــ کیوں کہ پھر یوں ہوا کہ جہاں آرا بیگم نے توڑ جوڑ کر کے اپنا ایک ہارمونیم خرید لیا اور رات کو گانے بجانے کا سلسلہ شروع کر لیا ــــ پہلے پہل تو محلے والے آتے ، خوش ہو کر داد دیتے ،اور اپنی خوشی کا اظہار روپلے دو روپلے دے کر کرتے ۔ پھر ذرا بڑے پیمانے پر یہ محفلیں جمنے لگیں ــــ جب عورت کمانے لگتی ہے تو عورت کے مونہہ میں زبان کی جگہ ایک دھار دار چھری آجاتی ہے ــــ اور یہ کمائی جب اپنی ہی دُکان کی ہو تو چھری دو دھاری ہو جاتی ہے ۔ اور مرد جب دیکھتا ہے کہ عورت کی دُکان خوب چل نکلی ہے

گڑبڑ کی بہت بڑھ گئی ہے تو وہ اپنی زبان بند کر لیتا ہے۔ کیونکہ بہر حال دو چیزیں ساتھ نہیں چل سکتیں۔ یا تو دکان چلے یا زبان چلے — پہلے پہل کلّے خاں کی زبان زیادہ چلنے لگی تو اسے اپنی محفلوں کی بدمزگی جان کر جہاں آرا نے اسے افیم دینی شروع کر دی — پھر وہ افیم کا اس قدر عادی ہو گیا کہ ہر بات سے بے فکر ہو گیا۔ بے فکری نے زبان بالکل ہی بند کر دی اور یوں جہاں آرا بیگم کی دُکان خوب چل اُٹھی۔

وقت نے ہر طرح کا سلیقہ اور قرینہ سکھا دیا۔ سب سے پہلے جہاں آرا بیگم نے اس گندے محلّے کو چھوڑ کر ایک اعلیٰ سوسائٹی میں شاندار فلیٹ کرائے پر لیا — نئے فیشن کے رنگ ڈھنگ سے فلیٹ کو آراستہ کیا۔ لیکن ایک کمرہ اپنے پُرانے پن کی تہذیب کی یادگار بنا کر رکھا۔ بڑا سا نرم گدیلا — اس پر شفاف سی چاندنی بچھی ہوئی۔ بڑے بڑے گاؤ تکیہ — ملائم گال تکئے۔ بازو تکئے — ایک کونے پر چاندی کا بڑا سا پاندان دھرا ہوا — پان کی وضع کا ناگردان، جس میں سلیقے سے لگے ہوئے پان رکھے ہوئے — کونے میں اگالدان، ایک کونے میں قالین پر طبلے، ہارمونیم، ڈھولکی اور کچھ ساز محض سجاوٹ اور رُعب داب کے لئے۔ اور پھر اسی کمرے میں قالین اور گدیلے کو چھوڑ کر چکنا بڑا سا فرشی حصہ یونہی چھوڑ دیا گیا تھا کہ ناچنے کے کام آئے — اس کے ساتھ ہی ایک اور کمرہ لگا ہوا تھا۔ جو ہر چہار طرف سے آئینوں سے گھرا ہوا تھا۔ یہاں ایک ڈبل بیڈ مسہری نما لگا ہوا تھا — ایک نو بیاہتا جوڑے کے کام آنے والی ہر چیز یہاں سلیقے سے رکھی ہوئی تھی — کاروبار بڑھ گیا تھا نا — کئی بار ایسے موقع آجاتے کہ کسی نہ کسی کو یہیں فلیٹ ہی میں "سنبھالنا" پڑ جاتا — یہ کمرہ ایسے ہی موقعوں کے لئے بطورِ خاص بنایا اور سجایا گیا تھا۔ اندر اور بھی کئی کمرے تھے جن میں نوکر، نوکرانیاں رہتیں — ایک کمرے میں کلّے خاں نشہ کئے پڑے رہتے — ان کے کمرے پر ہمیشہ پردے جھُولتے رہتے — عورت جب تک پردے میں رہتی ہے اسے قدم قدم پر مرد کے

سہارے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے لیکن جب وہ پردے سے باہر آتی ہے تو مرد اس کے لئے بے مصرف چیز بن کر رہ جاتا ہے۔ اور کلّے خاں تو اس کے لئے بہت ہی جلد بے مصرف بن کر رہ گئے تھے ــــ بھگوڑی عورت کے لئے دُنیا اپنے دروازے کھول دیتی ہے۔ مگر مرد بھگوڑا ہو کر نکھٹو بن جاتا ہے ــــ ڈرائیوری مل تو ضرور جاتی اگر کوشش کرتے۔ مگر جس مرد کو گاڑی کی بجائے عورت چلانے کی عادت پڑ جائے اُسے پھر نوکری کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ جاتی پہلے پہل گانے بجانے کے پیسے آئے تو کلّے خاں کو بڑا بُرا لگا تھا، لیکن جب کوئی اور بھی آمدنی گھر کی رونق بڑھانے لگی تو وہ مار پیٹ پر اُتر آیا۔ لیکن یہ سلسلہ بہت ہی کم دنوں چلا۔ کیوں کہ ایک دن لڑائی لڑائی میں جہاں آرا نے ایسی کم ظرفی کی بات کی کہ وہ سُن ہو کر رہ گیا ــــ اس کے پرس میں پانچ سو کے نوٹ دیکھ کر کلّے خاں نے بدچلنی کا الزام لگایا ــــ تو وہ بڑی رعونت کے ساتھ بولی ــــ

"تم تو اپنا ہُنر آگرہ ہی میں گروی رکھ کر آ گئے تھے ــــ یہاں آ کر ایک دن بھی نوکری کی ؟ اگر میں ہی حالات کو نہ سنبھالتی تو پتہ چلتا ؟" وہ چلّایا ــــ "حالات ایسے سنبھالے جاتے ہیں کمینی ؟" وہ تڑاخے کے ساتھ بولی۔

"روپے روپے میں آزار بند کُھلوانے والی اگر ایک ایک رات کے پانچ پانچ سو کمانے لگے تو کیا پھر بھی وہ تجھ جیسے ڈھیلے نامردے کو اپنا شوہر مانے گی ــــ ؟؟"

"کمینی ــ گندی ــــ چڑیل ــــ اپنی زبان سے خود اپنے کرتوت مجھے سُنا رہی ہے ــــ" وہ ہاتھ بڑھا کر لپکا۔ لیکن اس نے اپنا سونے کے کنگنوں سے جھم جھماتا ہاتھ بڑھا کر مرد کا ہاتھ مروڑ کر نیچے گرا دیا۔

"آئندہ سے مارنے کی ہمت بھی نہ کرنا کلّے خاں۔ تم کو پتہ نہ ہو تو سُنا دوں، میرا نام جہاں آرام ہے، میں دُنیا بھر کو آرام دینے کے لئے پیدا کی گئی ہوں صرف

تم اکیلے کو نہیں ــــ مجھے ــــ؟ اور ویسے دُنیا والے مجھے جہاں آرا بیگم کے نام سے جانتے ہیں ــــ میرا مہر گیارہ ہزار روپیے ہے ــــ اور میرا سارا جہیز اور زیور ابھی تک میکے میں رکھا ہوا ہے۔ کسی بھی دن یہاں سے غائب ہو جاؤں تو کوئی یہ نہیں پوچھے گا کہاں گئی۔ سب سمجھیں گے اپنے میکے چلی گئی ــــ لیکن ڈھیلے خاں میں تمہیں چھوڑ گئی تو تمہارا کیا ہوگا ــــ؟ نشہ پانی کہاں سے کروگے؟"

یہاں آکر کلّے خاں مجبورِ محض ہو کر رہ جاتا تھا ــــ اور اسی لئے اس نے ہونٹوں پر قفل ڈال لیا تھا ــــ اور اسی خاموشی سے خوش ہو کر جہاں آرا نے کلّے خاں کو مستقل "خان بہادر" کا خطاب دے دیا تھا۔ جس میں تعریف اور عزت کم اور ذلت زیادہ نمایاں تھی ــــ

انہی سالوں میں پتہ نہیں کس دل والے کی دین تھی، ایک بیٹی جہاں آرا کے پیدا ہو گئی تھی ــــ جسے خاں صاحب خوش ہو ہو کر اپنی بیٹی کہہ کر پال رہے تھے ــــ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ مدتوں سے جہاں آرا نے کلّے خاں کے ساتھ بھائی بہن کا سا رشتہ باندھ رکھا تھا۔ لیکن وہ سوچتی بُرا بھی کیا ہے۔ دُنیا میں رہنا ہے تو اپنے لئے نہیں، بیٹی کے مستقبل کے لئے ایک نام نہاد باپ کا وجود بھی تو ضروری ہے ہی ــــ کیا بُرا ہے اگر یہ پاپڑ ہی آڑ بن جائے؟ ویسے یہ بات اپنی جگہ صحیح تھی کہ اسے بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کا اصلی باپ ہے کون ــــ؟

لیکن کلّے خاں نے چمن آرا کو واقعی بیٹی کی طرح چاہا ــــ نشے کی ٹوٹ ہوتی تو اُسے اردو سے لے کر نماز، روزہ، قرآن شریف تک سمجھاتا پڑھاتا۔ زمانے کا رنگ دیکھتے ہوئے خود جہاں آرا نے ہی اُسے انگریزی اسکول میں ڈالنا چاہا ــــ لیکن ہوا یہ تھا کہ چند سالوں سے اس نے خود کو ڈیرے دار طوائف

کی حیثیت سے منوالیا تھا ـــــ سارا زمانہ جاننے لگا تھا کہ آگرہ کے نامی گرامی گھرانے کی تہذیب یافتہ مغنیہ، گلوکارہ بمبئی میں آبراجی ہیں ـــــ پتہ نہیں کتنی چوڑنی اکنی میں رات بتانے والی بمبئی آکر آگرہ غریب کی شان بڑھا رہی ہیں، بہر حال جہاں آرا نے تو خود کو اس حیثیت سے منوا چھوڑا تھا کہ نوابوں کے صاحبزادے میرے گھر تہذیب اور رکھ رکھاؤ سیکھنے آیا کرتے تھے !! اور یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نہ تھی ـــــ تو کبھی اب ایسی ڈیرے دار بیگم صاحبہ کی بٹیا کو انگلش تعلیم زیبا نہیں دیتی ـــــ اسی مارے انہوں نے گھر ہی پر بٹیا کو ہر ہر قسم کی تعلیم دلوانی شروع کی ـــــ اس میں پڑھائی لکھائی سے لے کر ناچ گانا بجانا سب ہی کچھ شامل تھا ـــــ ناز و انداز سیکھنے اور دکھانے کی خاطر جہاں آرا اپنی محفلوں میں جان بوجھ کر بٹیا کو بھی بلا کر بٹھاتیں ـــــ ہر چند کہ چڑیا کے بچے کو اڑنا اور مچھلی کے بچے کو تیرنا سکھانا نہیں پڑتا، لیکن اپنی طرف سے کسر کیوں چھوڑی جائے ـ؟؟

ایک طرف میک اپ کی تہیں دبیز سے دبیز تر ہو رہی تھیں، اور دوسری طرف آگ برساتی جوانی بہار پر آرہی تھی ـــــ اور اس دن جہاں آرا بیگم نے زمانے کے آگے ہتھیار ڈال دیئے، جب ان کے ایک ملنے والے صاحب زادے قمرالزماں صاحب جو کہ عمر میں چمن آرا سے تگنے چوگنے ہوں گے، ترچھی نظروں سے ہوس خیز نظروں سے اُسے گھورتے ہوئے کہا :

"بیگم صاحب ـــــ اتنی تیکھی ناک میں یہ سونے کی حقیر نتھنی کچھ زیب نہیں دیتی ـــــ"

"جی ہاں ـــــ" وہ سینے میں ابھرتے ہوئے ابال کو دبانے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی بولیں : "میں نے ایک نتھ صرافے میں دیکھی ہے، ہمت نہیں پڑتی ـــــ ہیں تو چھوٹے چھوٹے پندرہ ہیرے ـــــ لیکن کم بخت

سوا لاکھ قیمت تبار ہا تھا ——"

"آپ بھی کمال کرتی ہیں —— سوا لاکھ بھی کوئی چیز ہے ؟" اُنھوں نے ہاتھ بڑھایا —— "لیکن وعدہ رہا کہ یہ سعادت بس ہمیں ہی حاصل ہو گی ——"

جہاں آرا بیگم نے اُن کی ہتھیلی پر اپنی ہتھیلی رکھ دی —— یہی وہ ہاتھ تھا جو آج تک اُن کے اپنے ہاتھ کے لئے بے قرار رہا تھا —— گر تعلقات جسمانی حدود تک کبھی نہیں آ پائے۔ کیوں کہ جہاں آرا بیگم عمر کے اس دور میں تھیں جب کہ لاکھ بندھے کسے رہنے کے باوجود بھی جسم میں ڈھلک آجاتی ہے، اور کپڑوں سے بے نیاز جسم یہاں وہاں سے اوجھڑی کی طرح لٹکا لٹکا نظر آتا ہے، اور ایک رنڈی جب اپنے جسم کی اس بے وفائی سے آگاہ ہو جاتی ہے تو محض بات چیت، اداؤں اور لگاوٹ سے گاہکوں کو رجھانا اور ترخانا شروع کر دیتی ہے۔ جہاں آرا نے بچپن سے غریبی کا موبہہ دیکھا تھا —— پیسے کے لئے بے آبرو ہوئی تھیں —— روٹی کے چھوٹے ٹکڑوں کے لئے شادیوں میں بدھائیاں گائی تھیں۔ اور اندھیرے اُجالے اپنے کومل جوانی کے کچے پکے پھل بچوائے تھے۔ وہ خوب سمجھتی تھیں پیسہ کیا ہوتا ہے۔ پیسے کی کیا قدر ہوتی ہے —— جو سبق اُنھوں نے زندگی میں سیکھا تھا، اپنی بیٹی کو پڑھانے میں ذرا بھی شرم انہیں نہیں آئی تھی۔ نہ آتی تھی —— پیسہ ہی ایمان —— پیسے کے آگے ہر چیز ہیچ تھی، لیکن اس وقت ایک عجیب سی کشمکش انہیں مروڑے ڈال رہی تھی —— ایک شخص جو مدتوں سے صرف اُن کے دیدار کا پیاسا تھا —— ان پر روپے زیور کی بارش کرتا رہا۔ اب اچانک کیسے بدل گیا —— لیکن ٹھیک ہے سب کچھ ٹھیک ہے —— پیسہ ہی سب سے بڑی چیز ہے —— پیسہ ملنا چاہئے۔ ہر طریقے سے، ہر راستے سے ——" انھوں نے اپنے اُتھل پتھل کرتے دل کو قابو میں کر کے مُسکراتے ہوئے کہا :

"یہ سعادت یوں سمجھئے آپ کو حاصل ہو چکی —— شرلفیوں میں زبان کا ہی خیال رکھا جاتا ہے، ورنہ اور دُنیا میں رکھا کیا ہے ——"

صاحب زادہ قمرالزماں اُٹھنے لگے تو جہاں آرا بیگم نے جھجکتے ہوئے پوچھا:

"بیگم صاحبہ کیا خیال کریں گی ——"

قمرالزماں صاحب جاگیرداروں کی اس کل سے کتنے جہاں بیوی کو بیاہ کر لاتے ہیں اور پھر وہ ایک راتوں کے بعد بھول جاتے ہیں کہ محل میں کوئی ذی نفس موجود بھی ہے —— بھئی آخر تھان پر جانور بندھے ہی ہیں۔ ایک آدھ کا اضافہ ہو جانے سے صاحبِ خانہ کی صحت پر کیا اثر پڑ سکتا ہے ——؟

قہقہہ لگا کر بولے: —— "اس کی آپ فکر نہ کیجئے —— ہم الگ کوٹھی میں بھجوا دیں گے انہیں —— !"

"اور موجودہ کوٹھی —— ؟" انہوں نے رُکتے اٹکتے پوچھا: "آپ کہیں گی۔ تو منہ دکھائی یا نتھ اترائی کی خوشی میں چمن آرا کو دے دیں گے ——"

جہاں آرا نے بے اختیار جھک کر ان کے ہاتھ چوم لئے۔

•

**رات** کو تنہائی میں جہاں آرا بیگم بیٹی سے بولیں: "بیٹی —— مجھے تمہارا بڑا بھلا خوب سمجھا ہے۔ لیکن پھر بھی میں نے تمہارے لئے ایک بات سوچی ہے ——"

نئے زمانے کی پڑھی لکھی سمجھ دار لڑکی —— جس ماحول میں جی رہی تھی —— اس میں کچھ زیادہ کھول کر سمجھانے کی ضرورت نہیں پڑتی —— اور پھر ماں بھی ایسی تھی جس نے جوان ہوتے ہی بیٹی کو تمام اونچ نیچ سے آگاہ کر دیا تھا —— مرد کتنا بھی پرچائے لبھائے دُور ہی دُور سے گھاس ڈالو —— اپنے جال میں ایسا پھانسو کہ تڑپے، مگر نکلنے نہ پائے —— کبھی اپنا آپ اُسے سونپنے کی کوشش

مت کرو۔ ایک حماقت جس کا نام محبت ہے، اس میں بھول کر مت پڑو —— ہم جس زندگی اور پیشے میں جی رہے ہیں، اس میں صرف جسم ہی سب کچھ ہے، اس کی قدر کرو کہ اس کا بھاؤ بڑھے —— جسم کو صابن سمجھو جو گھس بھی سکتا ہے، ویسے اس صابن کو استعمال نہ کریں تو سدا جوں کا توں رہ بھی سکتا ہے ——

لیکن یہ سارے وعظ اور نصیحتیں اس دن بے اثر ہو کر رہ گئے تھے، جس دن بدقسمتی یا خوش قسمتی سے جہاں آرا بیگم گھر سے باہر گئی ہوئی تھیں —— سہ پہر کا سہانا وقت تھا —— چمن آرا چاندنی پہ نہا کر بال سکھا رہی تھی کہ کسی آیا نے آکر بتایا کہ کوئی صاحب ملنے آئے ہیں —— امی جان تھیں نہیں، مجبوراً اسی کو آنا پڑا —— بڑے ہال میں آئی تو دونوں ہی اپنی جگہ ٹھٹھک کر رہ گئے —— نیلے رنگ کی شرٹ اور نیوی بلو پتلون میں اُلجھے بالوں والا ایک بے فکرا سا لڑکا لاپرواہی سے کھڑا ہوا تھا۔

"آپ —— ؟" وہ آگے کچھ بول ہی نہ سکی۔

وہ مسکرایا —— "جی —— میں ——"

"لیکن امی جان باہر گئی ہوئی ہیں ——"

"اجی امی جان کو ماریئے گولی . . .!" اِک دَم وہ ٹھٹھکا "معاف کیجئے میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ سچ مچ آپ اپنی امی جان کو گولی مار دیں۔ کچھ عادت سی ہو گئی ہے گولی چلانے کی ——" وہ سادگی سے ہنس پڑا —— "محض عادتاً —— ویسے مجھے کام تو آپ ہی سے تھا ——"

"مجھ سے —— !" وہ بے حد حیرت سے اپنے سینے پر انگلی ٹکا کر بولی —— "میں تو آپ سے کبھی ملی تک نہیں ——"

"ٹھیک ہے نہیں ملیں —— لیکن ——" وہ رُکا . . . "دیکھیے وہ ہمارا

باورچی ہے نا ـــــ اپنے کچن میں بیٹھ کر زعفران پیستا ہے تو پورے محلے میں خوشبو اڑ جاتی ہے ـــــ" وہ ذرا سا شریری ہنسی ہنسا ـــــ "چیز اچھی ہو نا تو آپ ہی آپ شہرت ہو جاتی ہے۔ کسی تعارف وعارف کی ضرورت نہیں پڑتی ـــــ آپ گانا گاتی ہیں نا ـــــ؟"

اب تک اس کے حواس ذرا بجا ہو چکے تھے ـــــ مسکرا کر بولی: "آپ کو غلط اطلاع ملی ہے۔ گانا گانا تو دور کی بات ہے، مجھے تو یہ تک نہیں معلوم کہ گانا کسے کہتے ہیں ـــــ"

"آپ چمن آرا نہیں ہیں ـــــ" وہ اس کے قریب آکر بولا:

"ہوں تو سہی ـــــ"

"تو میں آپ کو یہ اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ اس وقت شہر میں سب سے بہترین غزل گانے والی ہستی آپ ہیں ـــــ اور میں ـــــ" وہ اچانک گھٹنے ٹیک کر، ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا ـــــ "میں آپ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ ہم چند لڑکے ایک بہت ہی اچھے مقصد کے لئے ایک محفل منعقد کر رہے ہیں تاکہ کچھ روپیہ جوڑ سکیں۔ اگر آپ اس میں دو تین غزلیں گا سکیں تو شاید میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہ بھول سکوں گا ـــــ"

چمن آرا نہ ہاں کہہ سکی نہ ناں کہہ سکی ـــــ وہ یوں ہی تصویر حیرت بنی کھڑی رہی، اور وہ گھٹنے ٹیکے اسے ہاتھ جوڑے دیکھا کیا ـــــ اچانک چمن آرا نے محسوس کیا کہ امی جان کی ساری تعلیمات دھری کی دھری رہ گئی ہیں، اور وہ ایسے جال میں کبھی نہ نکلنے کے لئے پھنس چکی ہے جسے شاید لوگ محبت کہتے ہیں ـــــ

"آپ نے کوئی جواب نہیں دیا ـــــ" بڑی دیر بعد شاید ہزاروں سال کی خاموشی کے بعد وہ لڑکا بولا تھا ـــــ

"جی ——" وہ ہڑبڑا کر بولی —— "اس وقت امی جان گھر پر نہیں ہیں اور میں بغیر اُن کی اجازت کے کوئی کام نہیں کرتی —— آپ مہربانی فرما کر پھر کبھی تشریف لائیے ——" اور جیسے اپنے آپ کو بچانے کی خاطر، اُس نے پھر پلٹ کر اُس کو دیکھا تک نہیں، اور اپنے کمرے کو بھاگ آئی ——

اور اب امی جان کہہ رہی ہیں کہ بیٹی مجھے تمہارا بُرا بھلا خوب سمجھنا ہے —— پھر بھی میں نے تمہارے لئے ایک بات سوچی ہے —— ؟ کیا بات ہو سکتی ہے —؟ صرف ایک ہی بات —— ایک ہی بات —— پوچھنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔؟ لیکن میں —— ؟ میں تو آگے ہی بک چکی ہوں —— اس نے ذرا شرما کر سوچا۔ —— امی جان تو یہی کہیں گی نا کہ میں نے تمہارے لئے ایک اچھا سا لڑکا دیکھ لیا ہے —— اور وہ شرم سے اور بھی جھک گئی ——

"لیکن امی جان —— مجھے ابھی شادی نہیں کرنی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"بے وقوف لڑکی —— شادی کی تجھے کیا سوجھی —— ؟ اور ہمارے خاندانوں میں کہیں شادیاں ہوا کرتی ہیں —— میں تو تجھے سنا رہی تھی کہ ہمارے خان . . . . . ."

"امی جان مجھے معلوم ہے۔ ہمارے خاندان کی ساری تاریخ، ابا جان نے مجھے سب بتا دیا ہے . . . . . ." وہ طنز سے بولی۔

"اے ہے ابا جان کی بچی —— اور وہ حرام زادہ نکٹا کہاں سے تیرا باپ بن کر آ گیا —— سُن لے حرام زادی —— میں جو کچھ کہوں سُن اور عمل کر، ورنہ تیری کھال اور میری جوتی —— اور یہ شادی بیاہ کے چونچلے چھوڑ —— یہاں تو روز دوکان لگتی ہے اور روز پیسہ ملتا ہے۔ بیاہتا بن کر تجھے کیا ملنے والا ہے، وہی پابندی اور مجبوری کی زندگی نا —— ؟"

"لیکن امی جان ــــــ" وہ ہمت باندھ کر بولی "آپ ہی نے مجھے تعلیم دلوائی اور سوچنے سمجھنے کا حوصلہ دیا ہے ــــــ میں گناہ کی زندگی نہیں گزارنا چاہتی" اس کے تیور کسی سے دبنے والے نظر نہ آتے تھے ــــــ

وہ چاپلوسی سے بولیں ــــــ "اے ہے بیٹی گناہ کو میں کب کہہ رہی ہوں ثواب کمانے کو بھی میں کب منع کر رہی ہوں ــــــ اب دیکھ روزے تو تو رکھتی ہی ہے اپنے مذہب پر چلتی بھی ہے۔ کیا میں منع کرتی ہوں ــــــ" اپنے ہی سامنے کی اولاد جوان ہو جائے تو اس کے سامنے بھی تھوڑا بہت تو جھکنا ہی پڑتا ہے ــــــ!

"امی جان ــــــ روزوں اور عید کے بارے میں میں نہیں کہہ رہی ہوں ــــــ" وہ تن کر بولی ــــــ "آپ جس راستے پر مجھے چلانا چاہ رہی ہیں وہ میں اچھی طرح جانتی ہوں ــــــ میں ایسا کوئی کام نہیں کروں گی جسے میرا جی نہ کرنا چاہے ــــــ"

"تو سن اے ضدی لڑکی ــــــ شریف زادیوں اور اونچے خاندان کی طوائفوں کی طرح میں نے جاگیردار صاحب سے تیری نتھ اتارنے کی بات پکی کرلی ہے۔ روز روز ایسے لوگ نہیں جڑتے ــــــ اور پھر یہ تھوڑی ہے کہ نتھ اترائی کے بعد تو ان کی منکوحہ بیوی ہو جائے گی، وہ تو نئے راستے پر چلنے کی ایک شروعات ہو گی۔ بس اور جس پر تیرا دل آیا ہے الیسوں کو میں خوب پہچانتی ہوں ــــــ رنڈی کے لئے آنکھیں تو سب ہی بچھاتے ہیں لیکن اپنے گھر کے دروازے کی کنڈی کوئی نہیں کھولتا ــــــ تو پھر زندگی بھر جھک مارتی رہ، مجھے پروا نہیں ــــــ لیکن مجھے بھی تو اپنا بڑھاپا دیکھنا ہے ــــــ میرے دن تو گئے ــــــ تیرے ہی سہارے تو اب زندگی کا جوا کھیلنا ہے۔ تو بھی پتی ورتا بن کر بیٹھ گئی تو میں کیا بڑھاپے میں فاقے کروں گی ــــــ؟ آج سے دو تین دن بعد عید ہے۔ عید پر جاگیردار صاحب

آنے کو کہہ گئے ہیں، اسی دِن تاریخ پچی بز جائے گی ــــ ابھی تک تُو نے میری محبت ہی محبت دیکھی ہے ــــ نفرت اور غصّہ نہیں دیکھا ــــ دیکھنا ہے تو اس مرگھلے کو دیکھ لے ــــ اس چھاؤنی پر کبھی تُو نہ مانی تو اپنا انجام سوچ سکتی ہے ــــ میں جیل میں خوشی خوشی چکّی پیس لوں گی لیکن چھنال تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی ــــ"

کیسی پُرسکون زندگی گزر رہی تھی ؟ نہ وہ نیلی شرٹ والا آتا نہ نامُراد زندگی تیرا یہ حشر ہوتا ــــ اس کے بعد ایک بار وہ آیا بھی تو ایسے موقع پر جب امّی جان موجود تھیں ــــ شکر ہے اس نے کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے ظاہر ہوتا کہ وہ پہلے بھی آچکا ہے۔ بس کسی جگہ گانے کی فرمائش امّی جان کے سامنے کی اور انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "بٹیا ہم لوگ رمضان شریف میں گاتے بجاتے نہیں ہیں ــــ" مایوسی سے چلا گیا، مگر کہہ گیا تھا ــــ پھر کبھی آؤں گا ــــ اور ظاہر ہے وہ امّی جان کے لئے تو آنے سے رہا ــــ جاتے وقت کیسی بھولی اور معصوم نگاہوں سے دیکھ رہا تھا ــــ محبت کی وہ منزلیں جو لوگ برسوں میں نہیں پار کر سکتے۔ ہم نے محض دو ملاقاتوں میں اُلانگھ لیں۔ میں تمہاری نہیں ہو سکوں گی ــــ شاید کبھی نہیں ــــ مگر کاش قسمت تم سے یہ کہنے کا موقع ہی عطا کر سکے کہ میں نے اب تک سوائے تمہارے کسی کو نہیں چاہا، اور نہ شاید چاہ ہی سکوں گی ــــ

اور شاید قسمت اس پہ مہربان تھی اور یہ سب کچھ عین عید ہی کے دِن تو ہُوا۔ عید صحیح معنوں میں اس کے لئے عید ثابت ہوئی۔

عید کے دِن تو گھر آنے والوں سے عید ملنے والوں سے بھرا رہتا ــــ بڑے ہال کمرے میں سب ہی آ آ کر بیٹھتے رہے ــــ قہقہوں اور باتوں کی آوازوں سے چمن آرا کے کان پکتے رہے ــــ وہ اپنے کمرے میں اُداس بیٹھی ہوئی تھی کہ ایک

خادم جھجکتے ہوئے آیا اور بولا :

" چھوٹی بیگم صاحب —— آپ سے کوئی ملنے آئے ہیں —— " فلیٹ کے تین دروازے تھے، ہر دروازے پر کوئی بڑی بیگم صاحب پہرہ تو دیتی نہیں رہتی تھیں - ایک دم چمن آرا کے دِل میں اُمیدوں کا چاند سا روشن ہو گیا " وہی تو نہیں —— " اس نے گھبراہٹ اور خوشی کے جذبات کو چھپا کر کہا —— " کون ہے "

" وہ اپنا نام انوار بتاتے ہیں —— "

نام تو اس دِن اور دوسرے دِن بھی اس نے پُوچھا ہی نہیں تھا —— وہی ہوگا . ورنہ مجھ سے ملنے تو خاص طور پر کوئی آتا نہیں —— وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر ذرا دھیرے سے بولی ——

" دیکھو، پچھلے دروازے سے لے آؤ —— "، تھوڑی ہی دیر میں دروازہ کھلا —— اور وہی —— ہاں وہی کھڑا ہوا تھا —— جانے کہاں سے اتنی بے باکی چمن آرا میں آ گئی —— مُسکرا کر بولی ——

" کل اَبر تھا —— مَیں نے عید کا چاند دیکھنے کی بہت کوشش کی تھی، لیکن دیکھ نہ پائی تھی —— !! "

اس نے اندر ہو کر دروازہ بند کیا —— چیختی چڑھائی اور بے تابی سے تقریباً دوڑتا ہُوا آیا اور چمن آرا سے یُوں لپٹ گیا جیسے برسوں کے بچھڑے محبوب ملتے ہیں . وہ دونوں مُدّتوں یوں ہی لپٹے کھڑے رہے . بڑی مشکل سے وہ خود کو الگ کر پایا .

" چمن —— مَیں —— مَیں شاید تمہارے بغیر زندہ نہ رہ پاؤں گا —— مَیں مَر جاؤں گا چمن —— مَیں مر جاؤں گا —— "

" مگر شاید میں تمہاری نہیں ہو پاؤں گی انور —— میرا سودا ہو چکا ہے —— "

" سودا —— ؟ " وہ پیچھے ہٹا —— " سودا —— ؟ لڑکیوں کا کہیں سودا ہوا

کرتا ہے ؟ لڑکیاں تو بیاہی جاتی ہیں، بیچی نہیں جاتیں ــــ"

"پاگل ــــ" وہ ہنسی ــــ "تم اس کوٹھے پر تین بار آ چکے ہو ــــ یہاں تم نے گدیلوں پر کبھی چاندنیاں نہیں دیکھیں ــــ چاندی کے پاندان ، ناگردان ، اور اگالدان نہیں دیکھے ــــ قالینوں پر سجے ہوئے ساز نہیں دیکھے ــــ اور کچھ دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو ، مگر کارنس پر کبھی گھنگھروؤں کی جوڑیاں تو ضرور دیکھی ہوں گی ــــ اب بتاؤ پھر کبھی کچھ سمجھے یا نہیں ؟ سودے ایسی ہی جگہ پر طے ہوتے ہیں ، تم بھولے ہو بہت بھولے ــــ"

انوار دھیرے سے مسہری کی پائنتی سے ٹک گیا - دونوں ہاتھوں میں سر تھامے ہوئے ــــ چمن آرا اس کے پاس آ بیٹھی ــــ

"تم نے غلط جگہ دل لگایا ہے ــــ"

"میرا باپ کروڑپتی ہے ــــ" وہ شدت جذبات سے بپھر گیا" وہ مجھے چاہتا بھی بے حد ہے ــــ تمہاری ماں پیسہ چاہتی ہے ، تو میں تمہیں خریدنے کو بھی تیار ہوں ــــ میں تمہیں دُنیا دِکھا دے کر خرید لوں گا ، مگر پھر شادی کر کے باقاعدہ دُلہن بنا کر اپنی بیوی بنا کر گھر لساؤں گا ــــ لیکن تم خدا کے لئے ہاں کر دو"

"میں کچھ نہیں کر سکتی انوار ــــ میں اتنی ہی بے بس ہوں جتنی دُنیا کی کوئی بھی مظلوم لڑکی اپنی ظالم ماں کے ہاتھوں ہو سکتی ہے ــــ میں تمہارے لئے کچھ کر سکتی ہوں یا نہیں یہ بعد کی بات ہے لیکن ایک تحفہ تمہیں ضرور دے سکتی ہوں ــــ اور اس نے دیوانگی کے جذبات کے ساتھ اپنے اَن چھوئے اور کنوارے ہونٹ انوار کے کانپتے ہوئے گرم گرم ہونٹوں سے چپکا دئے ــــ ایک دم انوار پر پاگل پن سا چھا گیا ــــ اس نے تسلّی کی خاطر ایک بار بند چٹخنی کی طرف دیکھا اور پھر بندِ قبا جوانی کے ہاتھوں بے بس ہوتا چلا گیا ــــ

کچھ دیر بعد کسی کام سے جہاں آرا بیگم کو بیٹی کی یاد آئی تو وہ لپکی ہوئی اس کے کمرے کو چلیں —— مسہری سے لگی آرام کرسی پر نادم نادم سا انوار بیٹھا ہوا تھا —— اور پٹی سے لگی چمن آرا اپنی خوشیوں کے بوجھ سے نڈھال جھکی جھکائی —— اُن کی تجربہ کار آنکھوں نے ایک لمحے میں سب کچھ پڑھ لیا —— ثبوت کے طور پر وہ کچھ اور دیکھنا چاہتی تھیں —— سو پکارا ——

"چمن —— ادھر آنا ذرا ——"

چمن آرا اُٹھی —— چلی تو یوں ڈگمگاتی ہوئی جیسے اب گری کہ تب گری۔

یہ چال اُسی وقت بگڑتی ہے جب ہتھیلی پر مڑا تڑا نوٹ کڑکڑاتا ہے —— انھوں نے اس کی مٹھی کھول کر دیکھی —— خالی تھی !!

مٹھی خالی تھی، اور حرام زادی "بھری" بیٹھی تھی !

اُنھوں نے بہت —— بہت، بہوت ہی جھلاہٹ کا مظاہرہ کیا —— لیعنی ہاتھ پکڑ کر انوار کو اُٹھا کر کھڑا کیا اور رسان سے بولیں ——

"خالی بندوق داغنے والے تو میں زندگی بھر سے دیکھتی آرہی ہوں —— جیب میں مال پانی ہو تبھی پتلون ڈھیلی کرنی چاہیئے —— سمجھے —— اب نکل جاؤ یہاں سے ——"

چمن بیدِ مجنوں کی طرح تھر تھر کانپے جارہی تھی داماد سے نپٹ کر وہ بیٹی کی طرف مخاطب ہوئیں :

"کُتیا —— آج پتہ چلا چھنال کی اولاد چھنال ہی ہوتی ہے —— تو کون سی سہرے توروں کی بیاہی پیداوار تھی کہ سہروں توروں کا انتظار کرتی —— اب جو میں کہوں اس پر عمل کرتی جا ورنہ تیری بوٹیاں نوچ نوچ کر چیلوں کوؤں کو کھلا دوں گی —— سن —— وہ اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اونچی کرتی ہوئی بولیں ——

"جاگیردار صاحب آج بھی پئے ہوئے ہیں۔ بھرپور نشے میں ہیں ـــــ میں انہیں یہاں بھجوا تی ہوں، آدمی پیا ہوا ہو، اور بند کمرے میں جوان لڑکی ساتھ ہو تو پھر وہ کوئی وظیفہ نہیں کرتا، وہی کرتا ہے جو مرد عورت ہمیشہ کرتے آئے ہیں ـــــ تو انہیں سب کچھ کر گزرنے دینا ـــــ آگے میں نپٹ لوں گی ـــــ"

مہندی لگے ہاتھوں میں نازک انگوٹھیاں ـــــ جوانی کے خمار سے تپتا چہرہ ـــــ اور چہرے کو ڈھانپنے کے لئے مہندی لگے ہاتھ ـــــ مہندی جس کی خوشبو خود ایمان متزلزل کر دیتی ہے ـــــ اور اُن کا پاس جانا اور مارے نفرت کے اس کا دُور دُور ہٹنا ـــــ جیسے یہ ادائے دلبری بھے ـــــ اور پھر وہی گناہ ـــــ جو ازل سے اب تک ہوتا رہا ہے، ہوتا رہے گا ـــــ رات کے اندھیرے سے صبح کے اُجالے تک اور صبح کے اُجالے سے رات کی سیاہیوں تک ـــــ ہزاروں بار کا دُہرایا ہوا ـــــ مگر ہر بار نیا ـــــ مگر اتنا ہی پُرانا ـــــ

دروازہ کھلنے پر صاحبزادہ قمرالزماں صاحب جاگیردار نے توقع کے برخلاف منظر دیکھا ـــــ دیکھتے کیا ہیں کہ جہاں آرا بیگم رومال سے مونہہ ڈھانپے رو رہی ہیں ـــــ:

"بات کیا ہے آخر ـــــ" وہ سراسیمہ سے ہو کر بولے۔

"بات کیا ہوتی حضور ـــــ میری عمر بھر کی کمائی لُٹ گئی ـــــ پہلی" یونہی" آپ کے ہاتھوں ہوئی تھی سوا لاکھ میں ـــــ اور اب آپ نے تو آج یوں ہی . . ."

وہ پُرسکون ہو کر ہنسے ـــــ "اوہ بس اتنی سی بات ـــــ بھئی دھوم دھڑاکے سے تو نتھ اترے گی ہی ـــــ یقین نہ ہو تو اس وقت یہ ساری انگوٹھیاں رکھ لیجئے ـــــ" اور انھوں نے اپنی موٹی موٹی انگلیوں میں سے کھینچ کھینچ کر سچے ہیروں والی

قیمتی انگوٹھیاں ان کے قدموں میں ڈھیر کرنی شروع کر دیں۔

نہیں نہیں کر کے بھی لاکھ سے کم کیا رہی ہوں گی یہ ساری انگوٹھیاں ——
اب نتھ اترائی نہ بھی ہو تو کیا فرق پڑ جائے گا —— جہاں آرا نے خوش ہو کر دل میں سوچا ——

ڈیڑھ ماہ صاف نکل گیا —— اور دونوں باتیں ساتھ ہی ہوئیں —— اس دن صبح پہلی بار موہنہ دھوتے میں چمن آرا کو اُبکائیاں آ کر تے ہوئی، اور اسی دن شام کو جاگیردار صاحب اپنی لمبی سی گاڑی میں بیٹھ کر آئے اور سنا گئے کہ "بھئی کاروباری مصروفیت میں بات پیچھے پڑ گئی تھی —— اگلے ہفتے نتھ اترائی کی تقریب ہو گی ——"
اور انہوں نے پیشگی سوا لاکھ جہاں آرا کے قدموں میں ڈال دیئے، اور ساتھ یہ بھی سنا دیا —— "یہ تو سمجھئے چمن کا صدقہ ہے —— ہیروں کی نتھنی تو ہم خود پہنائیں گے، دھیلے کی نتھنی بھلے ہی ہم اتار دیں —— ناک سونی کیسے رکھیں گے —— جس ناک میں ہیرے کی نتھنی یا لونگ نہ ہو اس ناک کے نخرے ہی کیا —— ؟!"

مقررہ تاریخ پر ایک ایسی یادگار تقریب جڑی کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں —— کیا کسی کی برات اتنی شاندار ہو گی —— جاگیردار صاحب کئی موٹروں کی برات لئے آئے —— چمن آرا کو اپنی لمبی سی گاڑی میں اپنے ساتھ ہی بٹھایا —— جہاں آرا بیگم کو بھی اس خاص تقریب کے لئے اپنے ہی ساتھ مدعو کیا —— اور پورے کرّوفر کے ساتھ اپنی جگمگاتی کوٹھی پر پہنچ گئے ——

جہاں آرا بیگم کو خوشی یوں تھی کہ جوانی کا اوّلین تر و تازہ اور میٹھا میٹھا رس جو وہ حرام زادہ پہلے ہی پی گیا تھا، جاگیردار صاحب پر ایک راز ہی رہا، اور وہ یہ سمجھے رہے کہ اس کنوارے کھیت میں پہلی پہل کاشت میں نے ہی کی —— اور دوسری

اس سے بھی زیادہ اہم خوشی یہ تھی کہ بٹیا رانی حمل سے بھی تھیں ـــــ مگر اب یہ کس کو پتہ کہ ایک ہی گھنٹے کے وقفہ سے جو دو دو ہل چلائے گئے ہیں تو سہرا کس کے سر بندھے گا کہ کس کا بیج ہے، اچھا ہوا جاگیردار صاحب کے سر ہی بلا جائے گی ـــــ ویسے تو ہاتھ کی بات ہے جی چاہے رکھوں گی، جی چاہے ٹھنڈا گرم پلا کر پیٹ صاف کرا دوں گی ـــــ

صبح کا انتظار امی جان کو اصل میں یوں تھا کہ دیکھیں بٹیا رانی کو جاگیردار صاحب کیا تحفہ دیتے ہیں؟ شان دار کوٹھی کے شان دار ترین بیڈ روم سے ملحق گارڈن میں صبح سویرے جب اماں جان بیٹی سے بات کرنے پہنچیں تو یہ دیکھ کر ان کا جی جل گیا کہ بیٹی تو گہنے پاتوں سے لدی ہوئی ہے مگر سامنے وہی نامراد کھڑا دانتوں میں برش کر رہا ہے ـــــ

"تم ـــــ تم یہاں کیسے ـــــ؟" وہ ذرا تیزی سے بولیں ـــــ

اب چمن آرا نے بھی گھونگھٹ ہٹا کر اسے دیکھا اور چکرا گئی ـــــ بالکل ہی چکرا گئی ـــــ وہ تو انوار تھا ـــــ سونی صد انوار ـــــ

"میاں میں پوچھتی ہوں تم یہاں کیسے آئے ـــــ"

وہ ہنسا ـــــ "میں اپنے گھر میں ہوں بھائی ـــــ اپنے باپ کے گھر میں ـــــ اپنے گھر میں ہونا گناہ ہے کیا؟" کالج کے ٹور پہ گیا ہوا تھا ـــــ رات ہی تو واپس آیا ہوں . . ." اور اسی لمحے اس کی نظر چمن پر پڑی ـــــ وہ چکرا اٹھا ـــــ

سودا ـــــ؟ سودا ـــــ؟ سودا ـــــ!

چمن نے اسے دیکھا اور پاگلوں کے سے انداز سے چلا چلا کر ہنسنے لگی ـــــ

"امی جان ـــــ ذرا ایک رشتہ مجھے سمجھا دیجئے - یہ بچہ جو میرے پیٹ میں ہے، میرا بیٹا بھی ہو سکتا ہے ـــــ اور شاید میرا پوتا بھی ـــــ ہے نا امی جان -

ہوسکتا ہے اور بھی کئی رشتے، رشتوں سے نکل آئیں تو میں امّی جان ـــــ میں خود اپنی بہو بھی ہوئی اور اپنی ساس بھی ـــــ کیوں کہ امّی جان آپ کی عنایت کی وجہ سے باپ بیٹے ایک ہی تھالی میں کھا کر گئے ہیں ... ... امّی جان ذرا یہ رشتہ تو سمجھ لیجئے ـــــ پھر مجھے سمجھا ... ...” اور ایک دم وہ چیختے چیختے بے ہوش ہو گئی ـــــ

ہڑبونگ سن کر جاگیر دار صاحب باہر نکل آئے۔

”ارے بھئی کیا ہو رہا ہے ـــــ“ وہ چلائے ـــــ ماں کے ہاتھوں میں بیٹی کو یوں دیکھا تو حیران ہو کر بولے :

”اسے کیا ہوا ـــــ ارے میں پوچھتا ہوں چمن کو کیا ہوا ـــــ“

جہاں آرا بیگم نے بڑی ادا سے سر اٹھا کر جواب دیا۔

”اے حضور مجھ سے کیا پوچھتے ہیں ـــــ ایسی بھی کیا جوانی کہ پھول سی بچی کو رات بھر میں جھولا جھولا بنا دیا، اور اوپر سے یہ سوال کہ کیا ہوا ...“

اپنی لنگڑی جوانی کے سر ایسا شان دار سہرا بندھتے دیکھ وہ کھل کھلا اٹھے اور مسکرا مسکرا کر سو سو کے مٹھی بھر بھر نوٹ اپنی جیبوں سے نکال کر جہاں آرا کے سامنے ڈھیر کرتے گئے ـــــ

# چھنال

"رنڈی اور چیچک نکلے بغیر نہیں رہتے ——— میں تو پہلے ہی کہتی تھی ——"
اماں بی نے دھڑاک سے پاندان بند کیا، زور سے پانوں کی ٹوکری لڑھکائی، اور صابر میاں کی طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھا، جو دونوں ہاتھوں میں سر تھامے غم اور ندامت کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔

"موئی کٹنی، کوٹھے کی چھنال آخر چھنال ہی نکلی نا ——— ارے کوئی کمرے کی خبر تو لو ——— کہیں زر زیور پر ہاتھ صاف کر کے تو نہیں نکل گئی اپنے کسی دھگڑے کے ساتھ ———"

"اماں ———" زہرہ نے کچھ کہنا چاہا مگر لب نہ کھل سکے۔ صابر میاں کو کوئی چھرے سے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا تو بھی شاید ہی قطرہ بھر خون نکل پاتا ——— کیسی بھد ہوئی تھی!! کیسے بڑے بڑے وعدے، اور کیسی کیسی تعریفیں اماں کے سامنے کی تھیں، اور اب ———؟

خالی کمرہ اُن کا منہہ چڑا رہا تھا۔

رنڈی کو گھر میں بٹھا لینا کوئی معمولی بات بے کبھی نہیں۔ بڑے بڑوں سے سُنتے آئے ہیں۔ لاکھوں کا گھر خاک کرنے والی کیا کسی کے گھر کو جائے گی ——— لیکن صابر میاں کا دِل آیا بھی تو کس پر، دو ٹکے کی کوٹھے والی پر ——— ! گانا سُننے ناچ مجرے دیکھنے تو ہزاروں ہی دل والے کوٹھوں پر جاتے ہیں، لیکن یوں کوئی دِل نہیں ہارتا ——— اور یہ بے چارے پہلے تو کبھی کوٹھے پر گئے بھی نہیں تھے ——— بس اپنے ایک دوست کی شادی میں ہی تو گئے تھے ——— وہاں آگرہ کی کسی گوہر جان کا مجرا بھی ہونے والا تھا ——— آج کل تو موا فیشن ہی چل نکلا ہے کہ شادی بیاہ میں رنڈیاں بھی نچواتے ہیں ——— مجُرے کرواتے ہیں ——— اور اچھے اچھے شریفوں میں یہ سب ہو رہا ہے، اور لوگ بُرا مانتے بھی نہیں ہیں، یہ تو بڑے پن کی دلیل مانی جاتی ہے ——— جس شادی بیاہ کی محفل میں سلیقے سے چُنے گئے گدّوں پر سفید چاندنیوں کا مدار مسندوں اور جگمگاتے گاؤ تکیوں کے سہارے بیٹھی ہوئی "بیگمات" اپنے گلے کے سُر نہ جگائیں اور گھنگھرو نہ چھنکائیں وہ محفل ہی کیا ہوئی ———

گوہر جان کو دیکھا تو صابر میاں کا دِل اپنی جگہ چھوڑ بیٹھا ——— لوگوں نے دیکھا نہ محسوس کیا، یہ تو دِل بہلانے کی چیزیں ہیں ——— کوئی یوں جی تھوڑے ہی ہار بیٹھتا ہے مگر وہ اپنے جگری دوست انور سے دِل پکڑ پکڑ کر کہہ رہے تھے ———

"یار اس آگرہ والی نے دِل میں گرہ ڈال دی ہے ———"

پھر انور کے ساتھ ایک بار کوٹھے پر گئے ——— وہی مخصوص ماحول جس کے بارے میں قصّے کہانیوں میں پڑھا تھا۔ وہی بائی جی ——— وہی اُستاد جی ——— وہی سازندے ——— وہی فرش فروش، وہی گاؤ تکئے، چاندنیاں اور اس پر بیٹھی ہوئی روایتی طوائف ——— لیکن اللہ جانے کیا بات تھی کم بخت میں۔ دِل پری کے مارے

انداز ختم تھے اس پر ــــ ایک نگاہ غلط انداز سے اُنھیں دیکھا اور اپنے دوسرے چاہنے والوں کی طرف متوجہ ہو گئی ــــ جیسے کہتی ہو ــــ

"اور مرو ہم پہ ــــ لیکن ہمیں تمہاری کب پروا ہے ؟"

سامنے ہی سُنار زیورات کے ڈھیر سارے ڈبے کھولے بیٹھا تھا ــــ بیگانگی انداز سے ایک ایک زیور کو دیکھتی اور "اُونہہ" کہہ کر پرے رکھتی جاتی ــــ پنّے جڑی ایک انگوٹھی کو ذرا غور سے دیکھا تو بائی جی جھٹ پکے پن سے بولی:

"بیٹی انگوٹھی انگوٹھی کر کے میری جان کھائے جا رہی تھی، اب پسند آ گئی ہے تو لے کیوں نہیں لیتی ــــ" اور بائی جی نے سامنے بیٹھے ہوئے اکبر سیٹھ کی طرف لگاوٹ سے دیکھا۔

"ارے لے بھی لو ــــ" اکبر سیٹھ لاپروائی سے خوش دلی کے ساتھ بولے:

"ان انگلیوں میں تو پنّے اور ہیرے کی انگوٹھیاں ہی سجتی ہیں ــــ"

"میری اتنی بساط کہاں ــــ" وہ بناوٹی بھولپن سے بولی ــــ

"ارے میری جان ــــ دس ہزار بارہ ہزار کی انگوٹھی میں تمہاری بساط کہاں سے آ کر اٹک گئی ــــ پسند تو کر لو ــــ"

سُنار نے چودہ ہزار اور گیارہ ہزار کی دو انگوٹھیاں دمکتی اُنگلیوں میں پھنسا کر دیکھیں۔ بالکل برابر تھیں۔ اکبر سیٹھ نے اپنی دُکان کا کارڈ نکال کر سُنار کے آگے پھینکا ــــ "دُکان سے روپیہ اُٹھا لینا ــــ ہمارا نام بتا دینا ــــ" اسی چاندی کے پنجے سے جس میں دو جگر مگر کرتی انگوٹھیاں دمک رہی تھیں، اس نے حاضرین کو جھک جُھک کر آداب کیا اور صابر میاں وہیں ڈھیر ہو گئے ــــ "کہاں وہ اور کہاں تم ــــ میاں کوئی اور دوسری چوکھٹ دیکھو ــــ" اُن کے دِل نے انہیں سمجھایا۔ مگر دِل اب اُن کے قابو میں تھا ہی کب ــــ اور ایسے کتنے دِل تلووں تلے بچھے

پڑے تھے۔

انور نے ایک دِن اُنہیں بیٹھ کر سمجھایا۔

"ارے میاں یہ رنڈیاں صرف پیسہ بٹورنے کے لئے ہوتی ہیں، انہیں کبھی محبت نہیں ہوتی —— صرف پیسہ ہی ان کا مذہب ہوتا ہے —— تم کہاں اس کے چکر میں پڑ رہے ہو —— تم دیکھتے نہیں سب ہی کی طرف اسی محبت بھرے انداز سے دیکھتی ہے، جسے تم اپنے لئے مخصوص سمجھ رہے ہو ——" لیکن صابر میاں اُس کی اس دِن کی حیا اور نگاہ کو بھُول بھُول نہ پاتے تھے ——

اُس دِن وہ اکیلے ہی اس کے کوٹھے پر پہنچ گئے تھے —— ابھی لوگوں کی آمد شروع نہیں ہوئی تھی —— یہ پہلے تھے۔ کامدار مسند پر پَری بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ پاگلوں کی طرح بڑھے —— مسند سے ذرا ہٹ کر اس کی گہرے سُرخ رنگ کی کارچوبی کام کی چڑھانوں میں پاپوشیں پڑی ہوئی تھیں۔ انہوں نے بےتابی سے اپنے جُوتے اتارے، ایک جُوتا تڑپتا ہوا اُڑا اور جُوتی پر اوندھا جا پڑا —— انہوں نے جُوتے کو ایک نظر دیکھا اور بڑی تڑپ سے بولے ——"کس قدر خوش نصیب جوتا ہے!"

گوہر جان نے ایک نظر وہ منظر دیکھا اور شرم سے تپ گئی —— موُنہہ پھیر کر بولی ——

"بڑے بے ہودہ ہیں جی آپ ——" مارے حیا کے اس کی آنکھیں اُٹھ نہیں پا رہی تھیں ——

یہ انداز تو صابر میاں کو بالکل ہی مار گیا —— شرم تو صرف شریف عورتوں کا زیور ہے —— یہ بھی شریف عورت ہے اور خاندانی اور حیا والی —— لوگ یوں ہی بکتے ہیں۔ وہ اُدبدا کر اس کے قریب گھُس بیٹھے۔

"خُدا کی قسم ـــــ مت آزماؤ ـــــ مت آزماؤ ـــــ چین نہ پاؤ گی ـــــ
بِن موت مَر جاؤں گا ـــــ"

"جو دِل نہیں کہتا وہ زبان سے کیوں کہتے ہیں آپ ـــــ؟ کیا واقعی شیطان کے کان بہرے، حضور مَر جائیں گے ـــــ" اس انداز پر تو وہ اور بھی فِدا ہو کے تڑپ کر بولے ـــــ "کیا ابھی زندہ نظر آتا ہوں ـــــ؟"

وہ ایک ایسی ہنسی ہنسی جو اگر آسمان سے گِرے تو ہری بھری کھیتیوں تک کو جلا کر راکھ کر دے ـــــ

وہ تڑپ کر بولے ـــــ "ہنستی ہو ـــــ کیا جھوٹا نظر آتا ہُوں تمہیں ـــــ"

وہ مُسکرائی ـــــ "اپنے گریبان میں مونہہ ڈال کر دیکھئے ـــــ"

وہ بہرحال مَرد تھے، شرارت پر اُتر آئے ـــــ ہنس کر بولے ـــــ "تُم اپنے گریبان میں مونہہ ڈالنے دو تو ایک بات بھی ہے، چاند، سورج کے نظارے ہی ہو جائیں گے ـ میرے گریبان میں کیا دھرا ہے ـــــ"

اُس نے شرم سے تڑپ کر اپنے دونوں گورے گورے ہاتھوں میں چہرے کا چاند چُھپا لیا ـ

"اللہ ـــــ کتنے بے حیا ہیں آپ ـــــ یُوں بھی کوئی کہتا ہے ـــــ"

بس یہ شرم اُن کی دُنیا لُوٹ لے گئی ـــــ بے شرمی نے دُنیا میں اتنے گھر نہیں اُجاڑے جتنے اس نامُراد شرم نے ـــــ وہ بس الوز کو مَر مَر کر یہی سُنائے جاتے تھے ـــــ

"تمہیں یار تمہیں پتہ نہیں، وہ بڑی شرم و حیا والی، گھریلو بی بی بن کر رہنے والی عورت ہے، پتہ نہیں کیسے اس جنجال میں پھنس گئی ـــــ"

"مرد جب خود کسی جنجال میں پھنسنے والا ہوتا ہے تو اسی طرح کی باتیں

کرتا ہے ——" انور بیزار ہو کر بولا، مگر وہاں تو بس ایک ہی رٹ لگی ہوئی تھی۔
دو یا تین ملاقاتیں زندگی کا مول بن کر رہ گئیں —— لیکن آخری ملاقات
میں تو وہ بالکل ہی پاگل بن بیٹھے ——
کسی رئیس دوست کے ہاں سالانہ محفل جمتی تھی، جس میں ہر بار کسی نہ کسی چلبلت
پھرت والی طوائف کو بلایا جاتا تھا۔ اب کے بار قرعۂ فال گوہر جان کے نام پڑا ——
رات بھر کی محفل تھی —— صابر میاں کیسے چوکتے —— بنا پلک مارے سب کے
سامنے والی قطار میں بیٹھے۔ رات بھر اُسے نہارتے رہے۔ اُوپر موذن اذان کے
لئے منبر پر چڑھا اور اِدھر گوہر جان نے ہارمونیم بڑھایا —— رات بھر کے تھکے
ماندے، کوئی اپنے گھر سدھارا، اور کوئی وہیں پڑ رہا۔ سازندے ہاتھ پاؤں سیدھے
کرنے لگے، جس کو جہاں جگہ ملی وہیں پڑ رہا —— موٹے موٹے گدیلوں پر سفید سفید
چاندنیاں لگی ہوئی تھیں —— تکئے قرینے سے دھرے ہوئے تھے —— مہاوٹیں
برس رہی تھیں۔ تھکان اس پر سے رات بھر کی جگار —— آنکھوں میں نیند اُتر آئی
تھی —— صابر میاں کو جگہ بھی ملی تو گوہر جان کے قدموں —— جنے کتنی راتوں کے جگے
ہوئے تھے کہ محبوب دلنواز کے قدموں میں جگہ پاتے ہی بے سدھ ہو گئے۔
آنکھ کھلی تو کاہے سے کھلی کہ کسی کے ٹھنڈے ٹھنڈے ملائم ہاتھ اُن کے پیروں
کو چھو رہے تھے —— جیسے جنموں کی نیند سے آنکھ اُچٹ گئی —— کانوں میں شہد سا
برس رہا تھا ——
"ہائے ایسے بھی کوئی نہ سوئے —— ململ کے نامُراد کرتے میں جان کیا
کہہ رہی ہو گی —— اُوپر سے پیروں میں پاتابے بھی نہیں ——" اور اُنھوں نے
خود دیکھا تھا کہ پیروں کو ہاتھوں سے چھو کر اُس نے اپنے دوپٹے کو اُن کے پیروں
کے گرد مڑھ دیا تھا —— کہ پیر ذرا گرم ہو جائیں ——

"یہ ادا —— یہ خدمت گزاری اور ہمدردی کی ادا تو صرف ایک پتی ورتا گھریلو اور محبت والی بیوی میں ہی ہو سکتی ہے ——" اُنھوں نے اپنے ہزار تردید کرنے والے دِل کو سمجھایا تھا —— اور پتہ نہیں یہ ان کے اپنے تڑپتے دِل کا اثر تھا یا گوہر جان کو بھی صابر میاں پسند آ گئے تھے کہ وہ کوٹھے سے اُترنے پر راضی ہو گئی ——

یہ الگ داستان ہے کہ وہ کس طرح اپنی ماں کو منا پائے جو سیّد زادی تھیں —— سیّد صاحب کی بیوی تھیں اور پنج وقتہ نمازی تھیں اور اعتکاف میں بیٹھتی تھیں، اور مریمی روزے رکھتی تھیں —— شاید یہ مذہب سے حد درجہ بڑھا ہُوا لگاؤ ہی تھا جو اُنھیں وہ زیر کر سکے —— کہ "اماں گنہگار جب گناہوں سے توبہ کر لے تو خدا کے نزدیک وہ اتنا ہی معصوم اور مقدّس بن جاتا ہے جتنا کہ ابھی ابھی پیدا ہونے والا بچّہ —— اور اماں یہ تو سوچئے کہ وہ جو اپنی یہ مکروہ اور گھناؤنی زندگی چھوڑ دینے پر آمادہ ہوئی ہے تو خُدا نے ہی اُسے راستہ دکھایا ہو گا نا ——؟ تو جسے خدا راستہ دِکھا رہا ہے اُسے آپ کیوں گمراہ کئے دیتی ہیں ——؟"

"ارے بیٹیا —— جو پاؤں ایک بار مجرے کے لئے کھڑے ہو چکے ہوں وہ کبھی کسی گھر میں نہیں ٹِک سکتے —— ہزاروں کا موہنہ دیکھی ہوئی عورت ایک مرد سے مطمئن نہیں ہو سکتی، تم مانو یا نہ مانو —— ان آنکھوں نے تو یہی دِکھایا ہے کہ رنڈی اور چیچک نِکلے بغیر نہیں رہتے —— لاکھ روکنے کی کوشش کرو ——"

لیکن اکلوتے بیٹے کی آہ وزاری کام آئی —— اور اماں بی کا تھا ہی کون؟ لے دے کے ایک بیٹیا اور ایک بیٹی —— میاں تو مدت ہوئی اللہ کو عزیز ہو چکے

تھے ـــــ بیٹی تھی اس کی بھی منگنی ہو چکی تھی، آج نہ کل اپنے گھر جانے ہی والی تھی اور بیاہی بیٹی آئی بھی تو چند روز کے لئے ـــــ اس کا ساتھ ہی کیا ـــــ سیوٹ تو بیٹے سے ہی بھتی ہے اور اپنے جان کے ٹکڑے لاڈلے بیٹے سے بگاڑ کر کے رہتیں بھی کیسے ـــــ ؟ اور جو کبھی اکتا کر زہر وہر ہی کھا لیتا تو کہاں کی رہتیں؟ گوہر جان دُلہن بیگم بن کر گھر میں آگئیں ـــــ زہرہ نے تو بھابی بھابی کر کے ہاتھوں ہاتھ لیا، لیکن اماں بی نے بازو کے کمرے سے اتنی زور سے بیٹی کو سُنایا " رنڈی اور چھپکلی نکلے بغیر نہیں رہتیں ـــــ دیکھ لینا صابر میاں کی ناک کٹا کے ایک دن نکل بھاگے گی ـــــ"، کہ دُلہن بیگم کا ننھا سا دِل چُور چُور ہو گیا ـــــ

زہرہ بولی ـــــ" اماں خُدا کے لئے ایسا نہ کہیئے، بھابی کو دُکھ ہوگا اگر سُن لیا تو ـــــ"

اماں بی غصّہ سے بولیں ـــــ" اے شریف زادی کو شریف زادی کہیں گے تو رنڈی کو ڈنکے کی چوٹ پر رنڈی کہیں گے، اس میں دُکھ کی کون بات ہوئی "

کوٹھے پر پلی بڑھی، ہزاروں کے مجمع میں رہی بسی، تلوؤں تلے لاکھوں دِل کچلنے والی کی پہلی صبح بڑی عجیب وغریب نکلی ـــــ صبح ہی صبح چھ بجے سے اماں بی کے وضو کرنے، کھانسنے پھر نماز کے بعد تلاوت کرنے کی آوازیں ـــــ پھر زہرہ کے وضو، نماز، تلاوت کی گنگناہٹ ـــــ " اللہ میں بیاہ کر سُسرال آئی ہوں یا کسی مسجد میں آگئی ہوں ـــــ" اُس نے گھبرا کر سوچا ـــــ لیکن پھر توبہ توبہ کر کے خود ہی بُرے خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا ـــــ بازو دیکھا تو صابر میاں جو رات بھر " شرابِ ناب " کے غٹا غٹ پیالے چڑھاتے رہے تھے، بے سُدھ سوئے ہوئے تھے ـــــ

"اُٹھئے حضور۔ ۔ ۔" اس نے کندھا پکڑ کر ہلایا ـــــ پھر وہ خود ہی چونک اٹھی ـــــ نہیں ـــــ یہ قبلہ اور حضور جیسے الفاظ کوٹھے کی لغات میں تھے ـــــ اب مجھے شریف اور گھریلو عورت کی طرح "اے جی ـــــ سُنئے تو ـــــ کہنا چاہیئے۔ اس نے دوبارہ سے اُنہیں بلایا ـــــ" اجی سُنئے تو ـــــ کب تک سوتے رہیں گے۔ کام وام پر جانا ہے یا نہیں ـــــ"

انہوں نے چندھیائی ہوئی آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور شرارت سے اُسے اپنے بھاری جسم تلے دبوچ لیا ـــــ" آہاں کام ـــــ اس سے زیادہ ضروری کام کون ہو سکتا ہے بھلا ـــــ ؟؟"

پہلا ہی دن مصیبتوں کا دعوت نامہ لے کر آیا ـــــ وہ اور زہرہ نہا کر بال سکھانے چھت پر نکلیں تو سامنے کے بنگلے والا اپنی چھت پر کرسی ڈال کر کوئی کتاب پڑھتا بیٹھا تھا ـــــ دُلہن بیگم کو کمرہ اوپری منزل پر ملا تھا ـــــ اور کمرہ اس ڈھب کا تھا کہ بے حد شاندار کمرے سے ملی ہوئی سنگ مرمر کی چھت لگی ہوئی تھی ـــــ بیچ میں مونڈھے اور صوفے پڑے تھے، اور ساتھ ہی ایک بڑی میز بھی چائے پانی رکھنے کے لئے رکھی ہوئی تھی ـــــ منڈیروں پر خوب صورت پھولوں، اور ننھے ننھے پودوں والے گملے سجے ہوئے تھے ـــــ صابر میاں خوش حال آدمی تھے شہر میں بڑا کاروبار تھا ـــــ ذاتی دو منزلہ بنگلہ تھا، کسی چیز کی کمی نہ تھی ـــــ کنوارپن سے ہی وہ اُوپری منزل پر رہتے تھے ـــــ چھت بھی انہی کے استعمال میں تھی ـــــ شادی ہوئی تو ظاہر ہے کہ دُلہن بھی وہیں رہیں ـــــ

سامنے والا شاید کسی مجرے میں گوہر کو دیکھ چکا تھا ـــــ پہلے تو اُس نے اُچٹتی نظر سے دیکھا، پھر صورت شناسا تھی تو ذرا غور سے دیکھا ـــــ پھر پوری طرح

پہچان کر ذرا ہنس کر دیکھا، اور پھر ایک ہلکی سی سیٹی بجانے لگا۔

دُلہن بیگم نے سیٹی کی آواز سُن کر سر اٹھایا تو وہ ہنس کر پھکڑپن سے بولا ——

"میری جان، ایسی بھی کیا بات ہے —— نہا کر اس چھت پر بال سکھا رہی ہو —— پیسہ اور جوانی تو ہمارے پاس بھی فراغت سے ہے، ہمارے نصیب کیوں نہ کھولے —— ؟"

زہرہ نے بھابی کو ذرا گھبرا کر دیکھا، جس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں۔ اِک دم دُلہن بیگم نے زہرہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور بولیں ——

"بی بی، اب سے یہاں نہیں آئیں گے ہم —— اچھے لوگ نہیں ہیں اس بنگلے کے ——" اُس آدمی نے جو دونوں کو جاتا دیکھا تو ذرا زور سے بولا:

"ارے تم تو مُسلی کچلی تھیں، ذرا اس موُنہہ بند کلی سے تو میل کرا دو رانی ——"

یہ اشارہ صاف زہرہ کے لئے تھا۔ دُلہن بیگم کو پسینہ آگیا —— آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا —— کمرے میں آتے ہی دھپ سے مسہری پر گر پڑیں —— سِسکیوں سے بدن ہلنے لگا ——

"بی بی —— میں تم جیسے شریف لوگوں کے لائق نہ تھی ۔ ۔ ۔ ۔ میری وجہ سے تمہاری زندگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"بھابی ——" زہرہ نے اُس کے موُنہہ پر ہاتھ رکھ دیا ——" آپ بے کار کی باتیں کیوں سوچ رہی ہیں —— یہ سامنے کے بنگلے والے تو یونہی بے کار سے لوگ ہیں، اسی لئے تو ہمارا اُن سے کوئی میل جول نہیں ہے، ورنہ پڑوسی تو رشتہ داروں سے بڑھ کر ہوتے ہیں۔ بھائی جان نے شروع ہی سے ان لوگوں سے تعلقات نہیں بڑھائے۔ اسی اوچھے پن کی وجہ —— آپ اپنا دل کیوں بُرا کرتی ہیں؟"

"نہیں بی بی — تم نہیں سمجھو گی — میری رسوائی اگر میرا پیچھا نہ بھی کرے تو میری بدنصیبی میرا پتہ ڈھونڈھ نکالے گی — پھر میں کہاں چھپوں گی۔"

"بھابی آپ چپ کرجایئے خدا کے لئے ورنہ میں بھی رونے لگوں گی۔"

مگر دُلہن بیگم کے آنسو رُکنے کا نام نہیں لے رہے تھے —

چند روز اور گزرے — ایسی کڑھن اور کلفت میں گزرے کہ جس کی حد تھی نہ حساب — میاں تو واری نیاری تھے مگر اماں بی چپ رہتے ہوئے بھی ہزار بول بول جاتیں — کھانا بھی اُنہوں نے اس ٹیبل پر نہ کھایا جس پر دُلہن بیگم بیٹھتی تھیں — زہرہ کالج چلی جاتی — ورنہ اسی سے ذرا دل بستگی رہتی — میاں کو ٹھیل ٹھیل کر یہ خود کام سے باہر بھیج دیتیں کہ جب تک وہ اور یہ کمرے میں رہتے اماں بی کی غیر محسوس نگاہیں کلیجہ چھیدے ڈالتیں — کئی بار جی میں آتا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں بھی چل دیں، لیکن ایک بار گناہ کی جس دلدل کو پھلانگ آئی تھیں اب اُدھر کا رُخ کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھیں — زہرہ کالج سے آکر اوپر چلی آئی تو اماں بی کے بھجان شروع ہو جاتے —

"اپنی زندگی تو برباد کر ہی ڈالی، بہن کا ہی کچھ خیال کیا ہوتا — جب دیکھو تب موہنہ سے موہنہ لگا ہوا ہے — پہلے تو میں چھت پر پھٹکنے بھی نہ دیتی تھی، اب تو جب دیکھو تب بھاوج ہیں نندہیں اور بس چھت ہے —"

دُلہن بیگم حیران ہو کر سوچتیں کہ "اللہ زہرہ تو کبھی میرے پاس ہوتی بھی نہیں، یہ کیسا الزام ہے —" لیکن ایک دن پھٹ سے دُلہن بیگم کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ بڑی عجیب اور انوکھی سی بات تھی، لیکن اس دن زہرہ مغرب کے وقت

آئی تو ذرا گھبرائی ہوئی سی تھی —— دُلہن بیگم سے لپٹ کر بولی ——

"اچھی بھابی میری —— اپنی کالے ہرے پھولوں والی ساڑی پہننے کو دیں گی آج ——"

"اے لو ——" وہ ہنس کر بولیں —— "یہ پوچھنے کی کون ضرورت آن پڑی —— بھابی کی چیز نند کی نہ ہو گی —— ؟؟ لے جاؤ اور جو جی چاہے شوق سے لے لیا کرو ——"

دو بجے کھانے پر صابر میاں بول گئے تھے کہ رات دیر سے آئیں گے، کوئی میٹنگ تھی —— سب نے کھانا کھا لیا تھا۔ دُلہن بیگم میاں کے لئے بھوکی تھیں —— گرمی ہو رہی تھی، وہ چھت پر نکل آئیں —— ایک دم انہیں فضا میں کچھ نامانوسیت کا احساس ہوا —— وہیں ٹھٹھک گئیں —— پچھواڑے کی چھت پر پانی کی ٹنکیوں کے پیچھے سے سرگوشی کی سی آواز ابھری ——

"ہمت کیسے کی آج ——"

"بھائی جان نے کہا تھا دیر سے آئیں گے ——"

"اور جو آ گئے —— تو ——" ساتھ میں بوسے کی آواز ——

"اتنی بے وقوف نہ سمجھو —— اسی لئے بھابی کی ساڑی پہن کر آئی ہوں کہ جھپک لپک میں اماں یا بھائی جان دیکھ بھی لیں تو سمجھیں کہ بھابی تھیں —— ان کے طوائف ہونے کا ایک فائدہ ہمیں بھی تو ملا ——" ملی جلی ہنسی کی دبی دبی آوازیں ——

دُلہن بیگم کا خون اُن کی رگوں میں جمنے لگا —— آوازیں پھر سے ابھریں۔

"لیکن میں تو اب ترس گیا ہوں —— صرف بوسوں سے اور لپٹا لپٹی سے میری سیری نہیں ہوتی —— کوئی موقعہ —— ؟"

"بھابی کی ساڑیوں کی عنایت سے مل ہی جائے گا —" ہنسی کی پُراسرار آوازیں —

"دیکھو ٹال تو نہیں رہی ہو —"

"ٹالوں گی کیوں — کیا وہی میرے دِل کی آواز نہیں ہے ؟"

"اچھا ہوا تمہارے بھائی ایک رنڈی کو بیاہ کر لائے — اس کی آڑ میں تو ہم کافی دنوں تک رنگ رلیاں منا سکتے ہیں — کم سے کم تمہاری شادی تک ۔"

دُلہن بیگم سے اور کچھ نہ سُنا گیا —

"زہرہ بی بی — یہ خط پڑھ کر پھاڑ دینا — خُدا تمہیں خُوش رکھے اور سیدھے راستے پر چلائے — تمہاری منگنی ہو چکی ہے — اللہ کرے جلد ہی شادی بھی ہو جائے — تم میری ساڑیاں اتنے شوق سے کیوں پہنتی ہو ، مجھے پتہ چل گیا ہے — میری زندگی جیسی بھی گزری — گزری — رنڈی کی عزت ہی کیا — لیکن تمہارے بھائی کی بیوی اور تمہاری بھابی بن کر میں نے اس گھر میں جو بھی عزت کے دِن گزارے ان کا تقاضا یہ تھا کہ میں تمہیں غلط راستے پر چلنے سے نہ صرف ٹوک دُوں ، بلکہ بچا بھی لوں — میری بدنامیاں تو وفادار کنیزوں کی طرح میرا دامن تھام کر عمر بھر میرے ساتھ چلیں گی — میں تمہاری معصوم اور بے داغ زندگی کو یوں داغ دار کرنے میں حصّہ دار بنوں ! یہ نہیں ہو گا — بی بی میری ساڑیاں اور چادریں استعمال کرو گی تو میلی تو میری ہی ساڑیاں اور چادریں ہوں گی — لیکن تمہاری زندگی کی چادر پر جو داغ پڑیں گے وہ آبِ زمزم سے دُھل کر بھی پاک نہ ہو پائیں گے — خُدا اور اُس کے رسولؐ کے بتائے ہوتے راستہ پر چلو — یہی میری نصیحت اور یہی میری دُعا ہے — ایک بڑی بھابی

ہونے کے ناطے ـــــ

میں اس گھر میں سر جھکا کر، دلہن بن کر آئی تھی، خدا گواہ ہے تمہارے بھائی کے ہاتھوں کے لمس کے بعد اس جسم کو صرف ہوا، دھوپ اور چاندنی ہی چھو سکی ہے اور خدا کو بیچ میں لا کر تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ باقی زندگی بھی جہاں کہیں میں رہوں اس جسم کے چپے چپے پر صرف تمہارے بھائی کے بے مثال محبت بھرے نقوش ثبت رہیں گے۔ لیکن ایسی پیاری محبت کو چھوڑ کر صرف اس لئے سر جھکا کر اس گھر سے جا رہی ہوں کہ تم سر اٹھا کر جی سکو ـــــ

تمہاری بھابی

میں تو پہلے ہی کہتی تھی ـــــ اماں بی نے دھڑاک سے پاندان بند کیا، زور سے پانوں کی ٹوکری لڑھکائی اور کھا جانے والی نظروں سے صابر میاں کو دیکھ کر کہا ـــــ

"چھنال آخر چھنال ہی نکلی نا ـــــ"

# روزی کا سوال

"اری او خصم کی رنڈی ـــــ وہ میرے پاس آ رہا تھا ـــــ" بھرے بھرے بدن والی بولی ـــــ

"اری چل ری چل بھاڑ کھاؤنی ـــــ وہ میرے پاس آ رہا تھا ـــــ"

"ہاں ہاں وہ تیرا باپ تھا نا، اس واسطے تیرے کو گود میں سُلانے آ رہا تھا۔"

"اور نئیں تو وہ تیرا بچہ تھا نا ـــــ تیری مانڈی پر لیٹ کر تیرا دُودھ پینے آ رہا تھا ـــــ"

"ذرا ٹھہر تو چھنال گھوڑی تیرا مونہہ نئیں نوچ ڈالی تو میرے کو بولنا پھر ـــ"

اور ان شان دار ڈائیلاگس کے ساتھ وہ چھینا جھپٹی ہوئی کہ اشرف کے ہوش ٹھکانے آ گئے ـــــ ایک کے بال دوسری کے ہاتھ میں تو دوسری کے بلاؤز کے چیتھڑے پہلی والی کے ہاتھ میں جھول رہے تھے ـــــ

پہلی والی ہانپ کر بولی ـــــ "ٹھہر ذرا اسی سے پوچھ لے کہ وہ کس کے لئے

آ رہا تھا ——"

دوسری لپک کر اشرف کے پاس آئی اور اس کا کالر پکڑ کر بولی ——

"بولو صائب تم کس کے پاس جانے والے تھے —— ؟ میرے نا —— ؟ یا اس کٹنی دو ٹکے کی چھنال کے —— ؟"

اس کے انداز اس قدر جارحانہ تھے کہ اشرف جو آگے ہی باؤلا سا ہو رہا تھا بالکل ہی —— سٹ پٹا گیا ——

"جی —— جی —— وہ —— میں ——"

"ارے جی جی، میں میں کیا لگا لئے ہیں جی —— بکرے کے بچے کے جیسی، میرا نام شالو ہے —— اور وہ حرام کی جنی کتیا کی اولاد چنی ہے —— بولو شالو کے واسطے آئے تھے یا چنی کے —— ؟"

اشرف نے واقعی بکری کے میمنے کی طرح معصوم نگاہوں سے دونوں کی طرف باری باری دیکھا، زبان ساتھ چھوڑ گئی ——

"ابے بولتا ہے کہ دیوں ایک ریپاٹا ——"

شالو نے اشرف کو ایک طرف اتنی آسانی سے جھلا دیا کہ لمبا چوڑا مرد ہوتے ہوئے بھی وہ مارے ڈر کے دبک سا گیا —— یقیناً اس کے اندازے کے مطابق شالو ہی زیادہ طاقت ور اور تالبش قسم کی تھی، اس لئے اس نے اسی میں بھلائی سمجھی کہ وہ دھیرے سے شالو کا نام لے دے ——

"جی میں دراصل آیا تو آپ ہی سے ملنے کے لئے تھا۔"

"ملنے کے لئے —— ؟" شالو ایک حقارت آمیز قہقہہ لگا کر بولی

"ملنے کے لئے —— ؟ ارے صائب ملنے کے لئے تو ماں بہنوں سے جاتے ہیں —— ہم کیا تم کو اپنی ماں بہن لگتے ہیں —— ؟"

"جی ـــــ جی ـــــ دراصل میں ایک تجرباتی فلم لکھنا چاہتا تھا ـــــ"

"پھر تم ـــــ؟" شالو نے بہت کچھ سمجھ لینے کے انداز میں سر ہلایا "مطلب تم ایشٹرا بھرتی کروانے کو آئے ہوئیں گے ـــــ نا ـــــ"

"ایشٹرا ـــــ؟" اشرف گڑبڑا کر بولا ـــــ پھر ایک دم اس کے دماغ میں ایک بلب سا جلا ـــــ "ایکسٹرا" ـــــ وہ پہلی بار ذرا مسکرایا ـــــ

"جی نہیں ـــــ آپ غلط سمجھیں - میں ایکسٹرا بھرتی کروانے نہیں آیا ـــــ میں تو دراصل ایک کہانی لکھنے والا ہوں ـــــ اور کہانی کی تلاش میں یہاں آیا تھا ـــــ"

شالو ذرا مایوسی سے بڑے ذلیل کرنے والے انداز سے بولی ـــــ "تو یوں کہو نا صاحب کہ تمہاری گاڑی میں پٹرول نہیں ہے ـــــ"

اشرف نے سر موڑ کر باہر گلی کی طرف دیکھا جہاں یقیناً اس کی گاڑی نہیں کھڑی تھی، اس لئے کہ ابھی تک تو وہ اتنا خوش نصیب نہیں تھا کہ گاڑی خرید پاتا ـــــ وہ بولا -

"دیکھئے شالو بی بی، میرے پاس گاڑی تو ہے ہی نہیں - اس لئے پٹرول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ـــــ"

شالو چلا کر بولی - :

"ابے اُلو صائب ـــــ گاڑی میں پٹرول کا مطلب نئیں معلوم ـــــ ارے جو مرد ڈھیلا رہتا نا، اس کے واسطے ہماری بول چال میں ہم ایسا ہی بولتے کہ گاڑی میں پٹرول نئیں ـــــ تو آیا کیا کرنے ـــــ سمجھے کہ نئیں ـــــ او کہانیاں لکھنے والے صائب ـــــ"

اشرف کا پورا جسم پسینے میں بھیگ گیا ـــــ

اگر کوئی برابری کا مرد یہ طعنہ دیتا تو وہ ایسا کرارا ہاتھ دیتا کہ چودہ طبق روشن ہو جاتے ۔ مگر اس چھوکری کے وہ کیا مونہہ لگتا ۔

چنی موقع کی نزاکت سے فائدہ اٹھا کر دور جا کھڑی ہوئی اور شالو کو انگوٹھا دکھا کر بولی :

" لے کٹھینگا ــــ اب اترا تی رہ کہ وہ میرے واسطے آیا تھا ــــ ایسے چھوٹے ڈھول کو تو ہی سنبھال ــــ میں تو یہ چلی ــــ "

" چلی کہاں کُتے کی جنی ــــ میرے گراہک کو چھوٹا ڈھول بولتی ــــ "

" پھر کیا ــــ ؟ " چنی کا حوصلہ اس وقت بڑھا ہوا تھا ــــ وہ ہاتھ نچا کر بولی ــــ

" سو بار بولوں گی، چھوٹا ڈھول، چھوٹا ڈھول ، چھوٹا ڈھول ــــ اب بول کیا کرتی ہے میرا ــــ "

" چھوٹا ڈھول دکھ رہا تھا وہ تو تُو نے اس کو دیکھ کر اشارہ کیوں کری تھی ؟ "

" اشارہ میں نے کری تھی ؟ اری چھنال تو نے ہی ساڑی کا پلو سینے پر سے گرائی تھی ــــ "

" سینے پر سے پلو میں نے گرائی تھی ؟ اری جل ککڑی میرا سینہ ہی خود اتا تنا ہوا ہے کہ پلو گر گر جاتا ہے ۔ تیرے جیسا سپاٹ مرغی کا کھڑا اڑہ میرا سینہ نہیں ہے سمجھی ــــ "

" ہاں ہاں سب معلوم ہے، تیرے جیسا ربڑ کے کپ اوندھے کر کے میں نہیں رکھتی ــــ "

" کیا بولی ڈکر کی بچی ، میں ربڑ رکھتی چولی میں گھسیڑ کے ــــ لے دیکھ ادھر دیکھ ــــ "

اور اُس نے جھر رکر کے اپنا بلاؤز پھاڑ کے رکھ دیا —— نہ چاہتے ہوئے بھی اشرف کی نگاہیں اُٹھ گیئں، اور اُسے ایسا لگا جیسے اس کی ٹنکی پٹرول سے فُل ہو اور فی گھنٹہ ڈیڑھ سو میل کی رفتار سے اس کی گاڑی اُڑی چلی جا رہی ہو ——

کانوں میں شائیں شائیں کرتے انجن کو اُس نے بڑی مشکل سے روکا، اور مونہہ پھیر کر بولا ——

"شالو بی بی آپ خواہ مخواہ جھگڑے کھڑے کرتی ہیں ——"

باریک ساڑی کا پلو ایک تنا کے سے اپنے کھُلے سینے پر ڈال کر وہ اشرف کے عین چہرے کے پاس آکر چلاّئی ——

"بی بی —— بی بی —— بی بی ——؟ بی بی ہو گی تیری ماں، تیری بہن تیری ہوتی سوتی۔ میرے کو ایسے گالیاں مت دے، بڑا آیا کہانیاں لکھنے والا۔ چل نکل یہاں سے۔ کہانیاں قلم سے کاغذ پر لکھے جاتے ہیں —— یہاں ہمارے جسموں پر مردوں کے اُنگلیاں چلتے ہیں —— ایسی کوئی کہانی لکھنے کا ہے تو لکھ۔ نئیں تو اپنا راستہ ناپ —— وہ اُدھر ہیں سیڑھیاں —— جدھر سے چڑھا تھا۔"

"میں بھی سالا کدھر آکر پھنس گیا ——" اشرف نے خود کو سُنایا۔ "ریڈ لائٹ ایریا ——" پر کہانی لکھنے کا آئیڈیا پتہ نہیں کس منحوس گھڑی سے آیا تھا کہ لاکھ کی عزت خاک ہوئی جا رہی تھی —— نہ اب تک کوئی پلاٹ ہی ہاتھ لگا تھا، نہ کوئی خاص معلومات ہی مِل سکی تھیں۔ لے دے کے چند گالیاں ضرور نئی نئی معلوم ہو گئی تھیں —— لیکن اب اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس جنجال سے نکلے تو کیسے۔

دونوں شیرنیوں کی طرح ایک دوسرے کے سامنے تنی کھڑی تھیں ——

پرلے کمرے سے آواز آئی —— بے حد کراری!

"ارے چنتی ـــــ وہ تیرا گاہک پیچھے بابو کب سے آکر بیٹھا ہے، دوُدھ والا بھیا - کیا کر رہی ہے وہاں ـــــ"

شالو حقارت سے چنتی کی طرف دیکھ کر بولی :-

"اری او بھینس، جا اپنا دوُدھ دوہا لے، آگیا تیرا بھیا ـــــ"

چنتی کچھ فخر سے بولی ـــــ "اب بول نا کہ وہ بھی تیرا ہی گراہک ہے"

اب کی بار خلافِ توقع شالو جھلملاہٹ سے بولی :

"وہ تو تیرا بندھا ہوا گراہک ہے، میرے کو معلوم نئیں کیا ـــــ مگر جب کوئی نوا گراہکی کے واسطے آتا اور تو جھپٹ لیتی تو پھر میں کیوں تیری بوٹیاں نئیں نوچوں؟"

اتنے میں وہ کراری آواز والی محترمہ کمرے میں تشریف لا چکی تھیں ـــــ موُنہہ بھر کے پان ـــــ دانت سیتا پھل کے بیجوں کی طرح سیاہ ـــــ سر میں بے حد پچڑ پچڑ تیل، کان میں ادھ جلا سگریٹ اٹکا ہوا ـــــ بے حد گہرے رنگ کی لال لپ اسٹک جو اُن کے سیاہ چہرے پر سخت کنٹراسٹ پیدا کر رہی تھی ـــــ بڑے بڑے چھاپے والی ساڑی ـــــ میل بھرے زیوروں سے لدی ـــــ

"صائب! بائی جی کو سلام کرو ـــــ" چنتی نے اشرف کو تمیز سکھائی

ابھی اشرف سلام کر بھی نہیں پایا تھا کہ شالو ایک نظر اشرف اور ایک نظر چنتی کو ذرا حقارت سے دیکھ کر بولی :

"ان لوگ کو کہاں اِتی اَنگریجی آئے، کِتی بار سمجھائی تھی کہ ممّی بولا کر ـــــ"

اشرف نے بوکھلا کر شالو کو دیکھا جو بے حد لاپروائی سے کہہ رہی تھی -

"اِدھر پوُری چال میں بس میرے کو انگریجی آتی ہے صائب ـــــ معلوم ہے کیوں ـــــ؟ ایک بار میں پھلم میں کام کرنے کے واسطے گئی تھی اس واسطے"

"اچھا ——؟" اشرف کو دل ہی دل میں ہنسی آئی، لیکن وہ یہ ہنسی ہونٹوں پر لاکر اس جھگڑالو قیامت سے اُلجھنا نہیں چاہتا تھا —— بولا :

"پھر کیا ہوا —— وہ فِلم ریلیز ہوئی یا نہیں —— آپ کی ——"

"نئیں صاب وہ پھلّم میری غلطی سے ریلیج نئیں ہوسکی ——"

"وجہ کوئی ——؟"

"وہ وجہ یہ ہوگئی تھی ——" وہ ہاتھ ہلا کر بتانے لگی کہ پہلے ہی دن ہم چار پانچ چھوکری لوگ کو ایک ایکسٹرا سپلائی کرنے والا ادھر اسٹوڈیو میں لے گیا —— وہ پھلّم جو بناتا ہے اُس آدمی کو کیا بولتے صاب ——" وہ شاید بھول گئی تھی۔ اشرف نے یاد دلایا ——

"ڈائرکٹر ——"

لفظ کچھ مشکل تھا شاتو کے پلّے نہیں پڑا۔ ہاتھ کو جھٹک کر بولی :

"ہوئینگا کوئی بھی ڈکرڈ کا سگا میرے کو کیا —— ہاں تو معاملہ کائے سے تلپٹ ہوگیا، معلوم ؟ وہ پھلّم والا میرے کو سکھایا کہ اب تم نے ایک ڈیالوگ بولنا ——"

"ڈیالوگ ——؟" اچھا اچھا "ڈائیلاگ ——"

"دیکھو صاب میں پہلے ہی بول دی کہ اِدھر بس ایکلی کو میرے کو انگریجی آتی ہے —— تم بات پوری سُنو، بیچ بیچ میں ٹوکو مت، ایسے سے قصّہ سُناتے میں بہت ڈسٹرب ہوتا ——"

"ٹھیک ہے، معاف کردیجئے —— میں آگے سے چُپ چاپ سُنوں گا۔"

"تو تم گُنگے کی اولاد ہے کیا —— مونہہ میں زبان نئیں کیا جو چُپ چاپ سُنوں گا —— تمکا معلوم کس کو بولتے، جس کو بات کرنا نئیں آتا —— میرے کو

ایسے لوگ بڑے بھڑبھس لگتے کہ میں جو چپڑ چپڑ باتیں سناؤں اور خود خالی بیٹھ کر سُن رہئے ـــــ تم بات کرو ضرور، مگر کب جب تمہارے کو کوئی انگریجی بات سمجھ میں نہ آئے ـــــ"

"جی درُست فرمایا ـــــ" اشرف لبظاہر سنجیدہ ہو کر بولا

"تو وہ پھلّم بنانے والا میرے کو یہ بولا کہ اب تم یہ ڈیالوگ بولنا :" اگر تُونے میری طرف دیکھا تو میں تیری آنکھ پھوڑ دوں گی ـــــ" اب وہ جو وِلن تھانا۔ وِلن سمجھتے ہو کہ نئیں تم ـــــ"

"جی ہاں، جی ہاں سمجھتا ہوں وہی جو وِلن ہوتا ہے ـــــ"

"خاک پڑے تمہاری عقل پر ــ کے بول دیا، وہی جو وِلن ہوتا ہے۔ ارے وِلن وہ جو ہمیشہ پھلّم کی چھوکری کی عزت خراب کرتا ہے ـــــ"

"جی ہاں، میں بالکل سمجھ گیا ـــــ آپ بات پوری کیجئے ـــــ"

"تو وہ جو وِلن تھانا، اس نے میرے کو لال لال آنکھوں سے گھورا تو میں خوب تیزی سے دَوڑی ـــــ ایسا بولتے ہوئے کہ " اگر تُونے میری طرف دیکھا تو میں تیری آنکھ پھوڑ دوں گی ـــــ" مگر شاید میرے آنکھ پھوڑنے میں کچھ کسر رہ گئی ہوئیں گی، کیوں کہ اس کا دیدہ برابر سے میرے ہاتھ میں نئیں آیا ـــــ بس ذرا سی کمی رہ گئی ـــــ سب لوگ بجائے واہ واہ کرنے کے وِلن کی طرف دوڑے، کیوں کہ وہ ہائے ہائے کر کے وہیں لمبا لمبا لیٹ گیا تھا اور آنکھ کے آزو بازو سے اور گال پر سے کچھ خون بھی نکل رہا تھا ـــــ؟"

اشرف نے اپنا گال سہلایا ـــــ اور دھیرے دھیرے سر ہلا کر بولا :

"جی ہاں، دراصل وہ فلم ڈائرکٹر آپ کے فن کو پرکھ نہ پایا، ورنہ فلم ہِٹ ہو جاتی ـــــ"

"ارے مئیں جی صاحب —— پھر میں اس چکر میں پڑی ہی نئیں
—— معلوم کیوں ——"

"جی نہیں ——" اشرف سہمی صورت بنا کر بولا —" وہ اس
واسطے کہ میرے کو جلدی ہی معلوم پڑ گیا کہ جو دھندہ یہاں شرافت سے کوٹھری
میں بیٹھ کر ہوتا وہی سب ایکسٹرا لڑکیوں کے ساتھ بے شرمی سے باہر ہوتا ——
تو تم ہی بتاؤ صاحب یہ شرافت کا دھندہ یہاں اچھا کہ کھلے میں سب کے سامنے
—— اصل سوال تو روپے کا ہے —— وہ تو یہاں بھی ملتا صاحب —— ہے
کیا مت ——؟"

"پتہ نہیں بائی جی کب چنّی کو اپنے ساتھ لے کر کوٹھڑی کے پچھواڑے
چلی گئی تھیں کہ اب شالو کی باتوں سے ذرا مہلت پائی تو اشرف نے دیکھا کہ
چنّی ساڑی برابر کرتی، بلاؤز کے ہُک لگاتی پھر سے کوٹھڑی میں وارد ہو چکی تھی
کچھ فاتحانہ انداز سے وہ شالو سے بولی :
"تُو تو یونہی ہٹھل ٹکوری میں لگی رہی، دیکھ میں نے تو ایک گراہک بھی
نمٹا دی ——"
"کِتّا دے کر گیا ——" شالو بڑی خوشی سے بولی ۔
"وہ تو روز کا بندھا ہوا ہے —— تین روپے ——"
شالو کے چہرے پر دُکھ کا ایک رنگ سا آ کر گزر گیا جسے اشرف نے
بڑی حیرت سے دیکھا ——
"ایک بار ——؟" وہ اپنے مخصوص چھُپے ڈھکے لہجہ میں کچھ پوچھنے لگی
جو اشرف کے پلّے نہ پڑا ——
"پھر اور کِتّی بار —— اصل میں دیوالی، عید دونوں قریب ہیں نا۔ دیکھ

"اری چل ہوی —— تیرے میں کیا دم ہے، بس زبان ہی چلتی ہے تیری تو —— اور گراہک کو پھانسنے کے واسطے کچھ اور بھی چلانا پڑتا ——"

"حرام کی جنی —— ایک ایک رات میں بارہ بارہ کو بھگتا کے بیٹھی ہوں۔ میرے کو سمجھتی کیا ہے ——"

"اور بکے نئیں تو اپنے آپ کو کیا سمجھتی، میرے کو تو پچکی کے ویسی کمر دکھتی تیری ——"

"اری چھنال —— پچکی کے ویسی کمر پر تو مرد کی جان جاتی —— تیرے جیسی زہر کی پٹاری نئیں ہوں میں کہ مرد بازو سے اُٹھے تو انگ دھونے کو سیدھا موری میں بھاگے ——"

ابھی جنی کچھ جواب بھی نہ دے پائی تھی کہ پھر بائی جی وارد ہو گئیں —— ان کے ایک ہاتھ میں بھیل پوری کی ایک میلی سی رکابی تھی، جس میں سے وہ پھنکے لگاتی جا رہی تھیں۔ بیچ بیچ میں وہ اپنی کتھے چونے سے لتھڑی اُنگلی سے ہری مرچوں کی چٹنی بھی چاٹتی جا رہی تھیں ——

"دیکھ شالو ——" انھوں نے اُسے غیرت دلائی۔

"جنی نے میرے کو آٹھ آنے بھیل پوری کے واسطے کمیشن سے ہٹ کر دی —— تُو تو کمینی ہے۔ کنجوس ٹی —— کچھ نئیں دیتی ——"

شالو نے صرف غصہ سے دیکھا، کہا کچھ نہیں۔

"اور ہولی پر ساڑی بھی دی تھی —— اور عید پر کان کے پھول بھی..."

مگر شالو پھر سے باہر جھانکتے اس شرمیلے مرد کو گھیرنے کی کوشش میں لگ گئی تھی، بائی جی نے اشرف کو ذرا غور سے اور زیادہ غصہ سے دیکھا اور غصہ کے اظہار کے طور پر ذرا زیادہ چٹنی کھا کر بولیں:

"اب کیا ہے ——؟"

"اب ——؟ جی —— جی ——" وہ بوکھلا کر بولا : جی —— جب بھی کچھ نہیں تھا ——"

"وہ تو میرے کو معلوم ہے جی کہ جب بھی کچھ نہیں تھا، اسی لئے تو پوچھ رہی ہوں، کہ اب کیا ہے ——"

اچانک اشرف کو احساس ہوا کہ اس نے واقعی اب تک سخت حماقت کا مظاہرہ کیا ہے۔ ڈھلتی شام کے اس بزنس کے سمے وہ ان لڑکیوں کا مالی نقصان کر رہا تھا۔ اگر وہ کسی غلط ارادے سے نہیں بھی آیا تھا تو کم از کم اسے اتنا تو کہہ دینا ہی چاہیئے تھا کہ وہ کچھ کرے یا نہ کرے۔ بہرحال پیسے ضرور دے گا تاکہ ان لڑکیوں اور بائی جی کو کوئی اعتراض اور مالی تکلیف نہ ہو ——

وہ سخت کشمکش کا شکار تھا کہ اس قسم کی گندی سودے بازی کے لئے کون سے الفاظ استعمال کرے، بہرحال ہمت کر کے بولا :

"جی آپ کو روپیہ بھی توقع سے زیادہ ہی دے جاؤں گا ——"

بائی جی زہرخند ہنسی کے ساتھ بولیں :

"کیا خالی باتوں کے پچاس روپے دے جائیں گے —— یہاں تو "بیٹھنے والے" بھی پچیس نہیں دیتے ——"

وہ بڑی تکلیف سے بولا —— "جی میں ایک دو گھنٹہ اور رکوں گا۔ اور سو روپے دے کر جاؤں گا ——"

ایک دم ایک طرف سے شالو دوسری طرف سے چنی اس سے آکر لپٹ گئیں۔

"صاحب مگر تم یہ روپے کس کو دیں گے ——؟"

"صاحب یہ روپے تم میرے کو دیں گے نا ——؟"

"صائب پہلے سچی بولو، تم نے میرے کو دیکھ کے مُسکرائے تھے نا ـــــ؟"

"صائب تم شرما کے بات مت ٹالو۔ تم نے پہلے سچی بولنا میرے کو آنکھ مارے تھے نا ـــــ؟"

سو روپے کی نوید سُن کر بائی جی کے الگ دیدے پھٹ گئے تھے ـــــ وہ تو اچھا ہوا بھیل پوری وہ پہلے ہی چٹ کر چکی تھیں۔ البتہ میلی تام چینی کی رکابی ایک چھناکے سے گری اور یہاں وہاں باریک باریک تام چینی کے ریزے پھیل گئے ـــــ ٹین کی رکابی دیر تک کھڑ کھڑ کھڑ گول گول گھومتی اور بجتی رہی۔

اشرف کا اپنا دماغ بھی گول گول گھوم رہا تھا ـــــ

"کس اُلو کے پٹھے نے تمہیں یہ مشورہ دیا تھا بیٹے کہ طوائفوں پر فلمی کہانی لکھو اور نام کماؤ ـــــ"

دونوں کی کھینچا تانی اختتام پر یوں آئی کہ چالاک شالو نے چنی کے حق میں فیصلہ دے دیا کہ باہر کھڑا ہوا وہ شرمیلا نوجوان تجھے ہی اشارے کر رہا تھا ـــــ شالو یقیناً زیادہ چتری تھی، کیوں کہ چنی پردے کے پیچھے اپنا سنگھار تازہ کرنے چلی گئی تو وہ اشرف کے کندھے پر جھک کر بولی ـــــ

"وہ چھنال رنڈی اب دفعان ہو گئی ـــــ اب تم صائب جو چاہو کر لیو۔ مگر وہ سو روپے میرے کو دے دیو ـــــ"

"اشرف نے احمقوں کی طرح پوچھا ـــــ

"چنی کہاں چلی گئی ـــــ؟"

"ارے وہ جب سے جھانک رہا تھا نا، جس پر ہم دونوں لڑ رہے تھے ـــــ وہ اس کو لے کر پچھواڑے چلی گئی ـــــ"

"تو آپ نے اُسے کیوں جانے دیا ـــــ"

"ارے صاحب ——" وہ اس سے دُور ہٹ کر اسے غور سے دیکھتی ہوئی بولی —— تمہارے اس کھوپڑے میں کچھ عقل ہے کہ نہیں —— وہ بھاڑ کھاؤ لے کیا دینگا —— زیادہ سے زیادہ پانچ روپے —— بہوت ہوئے دس روپے، اسی واسطے تو میں نے چٹکی کو بول دی کہ وہ آدمی بچی تیرے کو ہی تانک رہا تھا۔ اب دیکھو وہ ادھر چلی گئی تو تم میرے کو مل گئے —— مطلب پورے پچاس روپلے میرے ——"

"پچاس ——" اشرف حیرت سے بولا: "لیکن میں تو آپ کا وقت خراب کرنے کا پُورا سو روپے دوں گا۔"

"ہاں صاحب —— ؟ تم تو سو ہی دیں گے۔ مگر وہ کھوسٹ چھنال ممی چالیس روپے لے لیں گی —— اور وہ موا بھڑوا دس روپے —— پچاس میرے کو بچ جائیں گے ——"

"یہ ممی اور . . . ." وہ کچھ رُک کر بولا: "بھڑوے کا کیا قصہ ہے مگر"

"اونہہ ——" وہ بے حد حقارت سے بولی —— "صاحب تم بھی نمبر ون کے جاہل ہو۔ ارے یہ بائی جی ہے نا —— یہ ہم جیسی دس بارہ چھوکریاں رکھتی، اس کا اپنا ایک آدمی رہتا۔ وہ بڈھی بائی جی کہلاتی، وہ ساتھ والا جو گھیر گھار کر تم جیسے شریف، کمین مردوں کو لاتا بھڑوا کہلاتا —— آدھی ہماری کمائی تو یہی دو کھا جاتے ——"

اشرف رُک رُک کر کچھ حیرت سے بولا ——

"تو آپ ان صاحب کو بھڑوا ہی کہہ کر پکارتی ہیں ——"

وہ بڑی لاپروائی سے بولی —— "جس کا جو جی چاہے کہہ لے، ہم نے اپنی آسانی اور سہولت کے واسطے نام رکھ لئے ہیں —— اب جیسے سامنے مونہہ پر

مونہہ پڑتا تو اس کھوسٹ رانڈ کو ممی بولنا پڑتا ــــ پیٹھ پیچھے ہم چھوکریاں اس کو "چنڈالنی" بولتے ــــ بھڑوا جو ہے اس کو "کھونٹیا ــــ" بولتے ــــ گراہک جب ہم خود پھانستے تو کبوتر پکڑنا بولتے ــــ بھڑوا گھیر گھار کرلاتا تو "مرغا پھنسا" بولتے ــــ رات گزارنے کو "بیٹھنا" بھی بولتے اور اپنے بالکل ہی آپس کی بات ہو تو بولتے "کتنوں کو رات بھر میں مہندی لگا کے چھوڑی . . . "

اشرف گھڑوں پسینے میں نہا رہا تھا، مگر شالو ــــ بے تکان سناتے جا رہی تھی ــــ

"یہ سب ہمارے راز کے باتاں ہیں۔ سب کو تھوڑی بولتے صائب !"

"تم بولے نا صائب کہ تم کہانیاں لکھتے تو اسی لئے بتا دی صائب کہ شاید اپنے نصیبوں کی کہانی کبھی لکھ دیو صائب ــــ یہ انڈیا میں بہت پورٹی ہے۔ انڈیا اپنے ہندوستان کو بولتے ــــ پورٹی بولے تو غریبی! بس۔ پورے آزو بازو میں ایک میرے کو ہی انگریجی آتی صائب باقی تو سب جاہل ہیں رانڈاں ــــ بس گراہک ــــ آیا کہ بستر کے ویسا بچھ گیاں ــــ میں اخبار بھی پڑھتی ہوں صائب مگر اخبار اپنے پیسے سے نئیں پڑھتی، جوؤں کے پیسے سے پڑھتی ہوں . . . . "

"جوؤں کے ــــ؟" اشرف ہڑبڑا کر بولا۔

"ہاں صائب ــــ جوؤں کے ــــ صائب ــــ، یہ ہماری بھاڑ کھاؤنی ممی ہے نا، یہ نشے میں دھت رہتی، کسی سے پاؤں دبواتی، کسی سے جوواں دکھواتی، پاؤں دبوانے والی کو ایک گھنٹہ کے پچاس پیسہ دیتی۔ اور جوواں نکالنے کا ایک جوں کا پانچ پیسہ ــــ

تو صائب ــــ میں ساڑی کے پلو میں کالا زیرہ باندھ کے رکھ لیتی ــــ

صائب کالا زیرہ تم سمجھے نا ——— دال سالن میں پڑتا وہ ———
بس اس چھنال کے سر میں بیس پچیس کالے زیرہ کے دانے چھوڑ دیتی میں،
اور ڈھونڈھ کر نکال نکال کر اس کی ہتھیلی میں رکھتی جاتی ———
اس کو آنکھاں سے ذرا کم دکھتا صائب ——— بس وہ ہتھیلی پر کالی چیز دیکھ کر
سمجھتی کہ جوں ہے اور ہر جوں کے پانچ پانچ پیسے دیتی جاتی . . . "
اب کے اشرف نے ذرا غصہ سے اسے دیکھ کر پوچھا :
"مگر آپ ایک بات بتلانے کی کوشش کریں گی کہ آخر آپ لوگوں کو پیسے کی
اتنی لالچ کیوں ہے ؟ جب سے آیا ہوں دیکھ رہا ہوں ——— پہلے تو آپ نے مجھ
غریب ہی کی وجہ سے چنی سے وہ مارا ماری کی کہ اسے لہو لہان کرنا باقی رہ گیا ———
پھر اپنی داستانیں بھی خود ہی سنا رہی ہیں ——— اب میرے سو روپے دینے کی بات
سن کر چنی کو بھگا دیا، یہ سب کیا ہے ؟"
"روزی کا سوال ہے صائب ———" شالو نے بے حد بے نیازی سے
جواب دیا ———
"روزی کا سوال تو چنی کے لئے بھی ہے، اور ان آٹھ دس غریب
لڑکیوں کے لئے بھی، جنہیں میں نے نہیں دیکھا ——— لیکن جو ان ہی پنجروں میں
کہیں بند ہوں گی ———" اس کے اندر کا فن کار جاگ اٹھا تھا، اور وہ سچ مچ
شالو پر غصہ ہونے لگا تھا ———
"صائب چڑو مت بھی ——— سب اپنی اپنی کھینچ پر رہتیاں ہیں ———"
وہ ہاتھ ہلا کر بولی -
اشرف نے جل کر پوچھا ——— "اور یہ تو بتائیے کہ آپ نے اب تک
کتنی جمع جتھا جوڑ لی ہے ——— ؟"

شانو نے اِدھر اُدھر دیکھ کر اطمینان کر لیا کہ کوئی سُن تو نہیں رہا۔ اشرف کے کان کے پاس موںھہ لا کر بولی ۔۔۔ "ڈیڑھ ہزار ۔۔۔"

اس کا انداز یوں تھا کہ گویا اشرف کا اتنی بڑی رقم کے بارے میں سُن کر ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا، بہر حال وہ سب سے بڑا کہانی نویس نہیں تو اتنا حقیر بھی نہ تھا ۔۔۔ سال کے پندرہ بیس ہزار تو بنا ہی لیتا تھا ۔۔۔

"اتنا روپیہ ۔۔۔ یعنی کہ اتنا بہت سارا روپیہ جمع کر کے آپ کریں گی کیا ۔۔۔ ؟" وہ نہیں چاہتا تھا کہ ڈیڑھ ہزار کو اتنے حقیر انداز میں بتائے کہ شانو شرمندہ یا غصّہ ہو جائے۔

"اس میں کچھ روپیہ اور جمع کروں گی، اس کے بعد ایک گھر بناؤں گی۔"

"گھر ۔۔۔ ؟" اشرف حیرت سے بولا ۔۔۔

"ہاں ہاں گھر ۔۔۔ کبھی گھر نئیں دیکھے صائب تُم نے۔ چار دیواری کا گھر جو بس اپنا ہو ۔۔۔ شادی وادی تو ہم جیسوں سے کون کرنے چلا صائب، اس کی آرزو کرتے بھی نئیں ۔۔۔ مگر گھر ضرور ہونا چاہیئے صائب، کیوں ۔۔۔ کیوں بولے تو کیا ۔۔۔ معلوم ۔۔۔ ؟"

اس اندازِ سوال پر اشرف کو وہ سخت معصوم لگی ۔۔۔ وہ کچھ نہیں بولا ۔۔۔ وہی سُنانے لگی ۔۔۔

"کیوں بولے تو کیا ۔۔۔ معلوم صائب، اس واسطے کہ طوائف کا بُڑھاپا بڑا ہی سخت ہوتا ۔۔۔ کوئی نئیں پوچھتا صائب ۔۔۔ میں کتنے رانڈاں دیکھی ۔۔۔ سڑک کے کنارے مرتے وے دیکھی صائب ۔۔۔ بس اس واسطے دل بولتا کہ ایک اپنا چھوٹا سا گھر ہوتا ۔۔۔ اس گھر میں کچھ نئیں، کچھ نئیں تو بھی میں پھولوں کے پودے ضرور لگاؤں گی صائب، کیوں بولے تو کیا معلوم صائب ۔۔۔ اس واسطے کہ اس

پنجرے میں رہتے رہتے میں ٹھنڈی ہوا کے واسطے ترس گئی صاحب ——" اچانک اس کی آواز رندھ گئی۔

اشرف کچھ نہیں بولا —— کچھ بول ہی نہ سکا۔ اس کی جیبوں میں سب کُل ملا کر دو سو سو روپے نکلے۔ وہ اس نے سب کے سب شالو کے ہاتھ پر رکھ دیئے اور بھیگی ہوئی آنکھیں لئے اس پنجرے سے باہر نکل آیا ——

تین برس بعد جب اشرف کی پہلی فلم ہٹ ہوئی جو اس نے طوائفوں کے ٹاپک پر لکھی تھی تو اس پر شہرت اور دولت کے دروازے کھل گئے —— اسے سب سے پہلے شالو یاد آئی ——

اس کی لمبی سی گاڑی جب اس بدبودار تنگ گلی کے سامنے جا کر رُکی تو پنجرے نما کوٹھریوں سے سستے کریم پاؤڈر اور گہری گہری لپ اسٹک سے سجے کتنے ہی تازے باسی چہرے جھانکنے لگے —— وہ سب کو نظر انداز کرتا ہوا شالو کی کوٹھری میں پہنچ گیا ——

بائی جی کان میں ٹوٹی بیڑی دبائے میلی رکابی میں بھیل پوری کے پھنکے لگا رہی تھیں —— گاڑی کو اپنے گھر کے سامنے رکتا دیکھ کر وہ ذرا ناقابلِ یقین انداز میں لڑکھڑائی تو تھیں۔ لیکن یہ سوچ کر کہ وہ کہاں اور ایسی گاڑی کہاں، پھر بھیل پوری کھانے میں جٹ گئی تھیں۔ لیکن اب اتنے پورے اونچے مرد کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ پوری کی پوری بوکھلا گئیں اور جو اٹھی ہیں تو رکابی مع بھیل پوری کے ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر گری اور کھڑ کھڑ کھڑ کھڑ کی آواز کے ساتھ گول گول گھومنے لگی ——

اس شان اور رُعب داب کی وجہ سے وہ اسے پہچان نہ پائیں۔ اشرف

کے لئے بھی سب نئے نئے چہرے تھے ـــــ وہ رُک رُک کر بولا :

"وہ ـــــ وہ شالو بی بی کہاں ہیں ـــــ ؟"

دو چار لڑکیاں کھُسر پھُسر کر کے ہنسنے لگیں ۔

بائی جی کراری آواز سے بولیں ـــــ کراری آواز جو لجاجت سے اور خوشامد سے بوجھل تھی ـــــ

"اِتی پُرانی باسی چھوکری کو کیا پوچھنا سرکار ـــــ اِدھر دیکھو . . . "

وہ سٹ پٹا کر بولا ـــــ "جی مجھے اُن سے کچھ بات کرنی تھی ـــــ وہ شالو بی بی اور ان کی ایک ساتھی چینی . . . . . .

"ارے وہ چینی ـــــ بڑھیا نے نفرت سے کہا "سڑ گئی رانڈ وہ تو ـــــ"

"جی ـــــ" اشرف کا دِل دُکھ گیا ۔

بڑھیا لاپروائی سے بولی ـــــ "ہاں کوئی روگ لگ گیا تھا ـــــ پورا انگ دانوں اور پھُنسیوں سے بھر گیا تھا ـــــ کوئی موہنہ میں پانی ڈالنے کو بھی خالی نہ تھا ـــــ وہی پاگل رانڈ شالو اس کو لے کر گئی، ہسپتال میں داخل کروائی پوری جمع جتھا اس پر لٹا دی اپنی، اس گدھے کی اولاد نے ـــــ"

"جی ـــــ ؟" اشرف کو یقین نہ آیا ـــــ "مگر مجھے تو ایسا یاد پڑتا ہے کہ ان کی اور چینی کی بڑی سخت لڑائی رہتی تھی ـــــ" وہ بڑی مشکل سے بولا :

لڑائی تو ایسی رہتی تھی کہ مُرغیوں کی، بلیوں کی، چڑیلوں کی لڑائی کیا ہوئیں گی ـــــ جیسی وہ شالو حرام کی جنی اس سے لڑتی تھی ـــــ مگر وہ چینی بیمار پڑی تو وہ بولی، میں اس کا علاج نئیں کرواؤں گی تو کون کروائیں گا ـــــ یہ تو اس کی روزی کا سوال ہے ـــــ صحت مند رہیں گی تو ہی کوئی اس کے پاس پھٹکے گا ـــــ نئی تو وہ اپنا پیٹ کیسے پالے گی ـــــ ایسا بول کے ہی تو وہ اس کو

لے گئی تھی ——

"آپ کو پتہ ہے وہ اس وقت کہاں —— کون سے ہاسپٹل میں ملے گی؟

بڑھیا نے کچھ اچنبھے سے اشرف کو دیکھا جیسے اس کے صحیح الدماغ ہونے میں شک کر رہی ہو —— پھر ہاتھ جھٹک کر بولی :

" ارے صاحب، چھتی کی بیماری اس کو بھی لگ گئی تھی، اور اسی بیماری میں وہ چٹ پٹ بھی ہو گئی —— میں خود ہسپتال گئی، نہ اپنی چھوکریوں کو جانے دی۔ ایک آدھ کو اور بھی یہ روگ لگ جاتا تو میری روزی کا کیا ہوتا —— ؟؟ کیا ہوتا بولو —— ؟؟"

اشرف اس سوال کا کوئی جواب نہ دے سکا —— !

# چاندنی

عورت تھی یا ایٹم بم ——؟ حواسوں پر —— ذہن پر، ہوش پر سارے وجود پر یوں گری کہ سب تہس نہس ہو گیا —— راکھ ہو گیا۔

سکندر دیوانہ ہو گیا —— اُن معنوں میں دیوانہ نہیں کہ پتھر اُٹھا اُٹھا کر دے مارے، کسی کو جانے پہچانے ہی نہیں، بلکہ ان معنوں میں کہ اپنا آپ بھول گیا —— ایک مٹی ماری عورت کے پیچھے —— عورت بھی کون ——؟ رنڈی ——!

مگر بھئی کیا عورت تھی کہ واہ وا —— بدن کی چمڑی یوں کسی کسی کہ کوئی چہرہ دیکھنا چاہے تو آئینہ سمجھ کر دیکھ لے —— چھاتیاں یوں تنی تنی کہ کوئی کنکری دے مارے تو تن سے بج اُٹھیں —— کمر تو مٹھی میں سما جائے —— بال ایسے گھنگھور گھور کہ سارے بدن سے ننگی ہو کر بیٹھ جائے اور بال کھلے چھوڑ دے تو کسی کو پتہ نہ چلے کہ اس سیاہ پردے کے پیچھے کون سی آگ دہک رہی ہے —— کیسی دمادم بجلیاں کوندتی ہیں —— قد بس بالکل اتنا کہ نخرے میں آ کر مرد کے کندھے سے سر ٹکائے

تو گزن کے غم میں پہنچ کر اونچائی نٹ ہو جائے ـــــ اور مرد کو بس یہی تو اچھا لگتا ہے کہ عورت اُس سے نیچی رہے ـــــ دبتی رہے ـــــ دبی رہے ـــــ اور بس سکندر بھی یہی کچھ تھا جو کہ ایک فرد ہوتا ہے ـــــ جان تو اس کے ایک ہی تھی مگر وہ ایک چھوڑ ہزار جانوں سے عاشق ہوا، مٹ گیا ـــــ کیسے کیسے چاہا کہ اُسے زندگی بھر کے لئے اپنے گلے کا تعویذ بنا لے۔ مگر وہ جو کسی نے کہا ہے کہ زندگی کا بل سدا ہنڈی میں ـــــ ایک کے گلے سے عمر بھر کے لئے لپٹ کر کیا اسے اپنی زندگی تباہ کرنی تھی ـــــ؟ چمکیلی چکنی ناگن کی طرح خود ہی پھسلا کیا لیکن جہاں مُڑ کر ہاتھ میں اُٹھانا چاہا ـــــ سَل سَلا کر چھوٹ گری، دغا دے گئی ـــــ

ساری داستان یہ تھی کہ وہ جوانہ جس کا نام چاندنی تھا۔ کسی شادی کی محفل میں بلوائی گئی تھی۔ شادی کریم بھائی بزنس مین کی بیٹی کی تھی کہ جس کی کپڑے کی چار چار ملیں تھیں ـــــ پھر اناج کی دکانیں ـــــ پھر زیورات کی دکانیں ـــــ پھر دواؤں کی دکانیں ـــــ پھر جنرل اسٹور تھے اور پھر ـــــ بس اس پھر پھر کی روداد ہی یہ تھی کہ پیسہ پھرکی کی طرح پھر پھر پھرتا تھا ـــــ اور جب بیٹی کی شادی ہونی ٹھہری تو کون سی بات چھوڑی ـــــ؟ ہر ہر قسم کے اعلیٰ سے اعلیٰ انتظامات تھے اور اُسی میں ایک انتظام یہ بھی تھا کہ ناچ گانے سے بھی باراتیوں اور حاضرین جلسہ کو محظوظ کیا جائے ـــــ اب ان چاندنی بیگم کے یہ ٹھاٹھ تھے کہ وہ ایسی ویسی محفلوں میں قدم بھی نہ دھرتی تھیں۔ دو سو، پانچ سو کی ان کے پاس کون بساط تھی ـــــ وہ جس بھی محفل میں گئیں، رات بھر کے کٹھن کٹھن پانچ ہزار روپے گنوا لئے ـــــ اور وہ بھی اس صورت اور اس شرط میں کہ کوئی ان کے اُنگلی بھی نہ لگائے ـــــ اُن کا جسم اُنگلی لگانے کے لئے نہ بنا تھا، وہ تو صرف آواز بیچتی تھیں اور بس لچکیلے جسم کی چلت پھرت سے پیسہ بٹورا کرتیں ـــــ

شادی کا ہنگامہ، نکاح خوانی کا دھوم دھڑاکا، کھانے وانے سے فراغت
جب سب مرحلے طے ہو گئے تو محفل سجی ـــــ اگلی قطار بے حد رئیس زادوں کی
تھی ـــــ وہ جو ایک ایک ادا پر خزانے خالی کر دیتے ہیں ـــــ اس کے پیچھے
وہ جن کے پاس سیکنڈ ہینڈ کاریں اور سیکنڈ ہینڈ دل ہوتے ہیں۔ اس کے پیچھے
لٹے ہوئے، بگڑے ہوتے نواب، جن میں اکثریت حیدرآباد کے برباد نوابوں کی تھی،
اس کے بعد ایسے ہی جیب خالی رکھنے والے اور ٹپاپٹ آنکھیں مارنے
والے جیسے ان کے آنکھ مارنے سے رنڈی ان کی گودی میں آ بیٹھے گی ـــــ
پھر تو محلے ٹولے کے لوگ، خانساماں لوگ، بیرے، ڈرائیور، شوفر لوگ،
جو صرف کھڑے کھڑے ترسی ترسی نگاہوں سے نظارہ محبوب کرتے ہیں۔ اگلی
صف میں ظاہر ہے سکندر بھی تھا ـــــ
کیوں کہ وہ خود بھی کپڑے کی چھ ملوں کا مالک تھا ـــــ !!
گانا شروع ہوا ـــــ چاندنی نے پہلے تو حاضرینِ شادی پر ایک چھلتی سی
نظر ڈالی، اور پھر شاید محفل کا رنگ دیکھ کر شروع ہو گئی ؎

ہم بھی پئیں، انہیں بھی پلائیں تمام رات
جاگیں تمام رات جگائیں تمام رات

سننے والوں نے پہلو بدلنے شروع کئے ـــــ چاندنی ڈائس پر تھی اور سکندر
ڈائس سے بمشکل دو تین قدموں کے فاصلے پر ـــــ اس نے پھر ادا سے تان لگائی ؎

دابے رہے پروں میں نشیمن کو رات بھر
ان گیسوؤں کی لی ہیں بلائیں تمام رات

اور کم بخت نے اپنے سیاہ اور لانبے بال کھول کر خود ہی بلائیں لے ڈالیں ـــــ کتنے
کٹے کتنے مرے، کتنے گھائل ہوئے، اس کا لحاظ کئے بغیر وہ چالو تھی ؎

شب بھر رہے بہم ہم آغوشیوں کے لُطف
ہوتی رہیں قبول دُعائیں تمام رات

سُننے والوں نے اس قدر بے چین ہو کر، بے کل ہو ہو کر صوفوں پر کروٹیں بدلیں، جیسے صوفوں میں کن کھجورے گھُس پڑے ہوں۔

سیاہ گھٹاؤں میں سے چاند ایسا چمکتا چہرہ ——— کافر شباب، صحیح معنوں میں کافر کر دینے والا ——— غضب خُدا کا نائلون کا پھنسا ہوا بلاوز کہ یہ پتہ ہی نہ چلے کہ کپڑا کدھر ہے اور بدن کی جِلد کدھر ——— اور اس نے تان اُٹھائی ——— سکندر ہی کو دیکھ کر!

مُدت سے آرزو ہے یہ دل میں بسی ہوئی
اے کاش تم کو ساتھ سُلائیں تمام رات

اک دم محفل میں پٹس پڑ گئی ——— سب نے بوکھلا کر، ایک دوسرے کو دیکھنا شروع کیا ——— سکندر صوفے پر سے کُودا اور اس کے قریب جا کر بولا :

"غضب کرتی ہیں آپ بھی ——— غزل میں اس شعر کا پتہ ہی نہیں، جو چاہے اُلٹ پلٹ گا رہی ہیں آپ ——— !"

وہ ایک عورت کی طرح نشیلی اور دل جیت لینے والی ہنسی ہنس کر بولی :

"میں کب کہتی ہوں غزل میں تھا ——— یہ شعر تو میں نے اپنے دل سے جوڑا ہے"

سکندر صوفے پر واپس آ گرا ——— اب اس میں کچھ پوچھنے، سوچنے، سمجھنے کسی بات کی صلاحیت نہیں رہ گئی تھی۔ ابھی ابھی تک تو چاندنی ایک خوب صورت دیئے کی مانند تھی، جھلملاتی شمع کی مانند کہ جس کی طرف دیکھنے سے آنکھوں کی جوت ماند پڑ نہیں پڑتی، بلکہ خود آنکھوں میں جگمگاہٹ مچل اُٹھتی ہے، لیکن ابھی ابھی وہ ایک شعر "دل سے جوڑ دینے" کے بعد، اسے ادا سے پڑھنے کے بعد، ایک بجلی بن گئی تھی ——— ایسی بجلی جس کی طرف دیکھو تو صرف یہ کہ بینائی سے ہاتھ دھونا پڑے،

بلکہ جو تن من سب کو جلا کر خاکستر کر دے۔

رنڈی پر دل آجانا ایسی کوئی پریشانی کی بات نہیں ـــــ وہ بھی تو دال آٹے بھاجی، پھل کی طرح ایک سودا ہوتی ہے کہ پیسہ پھینکو اور من بھاتی چیز حاصل کر لو ـــــ اور سکندر نے کبھی یہی کیا ـــــ وہ تو لاکھوں میں کھیلتا تھا، اس کے لئے پیسہ بے معنی شے بن چکا تھا ـــــ بمبئی جیسے شہر میں مالا بار ہلز پر کوٹھی ـــــ اور وہ بھی ذاتی کوٹھی ـــــ کیا بات ہے جناب ـــــ ایسی ایسی کئی کوٹھیاں اور زمینیں اور جائداد اس کی قسمت سے بمبئی میں پھیلی ہوئی تھیں۔ نام کا ہی سکندر نہ تھا قسمت کا بھی سکندر تھا ـــــ اسے پتہ لگ چکا تھا کہ چاندنی بھی اسی کے قرب و جوار میں ایک چھوٹی سی خوب صورت سی کوٹھی میں رہتی ہے ـــــ جس کا نام اس نے "چاند نگر" رکھ چھوڑا تھا ـــــ اس لئے یوں کئی بار آتے جاتے اس نام کو دیکھا ہوگا۔ لیکن یہ پتہ نہ تھا کہ چاند نگر میں واقعی کوئی چاندنی بھی چھپی ہوگی ـــــ

ایک دن وہ بڑے ٹھاٹ کے ساتھ وہاں پہنچ ہی گیا ـــــ ڈرائنگ روم میں ایک سڑیل سی بوسیدہ بڈھی نے جب اس کا استقبال کیا تو وہ حد درجہ بور ہوگیا ـــــ یہ کیا مصیبت ہے سالی ـــــ یہ اس قسم کی ماڈرن اور مہذب خواتین اپنے ساتھ نائکہ کیوں چپکا لیتی ہیں ـــــ کم سے کم السیشین ڈاگ سے تو یہ کام نکل ہی سکتا ہے ـــــ اشارہ کیا کہ وہ دوڑا ـــــ اب آپ فرض کیجئے میں آپ کی بیٹی یا پوتی یا نواسی جو کچھ بھی وہ ہیں، انہیں اٹھا کر لے بھاگوں اور کار میں بٹھا کر چھو ـــــ تو جناب آپ میرا کیا سنگھار لیں گی ـــــ؟ وہ ہنسا، اور بے حد مہذب مسکراہٹ ہونٹوں پہ لا کر اور دل کی ساری تلخی اور بوریت دل میں گاڑ کر بولا ـــــ

"میں مس صاحبہ سے ملنا چاہتا ہوں ـــــ"

پھر اس ایک جملے سے جس گفتگو کی ابتدا ہوئی تھی۔ اس کے اختتام پر جاکر اُسے یہ پتہ چلا کہ یہ جو چاندنی بیگم ہیں ـــــ چاندی کی کرنوں کی طرح شیتل، سنہری، پاک اور وہ ہاتھ میں نہیں آنے والی ہیں ـــــ اس لئے کہ وہ رنڈیوں کے اس خاندان سے تعلق رکھتی ہیں جو صرف گلا ـــــ یعنی آواز اور جسم کی چالت پھرت، یعنی رقص کا ہی سودا کیا کرتی ہیں ـــــ" اور تو وہ سب کچھ نہیں چلتا جو آپ سوچ کر آئے ہوں گے ـــــ" اور پھر بھی ایک رات کے پانچ ہزار ـــــ! سکندر نے اپنا سر ٹھونک لیا ـــــ پھر دل نے سمجھایا ـــــ "بچو میاں ـــــ اپنا راستہ پکڑو ـــــ رات بھر کے پانچ ہزار دیے کر بھی آخیر میں کیا ملیں گا بول کے ـــــ؟" لیکن اب سکندر کا عشق اس حد پر پہنچ چکا تھا کہ اور کچھ نہیں تو نہ سہی، خالی نگاہوں کی پیاس بجھتی رہے ـــ چلتے چلتے اس نے بڑے ملائم الفاظ اور میٹھے لہجے میں اتنی بات کہہ دی۔

"آپ کیوں اُن کے ساتھ آنے کی تکلیف گوارہ فرمائیں ـــــ؟ میں خود آکر شام کو انہیں لے جاؤں گا ـــــ"

شاید بڑھیا کو اپنے مال کے "پکے پن" کا یقین تھا، یا سکندر ہی اسے گھامڑ نظر آیا ہو ـــــ بہرحال وہ اس بات پر راضی ہو گئی کہ چاندنی اس کے ساتھ تنہا ہی جائے ـــــ

وہ رات بجائے بارہ گھنٹوں کے بارہ صدیوں کے بعد آئی اور سکندر نے کچھ یوں سوچا کہ ممکن ہے قیامت ایسے ہی آتی ہو !!

سکندر نے اُسے بے حد آرام دہ نرم صوفے میں لاکر بٹھایا اور بے حد قریب بیٹھ کر بالکل بچوں کے سے انداز میں ایک ٹک اُسے گھورنے لگا۔ بچے ایسے ہی گھورتے ہیں مناکہ پلک تک نہ ماریں ـــــ ان بے چاروں کو بھلا محفل کے طور اطوار،

آداب لحاظ کیا معلوم ——— وہ تو بس جس چیز پر نگاہ جم جائے، دیکھے ہی جاتے ہیں ——— اور سکندر بھی اس وقت اپنے جذبات کے ہاتھوں بچہ سا بن کر رہ گیا تھا، بڑی بے باکی، بڑی ملائمیت بڑے بھول پن سے اُسے نگاہ بھر بھر کے دیکھے گیا ———

چاندنی کھل کھلا کھلکھلا کر کے بڑی شفاف ہنسی ہنس پڑی۔

"یوں کیا گھور رہے ہیں آپ ——— ؟"

"تم بڑی خوب صورت ہو ———" وہ بے حد بچپانی سے بولا۔

"آپ کا تعریف کرنے کا انداز بھی خوب ہے ———" اور جیسے کانچ کی چھوٹی چھوٹی بہت سی کٹوریاں، بہت سی کٹوریوں سے ٹکرا گئیں۔

"مجھ سے شادی کرلو نا ———" سکندر بالکل اس انداز سے بولا جیسے کوئی بچہ اپنے دوست سے بڑی معصوم سی بے تکلفی سے کہے ——— "اپنی یہ پتنگ مجھے دے دونا ——— !"

چاندنی نے ذرا حیرت سے اس کی طرف دیکھا ——— ذرا سا ہنسی ——— پھر بولی ———

"شادی کریں تو بچے ضرور پیدا ہوتے ہیں ———"

سکندر حیرت سے بولا: "پھر ——— ؟ یہ تو بے حد سُہانی بات ہے ———"

وہ ہنس دیا ———

"اجی جناب ———" چاندنی نے بہت دور جا کر بات کا سلسلہ جوڑا ———

"میں نے ایسی کئی کئی خواتین دیکھی ہیں جن کا "حسن" ایک دو بچوں کے بعد ناف تک لٹکنے لگتا ہے۔ ظاہر ہے، میرا پیشہ ایسا ہے کہ جب تک جسم ساتھ دیتا ہے پیسہ آتا رہتا ہے۔ بعد میں تو بس ——— جی ہاں ——— معاملہ ختم ———" وہ یک لخت بے حد اُداس ہوگئی ———

سکندر مارے جوش کے دوسرے صوفے پر جا بیٹھا ——— "یہ تم کیا کہتی ہو

جسم پیسے کا دروازہ ہے ——— ایک رات کے پانچ ہزار تو ملتے ہی ہونا ——؟ اب تم ذرا حساب جوڑ کے مجھے بتاؤ کہ اندازاً تمہاری عمر کتنی ہے اور ابھی آگے کے دن زندہ رہنے کا سوچ سکتی ہو ——— چلو زندگی بھر پانچ ہزار روپے روزانہ کے حساب سے دے دیتے تمہیں سنہری سکے ———"

چاندنی بے حد بھرپور ہنسی ہنسی ——— "جناب چار دن بعد جب عشق کا خمار اترے گا اور حضور ٹھنڈے پڑ جائیں گے تو پانچ ہزار تو کدھر ——— پانچ نئے پیسے بھی پھینک کر نہ ماریں گے ———"

سکندر جھلا کر بولا ——— "یہ غلط ہے "

"ہونہہ غلط ———؟" وہ پھر ہنسی ——— "جب تک یہ کھال آئینے کی طرح چمکتی ہے اور جب تک یہ جسم تنا ہوا رہتا ہے، تب ہی تک مرد کی محبت بھی قائم رہتی ہے، ورنہ تو بس . . ." وہ پہلی بار بگڑ بیٹھی ——— "آپ یہ سب سنانے کے لئے ہی مجھے یہاں لائے ہیں یا کچھ سُننے گا بھی ———؟"

سکندر چاپلوسی سے بولا ——— "آج تو وہ سب کچھ کرنے کو جی چاہتا ہے جو تم نے اپنے دل سے شعر میں جوڑا تھا ——— یاد ہے نا ———؟" اور سکندر نے ہاتھ بڑھایا کہ اُسے اپنے قریب تر کرلے ———

چیں ——— ایں ——— اُوں ——— باہر آوٹ ہاؤس سے کسی مریل سے بچے کے رونے کی آواز آئی اور سکندر جھلا گیا ——— اک دم وہ اُٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا، باہر دو ایک منٹ جھانکتا رہا، پھر گرجتا ہوا واپس آکر صوفے میں دھم سے گر پڑا ——— "کم بخت نے چین حرام کر دیا ہے ——— جب دیکھو تب چیں ——— چیں ——— پلّے کو اُٹھا کر پھینکوا نہیں دیتیں اماں بی ———"

چاندنی نے از خود پہلی بار بات کی ———

"آپ حیدرآباد کے نواب ہیں ــــــ ؟"

سکندر نے اس کی طرف ذرا حیرت سے ہنس کر دیکھا، پھر بولا "کیوں ــــــ ؟ تمہیں کیوں کر احساس ہوا ــــ ؟" پھر خود ہی بولا ــــ "نواب تو کیا ہوں، ہاں بھگوڑا ضرور ہوں ــــ"

"بھگوڑا ــــ ؟" چاندنی حیرت سے ہونٹ دبانے لگی ــــ

"ہاں! ایکشن کے وقت کچھ عقل ساتھ دے گئی ــــ تھوڑا بہت اثاثہ حضور ابا مرحوم کا پاس تھا، لے کر بمبئی بھاگ کھڑا ہوا ــــ اماں جی کو بھی ساتھ لے آیا ــــ اوپر والے نے قسمت میں آرام لکھ دیا تھا ــــ کاروبار میں وہ ترقی ہوئی کہ بس نوابی پیچھے پڑ گئی اور ایسی ایسی کوٹھیاں خدا نے دے دیں کہ حیدرآباد میں رہ کر خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ کبھی ملیں گی ــــ" وہ رُکا ــــ "لیکن تمہیں یہ سوال کیسے سُوجھا ــــ ؟ کیا بات چیت سے میں حیدرآبادی لگتا ہوں ــــ ؟ میری اماں بی تو 'یو۔پی' کی ہیں ــــ !"

وہ ہنس دی ــــ "نہیں یہ بات نہیں ـ دراصل آپ کا خاندانی دبدبہ اور گرجنے برسنے کی ادا ــــ" وہ پھر کھل کھل کر کے ہنسی ــــ "غریبوں کے بچّوں کو محض رونے کی سزا یہ کہ اُٹھا کر پھنکوا دیئے جائیں، صرف نواب ہی دے سکتے ہیں ــــ"

اُس نے قدرے رُک کر، بڑی ادا سے سَر اُٹھا کر پُوچھا ــــ "کیوں غلط کہا میں نے ــــ ؟"

سکندر بے حد جھلّا اُٹھا ــــ

"قسم خُدا کی ــــ حد ہو گئی ــــ جس رات کو سہاگ رات کی طرح حسین اور خوشگوار گزرنا تھا، وہاں کس درجہ بدذوقی ہو رہی ہے ــــ کوئی تُک ہے بھلا ــــ ؟؟"

چاندنی تنک کر بولی ——

"واہ —— یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ آج کی رات سہاگ رات تھی —— ؟ آپ کس وعدے پر مجھے یہاں لاتے ہیں —— ؟ گیت سننے اور رقص دیکھنے کے وعدے پر نا —— ؟ آپ تو تیسری ہی بات سوچ رہے ہیں —— ؟"

"اور جو میں زبردست بن جاؤں"

چاندنی اسی اطمینان سے بولی —— "میں ایسا سمجھتی ہوں کہ شاید دو مرد مل کر تو ایک عورت کو زیر کر سکتے ہیں، لیکن ایک مرد —— ہونہہ —— !" اس نے کچھ حقارت سے اور نفرت سے سکندر کو دیکھا ——

سکندر ہنسا —— "نام کا ہی سکندر نہیں ہوں، قسمت کا بھی ہوں۔ وہ جس نے سارا ہندوستان فتح کیا تھا ——"

"ضروری نہیں کہ عورت کے دل کو بھی فتح کر سکے ——" چاندنی نے جملہ پورا کر دیا۔

اوں —— اوں —— ایں —— پھر اسی آواز نے بات کا سلسلہ ختم کر دیا —— تھوڑی دیر خاموشی رہی، پھر سکندر گویا ہوا۔

"اماں بی کو بڑا شوق ہے بچے پالنے کا —— کتے کے بچے، بلی کے بچے، خرگوش کے بچے —— اس کے بچے، اس کے بچے ——"

اس کے اندازِ بیان پر چاندنی کو ہنسی آنے لگی —— وہ ساتھ ہی ساتھ گنگنانے بھی لگی تھی —— سکندر ذرا جوش سے اٹھ بیٹھا —— "ظاہر ہے انسان کے بچے —— یعنی میرے بچوں کی بھی انہیں تمنا ہو گی ہی —— لیکن جسے انہوں نے پسند کیا، اسے میں نے ناپسند کر دیا، اور جسے میں نے پسند کیا... —— اس نے مجھے ناپسند کر دیا ——" اس نے بڑے معنی خیز انداز سے چاندنی کو ہنس کر دیکھا، اور

ہنس کر ذرا بے باکی سے اپنا ہاتھ بڑھایا ــــ چاندنی خطرہ بھانپ کر کچھ پیچھے ہٹی اور دونوں ہاتھ اپنے سینے پر باندھ لئے ــــ

سکندر خالص بدمعاشی کے موڈ میں تھا ــــ لپک کر بولا ۔ "چاند داغ جی کی چیز ہو جائے ۔ ع

وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے'

چاندنی کسمسا کر بولی ــــ "یہ باتیں کوئی اچھی باتیں ہیں ــــ؟ اب میں آپ سے صفا صفا کہتی ہوں کہ میرے مذہب میں جسم کو کسی کا ہاتھ لگنے دینا حرام ہے ــــ"

"ہٹاؤ بھائی جسم وِسم کے جھگڑے کو ــــ مجھے احتراماً صرف جنت کے کنگوروں کو چھونے کی اجازت دے دو ــــ"

چاندنی ڈھیٹ بن کر بولی ــــ "کنگورے ، بُرجیاں ، گنبد ، سنگِ مرمر کی چٹانیں ، یہ سب چیزیں ناقابلِ حصول ہیں حضور ــــ بس کیجئے نظارہ دُور دُور سے"! وہ گنگنانے لگی ــــ گنگناتے گنگناتے وہ سنجیدہ ہو کر بولی ۔

" دیکھئے سکندر صاحب ــــ میں جس انداز سے سوچتی ہوں ، آپ نہ سوچ پائیں گے ــــ اپنی ماں کا حشر میرے سامنے ہے ــــ اپنی خالہ کا حالِ تباہ میں نے دیکھا ہے ــــ میری کئی جان پہچان والیاں ہیں جنہوں نے جسم کی تجارت کی ، نتیجے میں انہیں کیا ملا ــــ ؟ مرد کی ذات بے حد کمین ہوتی ہے ــــ وہ صرف دو لمحے کی لذّت کے بارے میں سوچتا ہے ۔ اس کے لئے اتنے جتن کرتا ہے ہزاروں لاکھوں تک لٹانے سے نہیں چوکتا ــــ عورت کو چوس چوس کر پھوک بنا دیتا ہے ــــ دنیا میں سارا جھگڑا پیٹ اور پیسے کا ہے ــــ آپ آج میرے جسم کی خوب صورتی سے مسحور ہو کر مجھ سے شادی تک کرنا چاہتے ہیں ، لیکن چار چھ

راتوں میں ہی جب میرا کس بل نکل جائے گا، میں قدموں تلے کی دھول بنادی جاؤں گی ——— میں ممکنہ حد تک جوان رہنا چاہتی ہوں کہ زندگی کا کچھ تو مزہ لے سکوں ——— جسم کا سودا کروں گی تو ربر کے نکلے ہوئے غبار کی طرح میرا حشر ہو کر رہ جائے گا ——— ورنہ دل تو کیا کیا نہیں چاہتا ——— اور کیوں نہ چاہے ——— کیا عورت نہیں ہوں میں؟"

وہ تناکے کے ساتھ اُٹھی ——— "جئے کیوں آپ میرا وقت برباد کر رہے ہیں اور ساتھ ہی میرا دماغ بھی خراب کر رہے ہیں ——— مجھے نہ چاہئیں آپ کے پانچ ہزار دس ہزار ——— مجھے جانے دیجئے ——— پانچ ہزار کی میرے پاس کیا اوقات ہے ——— اُسی رات جب آپ سے پہلی بار بھینٹ ہوئی ہے، میں نے بجائے پانچ کے ساڑھے سترہ ہزار بنالئے تھے ؟ آپ اِترلتے کس بات پر ہیں ——— ؟"

"واہ بھئی واہ ——— تم عورت ہو کہ پٹاخہ ——— پٹ پٹ بولے ہی چلی جاتی ہو ——— تمہیں تقریر کرنے تو نہیں بُلایا تھا ———"

"تو گانا سُنئے ——— رقص دیکھئے ——— لیکن جو میری راہ نہیں اس پر نہ چلوایئے"

سکندر ذرا کمینے پن سے ہنسا ——— "یہ ساری باتیں یہاں تک تو ٹھیک ہیں ——— لیکن اگر میں یہ کہوں کہ تم اتنی رات گئے اتنی تنہائی میں ایک مرد کے ساتھ اکیلی ہو۔ تو؟"

اس نے ادا کے ساتھ مصرع پڑھا ؏

"عُمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں"

"یہ آپ اچھی طرح سوچ رکھیں کہ میں ایک ہی نظر میں بھانپ لیتی ہوں کہ کون مرد کس قماش کا ہے ؟ اور جب مجھے خطرہ نظر آئے تو میں تنہا قدم نہیں اُٹھاتی ——— آپ کا رویّہ کیسا بھی سہی، میں رنڈی سہی، تنہا سہی، لیکن اتنا پھر بھی یقین ہے کہ آپ دست درازی نہیں کریں گے ——— مجھے خون کی پہچان ہے ———" وہ صوفے پر نیم دراز ہو گئی ———

"نیند ہے کہ کم بخت آئے جا رہی ہے اور آپ ہیں کہ بس ــــ" اُس نے ہنس کر انگڑائی لی ــــ

سکندر نے ننّے ننّے رُوٹھے ہوئے دُولھے کی طرح مونھ پھیر لیا ــــ چاندنی نے بغیر ساز کے، ایک گھریلو سی لوری گنگنانی شروع کردی۔

سکندر کے اندر کا سرکش مرد میٹھی میٹھی مدھر تان سُنتا سُنتا سونے پر آگیا ــــ

چیں ــــ ہاں ــــ ہاں ــــ اوں ــــ آں ــــ

باہر سے پھر اُسی مریل سی آواز نے مداخلت کی اور سکندر سوتا سوتا پھر اُٹھ گیا۔ اور اب کی بار ایسا جھنایا کہ دروازہ کھول کھٹاک سے باہر ــــ واپس پلٹا تو اس کے ہاتھوں میں چیں چیں کرتا ایک چھوٹا سا بچہ تھا، وہ تیزی سے اُسے لئے اندر گھس ہی رہا تھا کہ چاندنی تیزی سے بھاگ کر اس کی راہ میں آگئی ــــ

"غصّے میں مار ہی ڈالیں گے کیا آپ ــــ؟"

"نہیں امّاں بی کے حوالے کر رہا ہُوں، یا تو اسے سنبھالئے یا اپنے ہاتھوں مار ڈالئے ــــ قسم خدا کی کوٹھیوں میں یہ آوٹ ہاؤس والا سسٹم ہونا ہی نہیں چاہیئے ــــ اور پھر ان کم بختوں کو اتنی تمیز بھی تو نہیں کہ دُور لے جا کر بہلائیں ــــ یہیں میری ناک کے پاس ہی لے کر ٹہلیں گے . . . . ."

ڈر سے کانپتا، مگر محبت سے مجبور مالی اُسی دم کمرے کے دروازے پر نمودار ہوا اور روتا ہوا بولا "شما کریں سرکار ــــ گھر والی کو مرے دِن ہی کتے ہوئے ہیں، بچہ ہی کی تو بات ہے۔ نہ اُوپر کا دُودھ مونہہ میں پکڑے نہ بہلائے بہلے ــــ ہم تو مجبور ہو گئے۔ بے چاری دھوبن بہلائے تو ذرا دیر سو جائے۔ تنک سو کر وہی ٹھاں ٹھاں ہے ــــ ہم تو ہار گئے۔"

"ہار گئے ہو تو اسے زہر پلا کر ختم کر دو ــــ یا پھر لے جاؤ بڑی بیگم کے پاس۔

وہی کچھ بندوبست کریں گی ——" اُس نے گیند کی طرح بچے کو اُچھالا ——"لے جاؤ یہاں سے —— !" اِک دَم چاندنی نے بچہ کو ہاتھوں پر جھیل لیا —— ڈرے ہوئے چوہے جیسے بچے نے اور زور سے چیخیں مارنی شروع کر دیں —— جس کمرے کو رقص و سرود سے، پائل کی چھم چھم اور مدھر تانوں سے گونجنا تھا، وہاں بے وقت کی بھیرویں ہو رہی تھی ——

جب اس کی روں روں کسی طرح نہ رکی تو چاندنی نے اُسے سفید بازوؤں میں بے حد ماہرانہ انداز سے جھکولے دئے اور صوفے کے ایک کونے پر ٹِک کر اپنے بلاؤز کے بٹن کھول کر بے حد محبت اور پیار کے ساتھ اپنی گوری گوری اور تنی ہوئی چھاتی اس کے مُونہہ سے لگا دی —— سکندر نے حد درجہ حیرت کے ساتھ دیکھا ——
"اررر ... تم —— ؟ تم تو —— غالباً کنواری ہو، تمہارے دُودھ اُتر آئے گا؟ اور پھر تمہارا حُسن ——! ناف تک لٹک نہ جائے گا ——؟؟ اور تمہارے ....."
چاندنی نے بات کاٹ دی —— "تم کیسے مسلمان ہو —— تمہیں بی بی مریم کی داستان بھی نہیں معلوم ——؟؟ خُدا بغیر شوہر کے بچہ دے سکتا ہے تو بغیر بچے کے دُودھ کیوں نہیں دے سکتا ——؟؟"

سکندر نے حیرت سے دیکھا، دیکھتا ہی رہا۔ اس وقت چاندنی کے چہرے پر دُنیا بھر کی ماؤں کا نُور ایک ساتھ جھلک رہا تھا۔

# اوہ امریکہ!

## (۱)

**نیویارک** سے تمہیں پلین بدلنا ہے —— گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں —
کسٹم پر چیکنگ بھی ضروری ہوگی، لیکن تم یہ سوچ کر مطمئن رہنا کہ ظاہر ہے کوئی ناجائز
چیز جیسے افیون، حشیش، چرس، گانجہ وغیرہ تھوڑے ہی تمہارے ساتھ ہے —— خُدا کا
شکر ہے کہ تمہیں انگلش آتی ہے، ورنہ اصل پریشانی مجھے اس وقت ہوتی جب کسٹم
والے تم سے طرح طرح کے سوال کرتے اور تم ان کا موہنہ تکتے جاتیں۔ ویسے بھی
ہمارے ہاں کی عورتیں جلد ہی نروس ہو جاتی ہیں —— اب تم یہاں آ ہی رہی ہو تو
دیکھنا کہ یہاں کی عورتیں، لڑکیاں کیسی بولڈ، کیسی اسمارٹ ہوتی ہیں —— (امریکہ
کی کیا بات ہے! تم یہ سب کیا جانو؟)

شاید نیویارک میں تمہیں بھائی جان مِل جائیں، لیکن اگر تم نے ٹرانزٹ
ویزا نہ لیا ہو (ہمارے ہاں کی عورتیں بے حد بیک ورڈ اور احمق ہوتی ہیں، ہر بات
سکھانا پڑتی ہے۔ کاش تم نے یہ کارروائیاں پوری کر لی ہوں!) تو پھر ملاقات

مشکل ہے۔ ویسے تمہارے آنے کے بعد سب کا ایک ساتھ مل کر امریکہ جانے کا پروگرام ہے —— تمہیں یہ دُنیا ضرور دیکھنی ہے۔ اور دیکھنے کے بعد کچھ لکھنا بھی ہے —— تم کہانیاں لکھتی رہی ہو، اب ذرا حقیقتوں پر بھی کچھ لکھو —— تمہارے آنے کے تصوّر سے مجھے سخت وحشت یوں ہے کہ تم اپنے تین تین بچے بھی ساتھ لا رہی ہو (اور پھر سُنا ہے کہ تم موٹی بھی خوب ہو گئی ہو!) اگر تم یہاں کی لڑکیوں کو دیکھو تو غش کھا جاؤ —— اتنے بڑے بڑے بچوں کی مائیں ہو جاتی ہیں، اور پتہ بھی نہیں چلتا۔ عمر بھر دیکھنے میں سلم لڑکیاں ہی نظر آتی ہیں —— ہمارے ہاں کی عورتوں کی طرح نہیں کہ ——

(اوہ امریکہ) . . . . . .

یہ کوئی چھٹا خط تھا جس میں بھیا نے ہر وہ بات دُہرائی تھی جو اس سے پہلے والے خط میں لکھ چکے تھے۔

کنیڈا آنے کے لئے پہلے نیویارک اُترنا ہوتا ہے —— کسٹم والے یوں کرتے ہیں، ووں کرتے ہیں۔ نیویارک کی بجائے کہیں اور نہ اُتر جانا —— غنیمت یہ تھا کہ انہوں نے یہ ہدایت نہیں دی تھی کہ ہوائی جہاز میں بچوں کے پینے پلانے کے لئے پانی، دُودھ بھی رکھ لینا، اور انہیں کھڑکیوں میں سے جھانکنے نہ دینا ورنہ گر پڑیں گے —— اب ان کے خطوں سے میں اس قدر تنگ آ چکی تھی کہ جی چاہتا تھا کہ اپنا سمندر پار کا دورہ ہی ملتوی کر دوں، لیکن سوچتی تھی کہ غصّے میں آکر اگر ایسا کر دیا تو سارے میں چاؤں چاؤں ہو جائے گی کہ یہ بی بی کچھ جانے آنے والی نہیں تھیں، بس پبلیٹی ہی پبلیٹی تھی۔ اسی لئے صبر سے سارے خط زہر مار کرتی گئی۔

**بڑا** ہنگامہ خیز دن تھا، جس دن ایئر انڈیا کے جمبو جیٹ "سمراٹ راجندر چاولہ" میں قدم رکھا۔ چھ سال، پانچ سال اور ساڑھے تین سال کے تین چھوٹے چھوٹے بچوں کو

لے کر اور پیچھے شوہر اور دو بچوں کو چھوڑ کر اتنی دور جانا کم سے کم میرے لئے معمولی بات نہ تھی —— روتے دھوتے جب اپنی سیٹ پر بیٹھی تو پتہ چلا کہ اتنی دیر میں اچھا خاصہ تماشا بن چکی ہوں۔ تماشا ان معنوں میں کہ جہاز میں اکثر نگاہوں کی توجہ کا مرکز میں ہی بنی ہوئی تھی ——

میرے برابر کی سیٹوں پر ایک جوڑا بیٹھا تھا —— بے حد پیاری پیاری صورت کی، گوری گوری، نازک سی ایک لڑکی —— جس کے خدوخال تو مغربی تھے لیکن لباس اس نے پہن رکھا تھا کرتا اور پھول دار لنگی —— کانوں میں بالیاں، ناک میں نقلی نگینے کی لونگ —— گلے میں رنگ برنگی مالائیں، جیسے ہمارے ہاں سادھو بابا پہن لیا کرتے ہیں ——

اچھی صورتیں کتنی جلد توجہ کھینچ لیا کرتی ہیں —— روتے روتے بھی میں اُسے چوری چھپے دیکھے گئی ——

اس نے میری بچی کا ہاتھ پکڑ اُسے پیار سے اپنی طرف کھینچا اور کچھ اجنبی سے لہجے میں انگریزی میں بولی —— "تمہاری ممی روتی کیوں ہے ؟"

فرسٹ اسٹینڈرڈ میں پڑھنے والی بچی نے ٹوٹی پھوٹی انگلش میں جواب دیا بڑا سچا جواب ——

"وہ پاپا کے لئے روتی ہیں ——"

وہ سمجھ گئی اور ایک دم ہنس پڑی —— اور پھر اک دم براہِ راست مجھ سے مخاطب ہو گئی ——

"یہ تو بڑی عجیب سی بات ہے —— تھوڑے دنوں کے لئے بھی آپ دوری برداشت نہیں کر سکتیں —— ؟"

"تھوڑے دن —— ؟" میں روتے روتے بولی : "میں جا تو ریٹرن ٹکٹ پر

رہی ہوں لیکن وہاں مُستقل سیٹل ہونے کے ارادے سے۔ اگر امریکہ یا کینیڈا دونوں میں سے کوئی بھی مُلک پسند نہ آیا تو پھر واپس آنے کے بارے میں سوچوں گی۔ اور اگر وہیں رہ گئی تو بہت سارے مہینوں تک الگ رہنا پڑے گا ـــــ امیگریشن کی کارروائیاں اتنی جلدی تھوڑا ہی طے ہو جاتی ہیں ـــــ"

اتنی سی بات میں نے بہت روتے سِسکتے کہی تھی ـــــ وہ میرا دل بڑھانے کو بولی ـــــ "میں تو رونے کی قائل نہیں ہوں ـــــ ہر مصیبت کا ہنس کر سامنا کرنا چاہیئے بس ہنسو اور جیو ـــــ جیو اور ہنسو ـــــ"

میں بدھوؤں کی طرح اس کا مُونہہ دیکھنے لگی ـــــ ("اگر تم امریکہ کی لڑکیوں کو دیکھو تو پتہ چلے کہ زندگی کو کیسے ایزی لیتی ہیں ـــــ اوہ امریکہ!") جہاز دبئی کے لئے پَر تول رہا تھا۔ سب مسافر اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ چکے تھے۔ بیلٹ کسے جا چکے تھے اور اب جوس کے گلاس ٹرے میں لئے لئے خوب صورت تتلیاں پورے جہاز میں گھوم رہی تھیں۔

اتنی دیر میں میری ساتھی لڑکی اپنے شوہر سے باتوں میں مشغول ہو چکی تھی ـــــ اب ذرا اطمینان نصیب ہوا تو میں نے سارے جہاز کا جائزہ لینا شروع کیا۔ لیکن اتنے میں چھوٹے صاحب زادے نے جوس چھلکا دیا ـــــ اور وہ بھی نیچے گِر کر نہیں ساتھ والی لڑکی کی لنگی پر ـــــ میں نے مونہہ سے کچھ نہ کہا، بس معذرت بھری نظروں سے اُسے دیکھ کر رہ گئی، وہ مجھے دیکھ کر ہنسنے لگی ـــــ

"اتنے بچے آپ کیسے ٹیکل کر لیتی ہیں ـــــ؟"

"اتنے ـــــ!" میں ہنس کر بولی۔ "یہ تو چھوٹے ہیں نا اس لئے ساتھ لے جا رہی ہوں۔ دو تو ابھی گھر پر ہیں ـــــ ۸ سال اور ۹ سال کے ـــــ"

اس نے بار بار آنکھیں کھولیں اور بند کیں ـــــ سخت حیرت کا عالم تھا۔

"ہم امریکی اگر اتنے بچوں کے بارے میں سوچ بھی لیں تو ہارٹ اٹیک ہو جائے (اُف تو یہ امریکی ہے، مجھے بھیا کے سارے خط یاد آنے لگے۔) آپ کو گھبراہٹ نہیں ہوتی ؟"

"گھبراہٹ ــــ! میں نے دراصل آج تک سوچا ہی نہیں کہ زیادہ بچوں سے گھبراہٹ بھی ہو سکتی ہے ــــ بس عادت ہو گئی ہے ــــ"

وہ زور سے ہنس پڑی۔ پھر ذرا سنجیدہ ہو کر بولی۔ "لیکن آپ بُرا نہ مانیں تو کہوں کہ آپ کے ملک کے حالات دیکھتے ہوئے اتنے بچے ہونا کیا زیادتی نہیں ہے ؟"

میں نے اسے غور سے دیکھا ــــ "آپ کا مطلب ہے مجھے فیملی پلاننگ کرنا چاہیئے ــــ ؟"

"آف کورس، مجھے دیکھئے ــــ ابھی تک تو ایک بچہ نہیں۔ پھر بھی برتھ کنٹرول کرتی ہوں، اور ویسے بُرا نہ مانیں تو امریکہ کے حالات ایسے سنگین ہیں بھی نہیں جیسے آپ کے انڈیا کے ــــ خیر ــــ"

"وہ تو ٹھیک ہے ــــ لیکن فیملی پلاننگ کے متعلق میرا اپنا نظریہ ہے۔ ممکن ہے اس سے دوسرے متفق نہ بھی ہوں۔"

"اُس نے بڑے تجسس سے مجھے دیکھنا شروع کیا، جیسے پتہ نہیں، اب میں کون سی انہونی بات کہنے جا رہی ہوں؟ تبایئے تو ذرا ــــ"

"میرا نظریہ یہ ہے کہ دانش وروں اور امیروں کو بچے بند نہیں کرنے چاہئیں ــــ ویسے عام لوگوں کو ضرور بچے کم پیدا کرنے چاہئیں ــــ"

"وہ کیوں ــــ ؟" وہ حیرت سے بولی۔

"اس لئے کہ امیروں کو تو بچے پالنے میں روپے پیسے کی کوئی پریشانی ہی نہیں، اور ذہین افراد کو اس لئے بچوں سے نہیں ڈرنا چاہیئے کہ اس طرح ایک ــــ

ذہین اور باشعور قوم وجود میں آتی ہے۔ اور ہر ملک کو دُنیا بھر میں دولت اور ذہانت کی ضرورت ہے اور رہے گی ——"

اُس نے کسی قدر مُسکرا کر پوچھا: "آپ خود کو کس خانے میں رکھتی ہیں؟"

"تقریباً دونوں میں ——" میں پہلی بار ہنسی۔ "میں خُدا کے فضل سے خود کو اس لائق سمجھتی ہوں کہ مُلک کو ایک اچھی ذہین اور باشعور نسل دینے والوں میں سے ایک گِن سکوں ——"

وہ کچھ دیر غیر یقینی انداز سے مجھے دیکھتی رہی، پھر بولی "میں انڈیا میں بے حد گھومی پھری ہوں —— دو برس میں میں نے یہاں کی کوئی جگہ شاید ہی چھوڑی ہو —— اتنے عرصے میں میرے رہن سہن اور پہناوے تک پر انڈیا اثر انداز ہو چکا ہے —— تو میرا خیال یہ ہے کہ یہاں کی عورتیں سخت جاہل اور بیک ورڈ ہیں۔ انہیں نئے زمانے کی نئی روشنی کو سمجھنے کے لئے ایک یُگ چاہیئے۔ اب دیکھئے میری عمر چھبیس سال ہے —— میرے خیال سے کوئی بات، نئی دُنیا، زندگی، سیکس، تعلیم، سائنس سے متعلق ایسی نہیں جو مجھے معلوم نہ ہو اور یہاں کی تو بُوڑھی بُوڑھی عورتیں یہ تک نہیں جانتیں کہ چند گولیاں ایسی بھی ہیں جن سے بچے کو پیدا ہونے سے روکا جا سکتا ہے۔ کم سے کم عورت اتنی تو باشعور ہو کہ . . . . ."

دہلی آگیا تھا۔ کچھ مسافر جہاز سے اُتر رہے تھے۔ کچھ چڑھنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اتنا بڑا پلین لوگوں سے بھر گیا —— وقت بھی زیادہ ہو رہا تھا۔ رات کے گیارہ بجنے والے تھے —— بچے نیند سے بوجھل ہو رہے تھے۔ ان کے لئے اب پلین میں پہلی بار بیٹھنے کا سرور بھی ختم ہو رہا تھا —— سردی بھی بڑھنے لگی تھی —— میری ساتھی لڑکی نے کھڑے ہو کر سروں کے اوپر بنے ہوئے کیبنوں میں سے کمبل

نکالا ، میں نے اس کی طرف دیکھا ـــــ لمبے سُنہرے بال جو اس کی آدھی پیٹھ تک آرہے تھے ، آگے پیچھے جھُول رہے تھے ـــــ میں نے پسندیدہ نگاہوں سے اسے دیکھا لیکن میں ذرا ٹھٹھک سی گئی ـــــ باریک نیلے کُرتے کے نیچے اس نے کچھ بھی نہیں پہن رکھا تھا ـــــ (نئی نسل پھر اپنے ماضی کی طرف لوٹ رہی ہے ، خاص طور سے امریکی نسل ـــــ اس ماضی کی طرف جب انسان دُنیا میں پہلے پہل آیا ـــــ جنگلی تہذیب ـــــ کپڑوں سے بے نیاز ـــــ بڑھے ہوئے بال ـــــ ساری حیوانی عادتیں اور صفتیں ـــــ !)

بچوں کو جیسے تیسے سُلا کر میں اُداسیوں کے سمندر میں غوطے کھانے لگی ـــــ نئے مُلک ، نئے لوگوں ، نئے ماحول سے میں مطابقت بھی پیدا کر سکوں گی یا نہیں ؟ اور وہ بھی ساری ذمہ داریوں کے ساتھ ؟ اے خُدا ـــــ ایک دم مجھے سر میں شدید درد کا احساس ہوا ـــ میں نے ایر ہوسٹس سے کافی منگوائی اور پرس سے ایک اسپرو نکالی ـــــ اسی لمحہ میری ساتھی جو اپنے میاں سے ہنس ہنس کر دھیرے دھیرے سرگوشیوں میں بات کر رہی تھی ، چونکی اور اپنا پرس ٹٹولنے لگی ـــــ

"کیا ہوا ؟" اس کے شوہر نے پوچھا ـ

" مائی پل ! مائی پل ! ارے میری گولی ـ کہیں بچہ نہ ہو جائے ـ" پھر اُس نے ہوسٹس سے ایک گلاس دودھ مانگا اور اس میں وہ گولی گھول کر پی گئی ـ

سب مسافروں نے اپنی اپنی لائٹس آف کر دیں ـ میں اپنے ساتھ لائی ہوئی شال اپنے پیروں پر ڈال کر بیٹھ گئی ـ میری ساتھی نے جو کمبل نکالا تھا اُسے ایک ساتھ اپنے اور اپنے شوہر کے پیروں پر ڈال لیا ـ

نیند تو جیسے میری آنکھوں سے اُڑ چکی تھی ـ دونوں میاں بیوی کی گھُس گھُس

سے آتی ہوئی نیند اُچٹی جا رہی تھی۔ دونوں کی باتیں اور دبی دبی ہنسی کی آوازیں میرے علاوہ شاید دوسروں کو بھی پریشان کر رہی تھیں۔ مگر وہ دونوں اپنے آپ میں گم تھے —— چھوٹے بچے کا ڈائپر بدلنے کے لئے میں نے لائٹ کھولی تو میری نگاہ یوں ہی اوپر اُٹھ گئی، اور میں اپنے آپ ہی شرمندہ سی ہو گئی —— مرد کے ہاتھ پتلے پتلے کُرتے کے اندر مچلتے ہوئے پرندوں کو پکڑ لینے کی کوشش میں مصروف تھے —— میں نے گھبرا کر لائٹ آف کر دی۔

پتہ نہیں شاید میری آنکھ لگ گئی تھی —— کھُلی تو جہاز لینڈ کر رہا تھا —— غالباً بیروت تھا۔ مسافروں میں ہلچل مچنا شروع ہو گئی تھی۔ خواتین اپنے اُڑے ہوئے میک اَپ درُست کرنے لگی تھیں۔

میری ساتھی ٹوائلٹ سے پرفیوم کا آبشار انڈیل کر نکلتی ہوئی آئی۔ سیٹ پر گر کر اس نے پرس سے آئینہ اور لپ اسٹک نکالی اور بڑی خوش دلی سے بولی "پتہ نہیں ہم عورتوں پر کیوں یہ الزام ہے کہ میک اَپ پر بہت پیسہ خرچ کرتی ہیں۔ ویسے دیکھا جائے تو میرے خیال سے آدھی لپ اسٹک تو مرد کھا جاتے ہیں۔" اس نے اپنے گل رنگ ہونٹوں سے مسکراتے ہوئے اور خوب صورت آنکھوں سے ہنستے ہوئے میری طرف دیکھا —— "میں غلط تو نہیں کہتی نا؟" پھر وہ اپنے شوہر کے شانے پر جھول گئی ——

میں نے بچے کے لئے دودھ منگوایا۔ اسے گود میں لٹایا، مگر وہ روئے ہی جاتا تھا ——

"زیادہ بچے ملک کے لئے تو مصیبت ہوتے ہی ہیں، خود اپنے آپ کو بھی تکلیف دیتے ہیں اور ماں باپ کو بھی —— میں اسی لئے بچوں سے دور

بھاگتی ہوں ——"

"بچے جب تک ہو نہیں جاتے اسی طرح آفت معلوم ہوتے ہیں، لیکن ہو جائیں تو دُنیا خوب صورت لگنے لگتی ہے —— ماں بننا تو بڑی خوش قسمتی کی بات ہے، آپ ایک بچّہ تو کم سے کم پیدا کر ہی لیجئے"!

اس نے اپنے بال پکڑ کر زور سے کھینچے، پتہ نہیں توبہ اور پناہ مانگنے کا یہ کون سا انداز تھا —— "میں اب تک تین بچے ضائع کر چکی ہوں —— پورے نہیں یہی دو دو چار چار مہینے کے۔ جس دن ضرورت محسوس ہوئی روک لوں گی —— لیکن ابھی نہیں —— زندگی کی اسمارٹ نس اور بیوٹی ختم ہو جاتی ہے بچّوں سے"! وہ ذرا معنیٰ خیز انداز سے ہنسی۔ "اور وہ جو لائف میں "اصل بات" ہوتی ہے نا وہ تو بالکل ہی ختم ہو جاتی ہے ——" ہنستے ہنستے وہ مزے مزے سے سگریٹ پھونکنے لگی ——

ایسا لگتا تھا کہ ایک کبھی ختم نہ ہونے والا سفر ہے کہ بس جاری و ساری ہے۔ جہاز کی مستقل گھوں گھوں سے کانوں اور سر میں درد ہو گیا —— اللہ پتہ نہیں کب نیویارک آئے۔ ابھی تو لندن بھی نہیں پہنچے، نیویارک کا کیا سوال؟

خدا خدا کر کے لندن کے شاندار ہوائی اڈّے پر پہنچنے کی خوش خبری کانوں میں پڑی —— مائک پر اعلان ہوا کہ سب اپنی اپنی سیٹوں پر جمے بیٹھے رہیں پیٹیاں باندھ لیں اور جب تک جہاز کھڑا نہ ہو جائے اپنی جگہ نہ چھوڑیں۔

بہت سارے مسافر تو محض ٹورنگ بس میں لندن گھومنے کے لئے اُتر رہے تھے، لیکن جس کی منزل لندن ہی تھی وہ اپنے اپنے ہینڈ بیگ، پرس، اٹیچیاں سنبھالنے لگے۔ میری ساتھی کا شوہر بھی اپنا سامان سمیٹنے لگا۔ لیکن وہ خود کسی بھی قسم کے جذبات

سے عاری، یوں ہی مُسکراتی رہی اور ماحول سے لُطف اندوز ہوتی رہی۔ جب وہ سب سامان سمیٹ چکا تو اس پر جُھکا اور اس کے ہونٹوں پر پیار کر کے بولا ــــ "اگلی بار کہاں ملیں گے لوسی ــــ؟"

"خُدا کی دُنیا بہت بڑی ہے ــــ اگر واقعی یہ دُنیا خدا ہی کی بنائی ہوئی ہے تو ــــ" وہ ہنسی اور اپنے لئے پیگ بنانے لگی۔

جب مَرد چلا گیا تو مَیں نے ذرا رُکتے جھجکتے اپنی ساتھی سے پوچھا: "آپ کے شوہر لندن کیوں اُتر گئے؟"

"شوہر ــــ؟" وہ بُرا سا مونہہ بنا کر بولی: "کس کا شوہر؟ آئی ایم نوٹ میریڈ ــــ مَیں تو ابھی تک کنواری ہوں!"

میری حیرت کو ناگواری سے محسوس کرتے ہوئے وہ بولی "وہ تو بس ایک مُسافر تھا ــــ بالکل تمہاری طرح ــــ مَیں کیوں اس کی بیوی ہوتی"؟ وہ اپنے کنوار پن پر از حد نازاں تھی ــــ مَیں احمقوں کی طرح اس کی طرف دیکھتی رہ گئی ــــ

مائک سے اعلان ہو رہا تھا:

"اب لندن سے پرواز شروع ہو گی تو ہم چھ گھنٹوں میں نیویارک پہنچ جائیں گے"

نیویارک ــــ امریکہ کا دِل ــــ

(اوہ امریکہ)

# اوہ امریکہ!

## (۲)

میں نے فون اُٹھایا —— اپنا پتہ اور نمبر دیا :

"نارتھ امریکہ —— ایریا کوڈ ۴۱۶ —— فون : ۴۹۷۲ —— ۴۲۹ ——
میں اپنے بھائی جان سے بات کرنا چاہتی ہوں —— ڈاکٹر سیّد سے"

"آپ کا نام"

"واجدہ تبسّم"

"ویجیڈا تباسّم ؟" فون گرل نے بڑی مُشکل سے میرا نام اَدا کیا۔

"ہاں" میں ہنسی "تباسّم"

"کلکٹ کال ؟" (COLLECT CALL) اُس نے دُہرایا۔

امریکہ میں یہ عجیب چکّر ہے —— آپ کو کسی سے بات کرنا ہے، فون کا بِل آپ خود نہیں دینا چاہتے، بلکہ جس سے بات کرنا چاہتے ہیں، اسی پر لادنا چاہتے ہیں۔ اگر پارٹی آپ پر مہربان ہے تو بِل اَدا کر دے گی، لیکن پہلے تصدیق کرنا پڑتی ہے

اس کے بعد ہی ٹرنک کال، جسے وہاں "لانگ ڈسٹینس" کہتے ہیں، ممکن ہے۔
آپریٹر گرل نے اُدھر سٹریٹر کی ـــــ بھائی جان بِل ادا کرنے پر آمادہ تھے۔
میں بھلا وہاں ڈالرز کہاں سے لاتی ؟ اب ٹھاٹ سے باتیں کروں گی ـــ چاہے بل کتنا ہی بڑھ جائے۔
"ہائے ـــــ" اُدھر سے بھائی جان کی آواز آئی (پتہ نہیں امریکہ کو یہ ہائے ہائے کہاں پہنچا کر دم لے گی ؟) ڈاکٹر سید اسپیکنگ"
میں نے انتہائی شستہ اردو میں کہنا شروع کیا : "آداب عرض ہے بھائی جان ـــــ میں آپ سے کچھ دیر گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔ کیا آپ مجھے اس کی مہلت عطا کریں گے ؟"
بھائی جان ہنس دیئے۔ "میں اردو بھولا نہیں ہوں ـــــ بتا کیا کام ہے ؟"
"بھائی جان ـــــ" میں ذرا رُکتے جھجکتے بولی : "آپ کسی میٹرنٹی ہوم کے انچارج ہیں نا ـ ؟"
"ہاں تھا ـــــ اب نہیں ہوں۔ میں بچے پیدا کراتے کراتے فیڈ اَپ ہو چکا تھا، اس لئے میں نے وہ لائن تو مدت ہوئی چھوڑ دی۔ اب آج کل میں سیکاٹرسٹ PSYCHIATRIST ہوں ـــــ کیوں، بات کیا ہے ؟"
"جی کچھ نہیں بھائی جان ـ" میں گڑبڑا گئی۔ "دراصل بات یہ ہے کہ امریکہ میں کسی ایک ایسی لڑکی سے ملنا چاہتی تھی جو شادی سے پہلے ہی ماں بن گئی ہو ـــ"
"کسی ایک سے ؟" فون پر ایک زوردار قہقہہ سنائی دیا۔ "میری بے وقوف بہن، یہاں ایسی ہزاروں لڑکیاں مل جائیں گی جو کنوارپن میں مائیں بنی بیٹھی ہیں، اور تو ایک کی بات کرتی ہے ـــــ لیکن تجھے کرنا کیا ہے ؟"
"بس یونہی ہی ـ"

"صاف سیدھی طرح کہتی کیوں نہیں کہ پھر اسے موضوع بنا کر کہانی لکھے گی۔"

مَیں ہنس دی۔ وہ کہتے رہے۔ "لیکن یہ زیادتی ہو گی۔ ایک بار کسے ملنے میں اور وہ بھی بس چند گھنٹوں کے لئے، کہیں کہانی لکھی جا سکتی ہے یہ زیادتی ہے۔"

"بھائی جان ——" مَیں بڑے یقین بھرے لہجے میں بولی: "آپ کو پتہ نہیں کسی پر کچھ لکھنے کے لئے چند منٹ بھی کافی ہوتے ہیں، اور آپ گھنٹوں کی بات کر رہے ہیں! بعض چہرے تو ایسے ہوتے ہیں جن پر ایک نظر ڈالنا ہی کافی ہوتا ہے —— ان کی زندگی بھر کی پوری لمبی چوڑی کہانی اُن کے چہرے پر لکھی ہوتی ہے۔ بس لکھنے کا آرٹ آنا چاہیئے ——"

"یہ تو اپنی تعریف کر رہی ہے؟"

"جی نہیں، بالکل نہیں۔" مَیں ذرا ڈر کر بولی۔ "مَیں تو ایک عام تجربے کی بات کہہ رہی ہوں۔ یہ تجربہ کسی بھی رائٹر کا ہو سکتا ہے۔ میرا بھی ہو سکتا ہے —— تو آپ بتایئے نا، آپ مجھے کسی ایسی لڑکی سے ملوا سکیں گے؟"

"تو نیویارک کتنے دِن ٹھہرے گی۔؟"

"یہی کوئی چار چھ دِن۔"

"پھر تو مشکل ہے۔"

"بھائی جان ——" مَیں نے احتجاج کیا۔ "چار چھ دِن کوئی کم مدّت ہے؟ مَیں تو یہ کہتی ہوں کہ آپ مجھے صرف چھ منٹ کے لئے کسی سے مِلا دیجئے۔"

"کیوں ٹورنٹو میں ایسی لڑکی تجھے نہیں مِلی؟"

"کئی مِلیں —— لیکن پتہ نہیں بھائی جان کیا بات ہے، کہانی نہیں بنی۔ مَیں کوئی غیر معمولی چیز چاہتی ہوں۔"

ایسا لگا کہ اُدھر بھائی جان نے فون پر چُٹکی بجائی —— اس انداز میں جیسے

"وہ مارا!"

"تو آجا —— یہاں میری میڈ سرونٹ (کام کرنے والی لڑکی، نوکرانی) سے مل کر شاید تیری خواہش پوری ہو جائے۔" میں نے شکریہ ادا کئے بغیر ہی "خدا حافظ" کہہ کر فون بند کر دیا۔

کالی کافی پیالی میں پڑی پڑی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ میں کالی کافی نہیں پیا کرتی۔ کیتھی نے خود ہی دو تین پیالیاں ختم کر دی تھیں۔

"بغیر دودھ اور چینی کی کافی تمہیں کڑوی نہیں لگتی؟"

"ہر احساس سوچ کی دین ہے —— تم سوچو کہ کافی کڑوی ہے تو ضرور کڑوی لگے گی۔ نہ سوچو تو کوئی مزہ ہی نہیں ——"

"مطلب یہ ہوا کہ زبان کا مزہ دراصل کوئی چیز ہی نہیں ہے؟"

"شاید ہو —— کسی اور کے لئے —— میرے لئے نہیں۔" کچھ عجیب سی فلسفیانہ رنگ ڈھنگ کی لڑکی تھی —— تم نے میرے بارے میں اب تک کچھ پوچھا نہیں —— ڈاکٹر رشید بتا رہے تھے "تم میری زندگی کے بارے میں کچھ جاننا چاہتی تھیں؟" میرا دل دھک سے رہ گیا —— میں اس سے کیا پوچھوں —— اور کیسے پوچھوں؟ ممکن ہے امریکہ میں یہ ایسی کوئی معیوب بات نہ ہو —— لیکن ہمارے ہاں تو اس بات کا تصور ہی دہشت ناک ہے، چوری چھپے کے گناہ تو ازل سے ہیں، ابد تک جاری رہیں گے —— لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ایک کام جو واقعی گناہ ہو، گناہ سمجھ کر نہ کیا جائے۔ مجھے آئے ہوئے دو دن تو ہو چکے تھے —— ان دو دنوں میں کھانے پکانے اور بھائی جان کے دوستوں کو کھلانے کے سوا میں اور کچھ نہ کر سکی تھی —— سب دوست بھائی جان کے کہتے تھے اپنی بہن کو اب انڈیا ہرگز نہ جانے دو ——

کم سے کم ہمیں ہفتہ میں ایک بار تو ایسی نایاب بریانی، قورمہ اور بگھارے بینگن کھانے کو ملیں گے ـــــ مجھے یوں تو ایک رائٹر سے باورچن بنا دیے جانے پر کوئی اعتراض نہ تھا، لیکن یہ تمنا ضرور تھی کہ کم سے کم ایک کہانی تو مجھے امریکہ سے مل جاتی۔

چوتھے دن ہسپتال سے بھائی جان کا فون آگیا کہ لنچ کے وقفے میں وہ گھر نہیں آئیں گے، ہسپتال ہی میں کوئی میٹنگ اٹینڈ کر کے لنچ لے لیں گے ـــــ اُسی دِن اچانک تیز بارش ہونے لگی تھی ـــــ یہ امریکہ کی پہلی بارش میں نے دیکھی ـــــ کیتھی شیشے کی کھڑکی کے پاس کھڑی تھی، اُس نے اپنی ناک شیشے سے چپکا رکھی تھی اور وہ بے حد انہماک سے بارش کے قطروں کو دیکھے جا رہی تھی

"تمہیں دُنیا کیسی لگتی ہے کیتھی؟" میں نے عجیب سا اوٹ پٹانگ سا سوال کیا ـــــ

"دُنیا ـــــ؟" وہ مسکرائی ـــــ "پہلے بہت خوب صورت لگتی تھی ـــــ اب بھی لگتی ہے، مگر مجھے اپنا بچہ بہت یاد آتا ہے، اور کبھی کبھی تو اس بُری طرح یاد آتا ہے کہ مجھے دُنیا ایک دم! بدصورت لگنے لگتی ہے۔"

"لیکن تمہارا بچہ ہے کہاں ـــــ؟" میں نے دُکھ سے پوچھا۔

"میرا بچہ ـــــ؟ وہ کچھ دیر یوں ہی باہر دیکھتی رہی۔" میں نے اُسے ہاسپٹل ہی میں چھوڑ دیا۔"

"لیکن کیوں ـــــ؟" میں بے چینی سے بولی "کیا اس لئے کہ تم شادی سے پہلے ہی ماں بن گئی تھیں؟"

"نہیں ـــــ" وہ لاتعلق اور بے پروائی سے بولی "اس بات کی نہ میرے لئے کوئی اہمیت ہے نہ کسی اور امریکن لڑکی کے لئے ـــــ" پھر وہ ایک دم مڑی اور مجھ سے ہی پوچھنے لگی۔ آخر اس بات سے کیا فرق پڑ جاتا ہے کہ ایک کام جو شادی

کے بعد کیا جاتا ہے، شادی سے پہلے ہی کر لیا جائے؟ یہ سوال میں صرف تم سے نہیں دُنیا میں سب ہی سے کرنا چاہتی ہوں کہ چرچ اور پادری کے سامنے گھٹنے موڑ کر بیٹھ جانے کے بعد مرد عورت ایک دوسرے کے ساتھ سو جائیں تو کیا کوئی نئی بات ہو جاتی ہے؟ کیا آج تک کوئی کُتّا اور کتیا کسی پادری کے پاس گئے ہیں۔!"

وہ پھر بارش کے قطروں میں کھو گئی تھی۔

"آج دُنیا کی آدھی سے زیادہ آبادی لامذہب ہو چکی ہے۔ خُدا کو لوگوں نے دلوں اور دماغوں سے کسی بے مصرف شے کی طرح نکال پھینکا ہے۔ مذہب مذاق بن چکا ہے۔ شاید ہوا یہ ہے کہ لوگوں کو ہر وہ چیز میسر آ چکی ہے جو انسانی حدود کی انتہا تھی، تجسّس اور کھوج کا مارا انسان اب ایک ایسے روگ میں مبتلا ہو گیا ہے جسے "سکھ روگ" کہنا زیادہ مناسب ہو گا، اس لئے لوگ، اور خاص طور سے تم امریکی لوگ شاید پھر اپنی ابتدا کو لوٹ جانا چاہتے ہو ——

وہ پیچھے مُڑی —— "ہاں یہ بالکل ممکن ہے، یہ جو تم نے ابھی کہا "سکھ روگ" بھی ایک دُکھ ہے، یہ بات زیادہ جچی ہے مجھے۔ یہ سُکھوں کی اور عیش و آسائش کی انتہا ہی ہے، جس کی وجہ سے انسان نئے سرے سے تکلیفوں اور دُکھوں کو ڈھونڈھ رہا ہے —— شاید تمہیں بھی یہاں کے ایک جزیرے کا علم ہو جہاں چند سر پھرے جا بسے ہیں —— وہ ننگے رہتے ہیں۔ آگ جلا کر کھانا پکاتے ہیں اور رات ہونے پر جو بھی عورت میسّر آ جائے اس کے ساتھ سو جاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ چہرے ڈھانپ دو تو ہر عورت ایک سی ہوتی ہے، اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ اس کا نام کیتھی ہے یا روزی؟"

میں نے گھبرا کر اُسے دیکھا —— یا خُدا! کس قدر ہولناک خیالات ہیں، اس لڑکی کے! میں کہاں آ کر پھنس گئی اللہ!

لیکن اب وہ شاید اگر چاہتی بھی تو چپ نہیں رہ سکتی تھی۔

"اس ہر عورت کے ایک جیسے ہونے کی بات ہی میری پوری زندگی کی کہانی ہے ——

تمہیں شاید پتہ نہیں —— ڈاکٹر سید جانتے ہیں، پہلے میں شکاگو میں رہتی تھی، پتہ بتاؤں؟ : رڈلان ایونیو : ۲۲۔ مجھے آج بھی اپنے پرانے گھر کا نمبر تک یاد ہے۔ وہاں میں اپنے بھائی مائیکل کے ساتھ رہتی تھی۔ مجھے اپنے بچپن کے بارے میں صرف اتنا یاد ہے کہ میرے ماں باپ دن رات لڑتے جھگڑتے رہتے تھے شراب بھی کبھی لڑائی کا باعث نہیں بنی —— بس ایک نظریاتی اختلاف تھا کہ دونوں ہر لمحہ کھنچے اور تنے ہوئے رہتے تھے۔ کبھی کبھار ممی کے دوست آجاتے۔ گھر میں ناچ گانا ہوتا، پاپا کی موجودگی میں وہ دوست ممی کے ہونٹوں کو چومتے، انہیں گلے لگاتے ان سے لپٹتے، پاپا اس پر کوئی اعتراض نہ کرتے، کیوں کہ وہ بھی اپنی گرل فرینڈز کو لا کر ان کے ساتھ یہی کچھ کرتے —— مائیکل مجھ سے ایک سال بڑا تھا ہم دونوں پہلے پہل تو ڈر ڈر کر یہ تماشے اور لڑائیاں دیکھتے —— اس کے بعد عادی ہو گئے

ایک رات ممی کی اور ہم سب کی موجودگی میں ہی پاپا نے اپنی ایک ساتھی لڑکی کے ساتھ کچھ ایسی حرکت کی کہ ممی چلا اٹھیں۔ "ان بچوں کے سامنے تو یہ سب نہ کرو ——"

پاپا نشے میں دھت تھے، بولے "کیا حرج ہے؟ انہیں بھی تو کچھ سیکھنے دو، آگے کام آئے گا ——"

لیکن یہ شاید ممی کی برداشت سے باہر تھا۔ انھوں نے پاس پڑی ہوئی تپائی اٹھا کر پھینک ماری جو سیدھی پاپا کے سر پر لگی اور خون کا ایک فوارہ سا ابل پڑا —— میں ڈر کے مارے دبک گئی اور ایک دم مجھے نیند آگئی۔

آنکھ کھلی تو گھر پُر سکون تھا ـــــ پتہ چلا کہ ممی کو پولیس لے گئی اور پاپا ہاسپٹل میں مَر گئے ـــــ

مائیکل گھر گھر جا کر اخبار بیچنے لگا۔ میں نے بھی ایک پلازا میں چھوٹی سی نوکری کر لی ـــــ پھر نئے نئے لوگ ملے ـــــ نئی نئی مصروفیتیں بڑھیں ـــــ میرے کچھ بوائے فرینڈز بن گئے اور مائیکل کی چند لڑکیاں دوست بن گئیں، جو ہنگامے ممی پپا کے زمانے میں ہوتے تھے وہی پھر ہونے لگے۔ لیکن فرق یہ تھا کہ یہاں سب آزاد تھے۔ شادی کا فضول بندھن کسی کے گلے میں نہیں بندھا تھا۔ میں کچھ بھی کرتی ٹوکنے والا کوئی نہ تھا ـــــ میں اپنی مختار آپ تھی ـــــ اس طرح مائیکل بھی بے روک ٹوک جو چاہتا وہ کرتا۔

ان ہی دنوں میرے ایک دوست نے مجھے پہلی بار دُنیا کا سب سے عجیب وغریب نشہ پلایا۔ میرا مطلب سیکس یا جنس سے ہے۔ ویسے یہاں ہم سب کم عمری سے ہی ہر بات سے آگاہ ہوتے ہیں۔ لیکن اس نے پھر بھی مجھے احتیاطاً یہ سمجھا دیا تھا کہ " جو چاہو کرو، مگر بچہ کبھی پیدا نہ ہونے دو۔ اس سے سیکس لائف تباہ ہو جاتی ہے۔ اور پھر ایک آفت یہ بھی ہے کہ بچہ پیدا ہو جائے تو گھر کی ذمہ داریاں لپٹ جاتی ہیں۔ اس لئے اُس نے مجھے برتھ کنٹرول کا ایک چارٹ لا کر دے دیا تھا۔ یہ ایک گول سا ہارڈ پیپر ہوتا ہے۔ جس پر پورے مہینے کے دن، تاریخ کے ساتھ لکھے ہوتے ہیں، اور ہر دن تاریخ کے سامنے ایک چھوٹے سے خانے میں ایک ایک گولی رکھی ہوتی ہے۔ پیر کے دن پیر والی گولی، منگل کے دن منگل والی گولی۔ اسی طرح یہ چکر چلتا رہتا ہے۔ ایک بھی دن بھول جاؤ تو گڑبڑ کا امکان رہتا ہے۔ مہینے کے آخر میں وہ پھر مجھے نیا چارٹ لا دیتا ـــــ بعد میں یہ چارٹ میں خود ہی لانے لگی ـــــ

خالی وقت میں مائیکل پلمبر کا کام سیکھ رہا تھا۔ ایک دن اسے ذرا معقول نوکری مل گئی۔ اس کا آفس دُور تھا، اس لئے ہم نے اپنا اپارٹمنٹ (گھر) بدل دیا۔ نئی جگہوں پر

میرے دوست بھی نئے ہو گئے ـــــ مائیکل ذرا مصروف تھا اس لئے اُسے دوست لڑکیاں ملنے میں ذرا دیر ہو گئی ـــــ"

وہ تھوڑی دیر کے لئے رُکی۔ پرکولیٹر سے اپنے لئے کافی اُنڈیلی، اور وہیں صوفے پر بیٹھ گئی ـــــ

"تمہیں شاید پتہ نہ ہو کہ یہاں امریکہ میں "مشترکہ جنسی ملاپ" بھی ہوتا ہے۔ اس کا چکر یہ ہوتا ہے، بہت سارے لڑکے اور لڑکیاں مِل کر ایک ساتھ رہتے ہیں جس کا جس کے ساتھ جی چاہے سو جائے۔ میرے ساتھ خود کئی بار ایسا ہوا کہ میں اپنے دوست کی بانہوں میں ہوں، ہم لذت کی انتہا کو پہنچنے ہی والے ہیں کہ برابر میں کسی دوست نے پڑے پڑے اپنی لڑکی میرے دوست کی طرف اچھال دی اور میں اپنے دوست سے "رہا" ہو کر دوسرے پر جا پڑی ـــــ یہ کوئی بُری بات ہو گی تو بیک ورڈ اور پست ماندہ ملکوں کے لئے ہمارے سماج میں اسے کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا۔

ان ہی دنوں میرے ایک نئے دوست نے مجھے ایک سفید، ننھی سی گولی کھلائی اسے میں برتھ کنٹرول کی کوئی بہت ہی اسٹرانگ گولی سمجھ رہی تھی لیکن بعد میں ـــــ میرا مطلب ہے اس کا اثر زائل ہونے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ نہیں، یہ تو ایک اور ہی نعمت ہے ـــــ تم نے اس گولی ایل، ایس، ڈی کے بارے میں شاید کسی میگزین میں کچھ پڑھا ہوگا ـــــ لیکن آج میرے مونہہ سے اس کے تجربے سُنو، یہ تجربے تمہیں کسی رسالے میں پڑھنے کو نہیں ملے ہوں گے ـــــ تجربے کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے ـــــ اس گولی کی سب سے بڑی خوبی جو میں نے محسوس کی یہ تھی کہ اسے کھا کر انسان تمام فکروں سے آزاد ہو جاتا ہے ـــــ تصور میں ایسی ایسی اَن ہونی نعمتیں آپ کو میسر آجاتی ہیں کہ انسان بس مستقل مسکراتا رہتا ہے۔ کئی بار یہ ہوتا ہے کہ آپ محفل میں موجود ہیں، مگر دوسرے دیکھنے والوں کو ایسا لگتا ہے کہ آپ اچانک ہی محفل سے بس اُڑ گئے۔

چہرے پر ایک عجیب سا رنگ چھا جاتا ہے۔ آپ کسی سے مخاطب ہیں، وہ کچھ کہہ بھی رہا ہے لیکن آپ نہ اس کی بات سنتے ہیں نہ جواب دیتے ہیں۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ آپ سے بات کرنے والے کو اس مغالطے میں رکھتی ہوگی کہ آپ اسی کو دیکھ رہے ہیں، اسی کی بات سن رہے ہیں لیکن دراصل اس وقت آپ بالکل ہی نرالے تصورات کی دُنیا میں ہوتے ہیں۔ اس گولی کی ایک اور خوبی میں نے یہ محسوس کی کہ انسان سیکس سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ مرد شراب پی لے تو اسے عورت یاد آتی ہے۔ عورت شراب پی لے تو مرد کے پاس گھسنے کی کوشش کرتی ہے، لیکن یہ گولی آپ کو سینٹ اور صوفی بنا دیتی ہے، بس ایک بے خودی ہے جس کا کوئی نام نہیں۔"

"اس گولی نے مجھے شراب سے دُور کر دیا۔ ویسے میں شراب کو بُرا نہیں سمجھتی ایک دِن میں اور مائیکل ایک پارٹی میں مدعو تھے، میں نے بتایا نا، نئی جگہ ہونے کی وجہ سے مائیکل کے دوست بچھڑ گئے تھے، اسی لئے دونوں ہر جگہ ساتھ ساتھ جانے لگے تھے۔ ویسے میرے دوستوں پر مائیکل کو کوئی اعتراض کبھی نہیں تھا۔

اس دن ہم پارٹی سے لوٹے تو مائیکل مجھ سے بولا "کتنی سب لڑکے تمہاری کتنی تعریف کرتے ہیں۔ آج میں نے جو ذرا غور سے دیکھا تو واقعی تم بہت خوب صورت ہو —— تمہارا ناپ کیا ہے؟"

"۳۶ —— ۲۶ —— ۳۶" میں نے سرسری طور پر جواب دیا۔

"یہ تو واقعی بہت ہی پرفیکٹ فیگر ہوئی" وہ جوش بھرے تعریفی لہجے میں بولا "اگر تم ذرا ایکسرسائز کر کے اپنی کمر ۲۰ کر لو تو امریکہ کی تمام لڑکیوں کے تین بج جائیں گے۔

دوسرے لڑکوں سے تعریف سننے کا مزہ کچھ اور ہوتا ہے سگے بھائی کے مونہہ سے ایسے جملے سن کر نشہ ہی اور آیا۔ میں ہنسنے لگی۔

مائیکل پھر بولا: "کیتھی تمہیں یاد ہے کبھی زندگی میں ہم نے چرچ کا مونہہ دیکھا ہے؟"

"اونہوں ——" میں تیندیں تھی اور چرچ کا مونہہ شاید کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔

"میں بھی کبھی کسی عبادت گاہ میں نہیں گیا، اس کی ضرورت بھی کیا ہے؟"

پھر ہم یوں ہی باتیں کرتے کرتے اونگھ گئے ——

اب میں نے یہ بات محسوس کی کہ مائیکل کسی اور لڑکی کے پیچھے دوڑنے کے بجائے مجھ میں ہی دلچسپی لینے لگا تھا۔ پھر ایک دن رات کے وقت باہر سے آکر کپڑے بدل رہی تھی کہ مائیکل کی آواز آئی "اس باریک پردے کے پیچھے سے تمہارا جسم واقعی بہت خوب صورت دکھائی دے رہا ہے۔ تمہیں ماڈل گرل کی نوکری ڈھونڈھنا چاہیئے، کیتھی۔"

میں نے چند لمحے پہلے ہی ایل۔ ایس۔ ڈی کا کوٹا ہضم کیا تھا، اس لئے دُنیا پروں سے زیادہ ہلکی اور خوب صورت نظر آرہی تھی اور ہر چیز اپنی انتہائی حدوں تک حسین اور رُسبک لگ رہی تھی، اس وقت دُنیا میں کوئی غم تھا، نہ خوشی —— بس ایک ایسی کیفیت تھی جو صرف میں ہی محسوس کر سکتی تھی۔ ایسے میں مائیکل کی تعریف سچ مچ مجھے اچھی لگی۔ میں ہنسنے لگی۔

شاید عورت کی ہنسی ہر مُلک میں مرد کے لئے ایک بڑھاوا ثابت ہوتی ہے۔ مائیکل سیدھا پردے کے اندر چلا آیا۔ اس وقت میرے جسم پر صرف ایک بریف بکنی تھی —— اور وہ بدھ کا دِن تھا۔ اس دِن میں اپنی برتھ کنٹرول کی چارٹ والی پِل کھانا بھُول گئی تھی۔

مجھے پتہ نہیں کہ اس رات کیا ہوا تھا —— اور جو ہونا تھا ہوا، ہونے والے حادثے کو کون روک سکا ہے؟ لیکن اس کے اثرات متلی کی شکل میں چند روز

بعد مجھ پر ظاہر ہونے شروع ہوئے۔ متلی ـــــ متلی ـــــ جان لیوا متلی ـــــ یہ متلی شاید وہ متلی نہیں تھی جو کہ کھ میں بچہ پڑنے سے پیدا ہوتی ہے، بلکہ یہ ایک ایسی متلی تھی جو مجھے صرف مائیکل کا چہرہ دیکھ کر محسوس ہوتی تھی۔ لیکن اس پر شاید کوئی اثر نہ تھا ـــــ کیوں کہ اپنی نشے والی گولی کے اثرات جب میں خود پر طاری ہوتے دیکھتی تو مجھے ایسا لگا کرتا کہ شاید مائیکل میرے بستر میں گھس آیا ہے۔

ایک دن مجھے قے ہوگئی ـــــ پھر کچھ دن بعد میری جینس اور پتلونیں کمر پر تنگ ہونے لگیں تو میں چیک اپ کے لئے گئی۔ میرے ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ میں ماں بننے والی ہوں۔

میں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا: "ڈاکٹر کیا میں اسے ضائع نہیں کرا سکتی"۔

ڈاکٹر نے نصیحت آمیز لہجے میں جواب دیا: "یو آر ڈوئنگ فار ویٹ ـــــ تم اس کام کے لئے بہت چھوٹی ہو۔ اسی طرح چلنے دو۔ کیری آن"۔

"یہ ڈاکٹر سید جب ہاسپٹل جاتے ہیں تو تم انہیں "خدا حافظ" کہتی ہو نا؟" کیتھی کچھ لمحے چپ رہنے کے بعد کہنے لگی: "میں نے ڈاکٹر سید سے پوچھا تھا"۔ انہوں نے کہا تھا: "ہم لوگ جب گھر سے باہر نکلتے ہیں تو ہمارے گھر والے ہمیں خدا کی، گوڈ کی پناہ میں دے دیتے ہیں"۔ تم لوگوں کو کتنا بڑا سہارا میسر ہے ـــــ ہم امریکیوں کے ساتھ خدا نام کی کوئی چیز نہیں۔ سوچو، جو لوگ اپنے محافظ آپ ہوں، وہ ہمیشہ کتنے ڈرے ہوئے ہوں گے! چونکہ میں بھی خدا سے ناواقف تھی، گوڈ سے میرا کوئی تعارف نہ تھا۔ اس لئے اس ناگہانی مصیبت میں گھر کر اچانک مجھے کسی ایک ایسے سہارے کی ضرورت محسوس ہوئی جو نظر نہ آتا ہو۔ مگر محافظ ہو۔ لیکن میرے بھٹکے ہوئے دل کو ایسا آسرا، کہیں چین نہ ملا۔ کسی بھی مذہب کی چھاپ دل پر

نہ ہوتے ہوئے بھی، دِل کو یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ ہر لمحہ ایک چور سا دِل میں بیٹھا کہتا رہتا یہ کام ٹھیک نہیں ہوا۔"

بہر حال ایک لڑکے کو میں نے جنم دیا، اور زچہ ہونے کے باوجود دوسرے ہی دِن ہاسپٹل سے چلی آئی، پھر میں نے شکاگو ہی چھوڑ دیا۔

اس کے بعد میں نیویارک چلی آئی ـــــ ایک اشتہار میں میڈ سرونٹ کا اشتہار دیکھا تو ڈاکٹر سید کے پاس چلی آئی۔ وہ سیکائٹرسٹ ہیں بہت بھلے آدمی ہیں۔ میں نے اپنی پوری کہانی انہیں سُنا دی۔ مگر جب انہوں نے کہا کہ میرے پاس تو ایسے ہزاروں مریض آتے ہیں جنہوں نے اپنی بیٹیوں یا بہنوں سے موُنہہ کالا کیا ہے۔ تو میں سوچ میں پڑ گئی۔ کہ آخر ہمارا یہ سماج ہمیں کس انتہا پر لے جانے والا ہے ـــــ شاید یہی وجہ ہے کہ آج امریکہ میں دُنیا بھر میں سب سے زیادہ سیکائٹرسٹ موجود ہیں۔"

بارش ابھی تک ہو رہی تھی۔ کیتھی نے پہلی بار میری طرف دیکھ کر کہا:

"بارشوں میں مجھے اپنا بچہ بہت یاد آتا ہے۔ میں سوچتی ہوں، پتہ نہیں جس ماں نے بھی اسے اپنایا ہوگا، وہ محبت اور مناسب دیکھ بھال کے ساتھ اس کی پرورش کرتی ہوگی یا نہیں ـــــ کہیں بے چارہ سردی میں ٹھٹھرتا نہ ہو . . . . . ."

اچانک اس نے مجھ سے پوچھا: "تمہارا کیا خیال ہے ـــ ایسا بچہ پیدا کر کے کیا میں نے کوئی غلطی کی ہے؟"

**کیتھی** کے سوال کا جواب کون دے؟ اس نے جو سوال مجھ سے پوچھا تھا، آج وہ سوال میں ساری دُنیا کے سامنے رکھ رہی ہوں۔

# اوہ امریکہ!

## (۳)

امریکہ نے مجھے جتنی گالیاں کھلوائیں، اب زندگی بھر کوئی نہیں کھلوا سکتا۔
سنا ہے لوگ دُور دُور سے نیاگرا فالز کے دیدار کرنے کو آتے ہیں۔ عجوبہ جو ٹھیرا۔
میں امریکہ گئی تو میری بہن بہنوئی اور بھائیوں، بھابھیوں نے سوچا کہ چلو اب یہ آ ہی گئی ہے تو اسے بھی نیاگرا فالز کی سیر کرا ہی دیں۔ تین لمبی ٹبک، چکیلی مچھلی کی طرح پھسلتی کاروں میں ہمارا قافلہ نیاگرا فالز پہنچا ــــــ
پانچ سیکنڈ ــــــ دس سیکنڈ ــــــ یا شاید پورے ایک منٹ تک تو میں نے بہت شوق سے نیاگرا فالز کی زیارت کی، پھر اپنی بہن کی طرف مُڑ کر گویا ہوئی ــــــ "اب واپس گھر نہ چلیں؟"
"ہائیں!" سب کے مونہہ حیرت سے کُھل گئے۔ "ہاں، اتنی جلدی دیکھ لیا؟"
"دیکھ بھی لیا اور جی بھی بھر گیا ــــــ بس بے حساب پانی ہی تو ہے جو اُوپر سے نیچے مار گرا چلا آ رہا ہے۔ اب کتنا دیکھوں بھئی ــــــ؟"

سارے راستے کسی نے مجھ سے بات نہ کی۔ گھر آکر خوب صلواتیں پڑیں۔ میرے بہنوئی نے صاف اعلان کر دیا " اب سے کسی نے اسے میرے سامنے ادیبہ کہہ کر متعارف کرایا تو کہنا۔ ہاں ـــــ"

"ارے یہ ہے ہی نہیں رائٹر، ورنہ رائٹر لوگ تو اس قدر قدرتی نظاروں کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں اسے ورڈزورتھ ہی کی مثال لو۔۔۔۔"

بھابی کے بعد بھیا کی باری تھی " اسے امریکہ کس چغد نے بھجوا دیا؟"

" اب کیا میں کسی تیرتھ استھان میں آئی تھی کہ وہیں دھونی رما کر بیٹھ جاتی ـــ اچھے لوگ ہیں آپ بھی ـــــ سر پھرے کہیں کے ـــ"

اس روز میرے بارے میں یہ بات طے کر لی گئی کہ کوئی بھی ملنے والا آئے گا تو اسے ہرگز یہ نہ بتائیں گے کہ یہی واجدہ تبسم ہے۔

لیکن جب ایک دن چار پانچ حضرات مل کر یہ تجویز لے کر آئے کہ ہم شمالی امریکہ میں بسنے والے اردو داں لوگوں کی طرف سے ایک شام ـــــ "شامِ واجدہ تبسم" منانا چاہتے ہیں تو سب اپنی جگہ چُرمُرا کر رہ گئے۔

لموجی (میرے بہنوئی) نے ذرا رکھائی سے کہا ـــ " وہ بیٹھی تو ہے آپ لوگ خود ہی بات کر لیجئے ـــــ"

اب میں نے لاکھ انکار کیا، اور دامن بچانا چاہا، لیکن کوئی مانتا تب نا۔

اسی شام کی بات ہے، ہندوستان اور پاکستان کے مشہور ناول نگار عزیز احمد اور ان کی بیگم مجھ سے ملنے آئے۔ افروز سے ملوایا تو آپا (بیگم عزیز احمد) نے بے اختیار مجھے گلے لگا لیا، اور بڑے پیار سے بولیں: " ائی ماں واجدہ ـــ اتی موٹی نہیں ہوتی تھی تو کتی خوب صورت لگتی تو ـــــ"

لسوجی جل کر بولے" اب تو آپ اس کی موٹی عقل کا ماتم بھی ساتھ ہی کر لیجئے"
میں ہنس کر آپا سے دوبارہ لپٹ گئی" آپا آپ نے تو مجھے میرے پیارے حیدرآباد دکن کی یاد دلادی ——"
آپا کچھ ہنس کر کچھ بناوٹی خفگی سے بولیں: "حیدرآباد کو پیارا بھی بولتی اور اس کی دھجیاں بھی اڑاتی ——"

"ہاں صاحب، عزیز احمد ہماری طرف متوجہ ہو کر بولے: "سنا ہے آپ نے حیدرآباد دکن کے نوابوں کی بہت خبر لی ہے"
وہ بڑے انہماک سے اس ٹیپ کو الٹ پلٹ کر دیکھے جارہے تھے جو میں بمبئی سے سردار جعفری کی طرف سے لائی تھی۔ سردار بھائی نے ایک ٹیپ میں عزیز احمد کو مخاطب کر کے چند دل کش جملے کہے تھے اور اپنی بے حد پیاری اور لافانی نظمیں، "میرا سفر" اور "نیند" ان کے لئے ٹیپ کر کے بھیجی تھیں۔
"صرف سنا ہے؟" میں ہنس کر بولی۔
"ہاں صاحب . . . ."
میں نے ان کی بات کاٹ دی۔ "معذرت نہ کیجئے، اکثر بزرگ ادیب چھوٹوں کی چیزیں نہیں پڑھتے، مصروف بے حد رہتے ہیں نا!"
"ارے نہیں ——" وہ گڑبڑائے۔ میں نے آپ کا نام بہت سنا ہے"
میں ہنسنے لگی —— "آپ پھر وہی کہہ رہے ہیں کہ آپ کا نام بہت سنا ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ بڑے لوگ —— میرا مطلب ہے پرانے ادیب نئے لکھنے والوں کو نہ بھی پڑھیں تو بھی ان کی پانچ پانچ کتابیں چھپ ہی جاتی ہیں"
عزیز احمد زور زور سے ہنسنے لگے —— بھئی واجدہ بات یہ ہے کہ میں کوئی بیس پچیس برس سے ادھر آبسا ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اردو کے رسالے دیکھنے

کو بھی کم ملتے ہیں۔ اور اگر ملتے بھی ہیں تو ایسی بھاگ دوڑ کی زندگی ہے کہ پڑھنے کو وقت نہیں ملتا۔ ویسے افسانوی حصّے میں آپ کا نام تقریباً ہر معیاری رسالے میں دکھائی دے جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہی ہوا نا کہ آپ بہت لکھ رہی ہیں۔ اور بہت اچھا لکھ رہی ہیں ورنہ یہ "فنون" "نقوش" "نیا دور" "سویرا" اور "ادبِ لطیف" جیسے پرچوں میں آپ کا نام کیسے نظر آتا!" وہ رُک کر ذرا ہنسے "ویسے ہماری کمی ہماری بیگم پوری کر دیتی ہیں، وہ آپ کو بڑی باقاعدگی اور بڑے شوق سے پڑھتی ہیں۔

"تو جب آپ نے مجھے پڑھا نہیں تو حیدرآباد کے متعلق یہ سوال کیوں؟"

"اصل میں کچھ لوگوں نے آپ کی کہانیوں کا ذکر کیا تھا۔ دو ایک کہانیوں کے بارے میں ان کے تقسیم کے بارے میں بتایا بھی تھا۔ کچھ لوگوں کو شکایت بھی ہے، کہ آپ خواہ مخواہ حیدرآباد کے پیچھے پڑ گئی ہیں۔ حیدرآباد کے حکمراں طبقے کی عیاشی کے بارے میں جو آپ لکھتی رہی ہیں تو کیا ہندوستان میں اور کسی جگہ کے حاکموں نے عیاشی نہیں کی؟ کیا صرف حیدرآبادی نواب ہی عیاشی کرتے رہے؟"

"آپ نے میری لکھی ہوئی چند کہانیاں سُنی ہیں، خود نہیں پڑھی، اسی لئے آپ بات کو سمجھ نہیں سکتے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں حیدرآباد میں رہتی ہوں، اس لئے وہاں کے لوگوں کے بارے میں بہتر طریقے سے لکھ سکتی تھی، دوسری جگہوں کے راجاؤں حاکموں اور نوابوں نے کیا کیا، میں اس موضوع پر کیسے لکھ سکتی ہوں؟ جنہیں میں نے دیکھا، ان ہی پر لکھا ــــــ اور یہ بھی غلط بات ہے کہ میں نے صرف ان کی بُرائیوں پر لکھا ہے میں نے جو کردار پینٹ کئے ہیں، اُن میں اچھے بھی ہیں اور بُرے بھی۔ میں نے اچھائیوں پر لکھا یا بُرائیوں پہ، بہر حال ڈوب کر لکھا ــــــ اور حیدرآباد کے لوگوں کو اتنی باریکی سے، اتنے قریب سے، اور اتنی گہرائی سے دیکھا ہے کہ اب میں انہیں دُور سے دیکھ کر ہی بتا سکتی ہوں کہ یہ حیدرآبادی ہے۔ مثال کے طور پر آپ کی محفلوں کی جان رازِ سکا

بھی حیدر آبادی ہے ــــ چاہے وہ لاکھ ہوٹ پینٹ پہنے . . . . "

اس پر اتنی زور کا قہقہہ پڑا کہ میں ڈر سی گئی ۔

لبوجی سب سے زیادہ زور سے ہنسے تھے ۔ کیوں کہ انہیں ایک بار اور مجھے اور میری عقل کو موٹا ثابت کر دینے کا موقع مل گیا تھا ۔

"ارے صاحب !" وہ مجھے مخاطب کر کے بولے "آج سے آٹھ سال پہلے جب ہم شکاگو میں تھے تب سے ہماری لاڈلیکا سے دوستی ہے ، خود افروز سے اس کا ملنا جلنا ہے وہ رہی پیورا امریکن ، شاید کچھ اسپینش آمیزش بھی ہو ، کیوں کہ اس کی آنکھیں تو گہری نیلی ہیں ، لیکن بال سُرخی مائل ، کچھ شہد کے رنگ کے ہیں ۔ انگلش ایسی دھاں سو بولتی ہے کہ پوچھئے نہیں ۔ شکاگو چھوڑ کر ہم یہاں ٹورنٹو چلے آئے ۔ اتفاق سے وہ بھی کچھ برس بعد یہاں آ گئی ــــ امریکہ سے لے کر کینیڈا تک کسی احمق نے یہ بات سوچی تک نہیں ۔ اور آپ فرما رہی ہیں کہ وہ حیدر آبادی ہے ! کبھی تو بھولے بھٹکے اس کے مونہہ سے اردو کا ایک آدھا لفظ نکلتا ! "

میں نے ریان سے کہا " ایک آدھ دن پیچھے سے جا کر آپ اُسے "کُتیا" کہہ کر تو پُکاریئے ، پلٹ کر نہ دیکھے تو میرا ذمہ ــــ کیوں کہ نفسیاتی طور پر وہ بھی جواباً مادری زبان ہی میں آپ کو کُتا کہہ کر دھتکارے گی ۔

ایک اور زوردار قہقہہ پڑا اور بات ختم ہو گئی ۔

"**شامِ واجدہ تبسم**" ــــ بڑی دلفریب اور یادگار شام ثابت ہو گی ۔ میرے اپنے بھائیوں میں سے تو اس ڈر کے مارے کوئی بھی شامل نہ ہوا کہ منانے والوں نے مروت مروت میں شام منا تو ڈالی ، لیکن اگر کوئی بھی آ کر نہ پھٹکا تو کیسی بُکی ہو گی ۔ اس سے اچھا تو یہ ہے کہ یہ شرمندہ کرنے والا منظر دیکھنے جائیں ہی نہیں کہ پورا ہال خالی پڑا ہے ۔

اور اکا دُکا کرسی پر کوئی آدمی جماہیاں لیتا نظر آرہا ہے۔

مگر وہاں تو پورا ہال "گچ گچ" (معاف کیجئے یہ خالص حیدرآبادی لفظ ہے، موجودہ زمانے میں جسے "ہاؤس فل" کہا جاتا ہے۔) بھرا ہوا تھا۔ حد یہ کہ دروازوں تک میں لوگ ٹھنسے کھڑے تھے۔ فارن میں اُردو اور اُردو دانوں کی قدر افزائی دیکھ کر میں دِل ہی دِل میں "اُردو زندہ باد" کا نعرہ لگانے ہی والی تھی کہ تیسری صف میں مجھے رافِکا (دی امریکن بلونڈ) بیٹھی نظر آگئی۔

میری شان میں قصیدے خوانیاں ہوتی رہیں، اور میں بڑی بے چارگی کے ساتھ سَر جھکائے صبر سے سب کچھ سُنتی رہی۔

اس کے بعد سوالات کا سلسلہ شروع ہوا۔

"آپ کو لکھنے کی تحریک کہاں سے مِلی؟"

"بچپن میں ماں باپ کی بیک وقت موت، دُکھ اور غریبی سے۔"

"پہلے پہل تو آپ نے بڑی غم ناک، غریبی سے متعلق رُلا دینے والی کہانیاں لکھیں —— بعد میں ایک دم پینترا بدل کر سیکس پر لکھنا شروع کر دیا، اس کی وجہ؟"

"وجہ مجھے معلوم نہیں۔"

(سب کا قہقہہ —— لیکن سب کے ساتھ رافِکا کا قہقہہ بھی شامل!)

"آپ بہت عریاں لکھتی ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کا کیا کہنا ہے؟"

"مابدولت یہ الزام بخوشی قبول فرماتے ہیں۔"

(بے حد دیرپا قہقہہ —— لیکن رافِکا، تم کیا سمجھ کر ہنسیں۔؟)

"کیا آپ ادب اور سیاست کو الگ الگ کر کے دیکھنے کی عادی ہیں؟"

"کیا آپ مجھے اور اندرا گاندھی کو دو الگ الگ شخصیتیں نہیں سمجھتے؟"

"اچھا اندرا گاندھی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

تو بے حد خوب صورت خاتون ہیں۔"
تیز قہقہوں کے بیچ میں سوال کرنے والے صاحب کی جھلائی ہوئی آواز ابھری
"میں ان کے حسن کے بارے میں نہیں، اُن کی پالیسی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔"
"معاف کیجئے، میں اپنے ملک سے باہر جا کر سیاست پر گفتگو کرنا مناسب نہیں سمجھتی ——"
پیچھے کی صفوں سے آواز آئی "آپ نے بہت چھوٹی عمر سے بہت بُری بُری باتیں لکھنا شروع کر دی تھیں۔ آپ کا ذریعہ معلومات کیا تھا ؟"
"بہشتی زیور۔"
" ایک دم غلغلہ سا اٹھا۔ میں نے ہاتھ اُٹھا کر لوگوں کو شانت کیا ——؟ آپ غلط نہ سمجھئے —— میرے خیال میں خود آپ میں سے کسی نے "بہشتی زیور" نہیں پڑھا۔ اس میں جو مسئلے مسائل ہوتے ہیں وہ ناپختہ ذہن کو ایسا کہنے پر مجبور بھی کر سکتے ہیں —لیکن اس میں آپ کو بُرائی کیا نظر آتی ہے ؟"
"آپ کے افسانے شریف بہو بیٹیوں کے پڑھنے کے لائق نہیں ہوتے۔"
"میں خود بھی اپنے افسانے نہیں پڑھتی، کیوں کہ میرا اپنا بھی یہی خیال ہے۔"
(سب کے قہقہے کے ساتھ لاڑکا کا تیز قہقہہ)
"اچھا یہ بتائیے، آپ "شمع" میں کیوں لکھتی ہیں ؟"
" دیکھئے، ہندوستان اور پاکستان، دونوں مُلکوں کی حکومتوں نے رسالوں کے آنے جانے پر پابندی لگا رکھی ہے، اب ہندوستان میں صرف "شمع" ایسا پرچہ ہے جس میں معقول لوگ چھپتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ معاوضہ بھی کافی ملتا ہے، اور پرچہ معقول بھی بے حد ہے۔"
"آپ "شمع" کی پبلسٹی کے لئے یہاں تشریف لائی ہیں ؟"

"معاف کیجئے" شمع" کا نام پہلے آپ ہی نے لیا تھا، میں نے صرف آپ کے سوال کا جواب دیا ہے"۔

لوگ ہنسنے لگے ـــــ راڈیکا بھی مسکرا رہی تھی ـــــ میں نے جل کر سوچا، یہ کم بخت اگر اردو نہیں جانتی تو یہاں بیٹھی کیا جھک مار رہی ہے۔

اچانک کسی مین ایج لڑکی نے پوچھا: "آپ کی پسندیدہ چیزیں کیا کیا ہیں؟"

میں ہنسنے لگی ـــــ "چیزیں تو دنیا میں بے شمار ہیں ـــــ ویسے مجھے لباسوں میں ساڑی، کھانوں میں چاول، خوشبوؤں میں MOON WIND ملکوں میں ہندوستان اور شہروں میں حیدرآباد . . . . . ."

پتہ نہیں یہ میرے اپنے واہمہ کا کرشمہ تھا یا حقیقت تھی کہ مجھے ایسا لگا کہ حیدرآباد کا نام سنتے ہی راڈیکا نے تیز آواز میں زور سے "جھوٹ!" کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر تیز تیز چلتی باہر چلی گئی۔

اس کے بعد محفل میں گیت اور سنگیت کا جادو بکھرنے لگا ـــــ لیکن مجھے بار بار خیال آتا رہا کہ راڈیکا کو اگر اردو نہیں آتی تھی تو وہ میری شام میں کیا کرنے آئی تھی؟"

میں فارن آباد ہونے کے ارادے سے گئی تھی۔ اسی لئے ساتھ میں بس چھوٹے بچوں کو لے کر چلی گئی تھی کہ بڑے بچوں کو میاں ذرا آسانی سے سنبھال کر لے آئیں گے چھوٹے ان سے کیسے سنبھلیں گے ـــــ طے یہ ہوا کہ پہلے بڑے بھیا کے پاس امریکہ جاؤں گی۔ اس کے بعد بہن اور چھوٹے (مجھ سے بڑے مگر بڑے بھیا سے چھوٹے) بھائیوں کے پاس کینیڈا۔ دونوں جگہوں میں سے جو زیادہ اپیل کرے گی اور پسند آئے گی وہیں بس جاؤں گی اور میاں کو لکھ دوں گی کہ امریکہ آجایئے ـــــ یا کینیڈا آجایئے۔ دونوں جگہ سگے بھائیوں کی وجہ سے سہولت تھی، روپے پیسے کی کمی تھی نہ رہنے کی۔ بھائی وہاں رہ کر "سیٹھے" ہو چکے ہیں۔ ان ہی کے بار بار اصرار پر میں گئی بھی تھی۔ کیوں کہ وہ لوگ وہاں ٹی۔ وی پر

روزانہ ہندوستان کے فاقہ زدہ لوگوں کی نیوز ریل دیکھتے دیکھتے طے کر بیٹھے تھے کہ واجدہ تبسم فاقے کر رہی ہیں اور انہیں فوراً امریکہ یا کینیڈا بُلا کر آباد کر دینا چاہیئے۔

مَیں نے امریکہ بھی دیکھ لیا، کینیڈا بھی، اور اعلان کر دیا کہ مَیں واپس ہندوستان جا رہی ہوں۔ سونے کا ہندوستان میرا۔ اس پر بھائیوں سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے خوب خطابات ملے ——— گدھی، نالائق، موری کے کیڑے موری میں خوش، فاقہ زدہ اور جو جو بھی ممکن ہو سکتا تھا۔ بہر حال مَیں مجبور تھی۔

"خدا کے لئے کم سے کم انڈیا جا کر یہ نہ کہنا کہ مجھے فارن پسند نہیں آیا ——— لوگ کہیں گے نہایت جاہل ہے۔"

"کمال ہے!" اظہر بھائی غصّہ سے بولے "امریکہ پسند نہیں آیا! لوگ مرتے ہیں یہاں آنے کے لئے! اور یہ عقل مند آ کر واپس جا رہی ہے! ہندوستان نے اس کے ذہن پر زنگ چڑھا دیا ہے۔"

پھر ہر آنے والے سے میری بُرائیاں۔

"فرسٹ کلاس فرسٹ ایم اے پاس کر لینے سے کوئی عقل مند تھوڑا ہی ہو جاتا ہے۔"

"یہ کیا ضروری ہے کہ ہر کہانی لکھنے والا یا والی عقل بھی رکھتی ہو ———"

ان لوگوں کی اس قسم کی باتوں سے لوگوں پر اور کچھ اثر ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، یہ ضرور ظاہر ہونا شروع ہو گیا کہ مَیں واپس ہندوستان جا رہی ہوں۔ اس لئے جیسا کہ آنے کی خوشی میں مسلسل پارٹیاں اور دعوتیں ہوتی رہی تھیں ——— اب جانے کے غم میں بھی لوگ دعوتیں کئے جا رہے تھے۔ ان سب دعوتوں میں رافِیکا ضرور شامل ہوتی۔ اس لئے کہ وہ ہر ہندوستانی اور پاکستانی گھرانے میں مقبول تھی۔ یوں تو بھائیوں کے اور بھی امریکن اور کینیڈین دوست تھے، جو ہر فنکشن اور دعوت میں اکثر شامل رہتے تھے۔

ان میں عورتیں بھی ہوتی تھیں ـــــ لیکن رازِقا کے بغیر تو گویا دعوت کا کوئی تصور ہی نہ تھا۔ اس لئے کہ جس گھر میں بھی دعوت ہوتی وہ اپنی ملنسار طبیعت کی وجہ سے تیاری میں ہاتھ بٹانے پہنچ جاتی۔ مرد اس سے بہت خوش رہتے، اور عورتیں ذرا مشکوک۔ پھر بھی ـــــ

پاکستان کی ایک بیگم علیم تھیں ـــــ ان کے ہاں میرے واپس جانے کے غم میں جو دعوت ہوئی وہ بہت ہی شان دار تھی ـــــ اکٹھے اتنے سارے مہمان انھوں نے بلا رکھے تھے کہ اُن کا بے پناہ شان دار مکان جیسے مہمانوں سے لبالب بھر گیا تھا ـــــ کھانے سے پہلے میں مغرب کی نماز پڑھنے کے لئے بیگم علیم کے لونگ روم میں پہنچی تو دیکھا کہ رازِقا جلدی جلدی اپنے سنہرے بالوں میں کنگھی پھیر کر باہر نکل رہی ہے۔ اُس نے مجھے گھبرا کر دیکھا، مگر میں نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ مجھے ایسا لگا کہ میرے ذہن اور آنکھوں پر جو پردہ پڑا ہوا تھا وہ اچانک ہی اُٹھ گیا ہے۔ میں رازِقا کے قریب پہنچی اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بہت اعتماد سے بولی: "رفو باجی، آپ ساری دُنیا سے اپنے آپ کو چھپا سکتی ہیں، مجھ سے نہیں ـــــ آخر آپ مجھ سے کیوں بھاگ رہی ہیں؟"

وہ چند لمحوں تک اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتی رہیں، پھر وہ جیسے ہار سی گئیں ـــــ "وجو ماں میں تیرے کو کیسا سمجھاؤں؟ میں تیرے سے سامنا نہیں کر سکتی تھی ـــــ میں تیرے کو صراط المستقیم کے معنی پڑھائی تھی، یاد ہوئیں گا نا؟ ہور میں اج وہ سبق بھول گئی ـــــ اس واسطے ....."

وہ وہیں صوفے پر گر سی گئیں ـــــ میں حیران سی کھڑی رہ گئی۔ مغرب کا وقت تنگ ہوا جا رہا تھا۔ "میں نماز پڑھنے جا رہی ہوں۔ رفو باجی، سُنئے میری رفو باجی ـــــ آپ پلیز کل اسکاربورو پہنچ جائیے ـــــ وہاں بھیا کے گھر کے قریب جو چلڈرن پارک ہے، وہاں پانی کے کنارے بیٹھ کر میں آپ سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ آپ کو

پانی کے کنارے، حوض کے کنارے بیٹھنا کتنا پسند تھا ـــــ یاد ہے نا؟ آپ آئیں گی نا؟ دیکھئے جھوٹا وعدہ تو نہیں کر رہی ہیں نا؟"

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو۔

دوڑ پیچھے کی طرف۔

اور پیچھے

اور پیچھے

یہ ۱۹۴۷ کا ہندوستان ہے ـــــ خون اور خاک میں لتھڑا ہوا ـــــ

یہ ۱۹۴۸ کا ہندوستان ہے ـــــ معصوم لوگوں کو اپنے گھروں سے بے گھر کرنے والا۔

۱۹۴۷ (اگست) سے لے کر ۱۹۴۸ (جنوری) تک چند مہینے انتہائی افراتفری میں گزرے ہیں۔ ہم سب بھائی بہن چھوٹے چھوٹے ہیں۔ کسی بات کی سمجھ نہیں۔ شہر میں بلوے اور لڑائی جھگڑوں کی جو وارداتیں ہوتی ہیں انہیں بھی تماشا سمجھ کر دیکھنے کے لئے لپک پڑتے ہیں۔ لیکن نانی اماں سب کو پکڑ پکڑ کر کمروں میں بند کر دیتی ہیں ـــــ

"ارے کم بختو! باہر نہ نکلو۔ کوئی بھی کاٹ کے رکھ دے گا۔"

دھیرے دھیرے پتہ چلا کہ سارا خاندان ہی پناہ گاہ جان کر حیدرآباد دکن پہنچ چکا ہے۔ وہاں سے ہمدردوں کے خط پہ خط آ رہے ہیں کہ خدا کے لئے اپنی جان کی سلامتی چاہتے ہو تو حیدرآباد چلے آؤ۔ مسلمان بادشاہ کی حکومت ہے، ہم سب کو پناہ مل گئی ہے، تمہیں بھی مل جائے گی ـــــ

ایک صبح آنکھ کھلی تو محسوس ہوا کہ گھر چلا جا رہا ہے ـــــ ارے یہ گھر چلنے کیسے لگا؟ پتہ چلا کہ اسی وقت سب لوگ ٹرک میں بھرے ہوئے ہیں اور اس ڈر سے کہ محلّے والے روک نہ لیں۔ راتوں رات نانی اماں سوتے بچوں کو اٹھا اٹھا کر

ٹرک میں ڈال کر حیدر آباد دکن کے سفر پر چل پڑی ہیں ـــــ پھر کچھ دن ٹرک میں، کچھ بسوں میں، پھر ریل گاڑیوں میں گزرے ـــــ پھر حیدر آباد کے حیران کر دینے والے ریلوے اسٹیشن کاچی گوڑہ پر ہم لوگ اترتے ہیں۔ ایک عجیب و غریب سواری شکرام نظر آتی ہے نہ یہ تانگے جیسی ہے، نہ رکشا جیسی ـــــ شکرام والوں سے بھاؤ تاؤ کر کے تین شکرام طے کر کے سب لوگ شکراموں میں سامان سمیت لدنے لگتے ہیں۔ پوری گھر گرہستی کا سامان ہے۔ شکرام والے یہ کہتے ہیں "نکو صاحب معصوم جنور پر اتا ظلم نکو۔ اتا وزن لے کو گھوڑا کیسا چلیں گا۔"

دو تین ہاتھ رکشا والے تیز تیز اپنی رکشائیں دوڑاتے ہوئے آتے ہیں ـــــ "بولو پاشا، کاں جانا ہے؟"

انسانوں کا وزن اٹھانے والا یہ انسان! کتنی ہاتھ رکشائیں آ جا رہی ہیں ـــــ موٹے موٹے آدمی۔ برقع پہنے ہوئے عورتیں، چھوٹے بڑے بچے ـــــ انسان بھی اور سامان بھی ـــــ سر سے پیر تک پسینے کی بہتی ہوئی دھاریں ـــــ میں بہت چھوٹی ہوں ـــــ بارہ سال کی بچی ـــــ لیکن دل پر ایک تیر سا لگتا ہے۔ یہ کیسی دنیا ہے جہاں ہم پناہ لینے آئے ہیں ـــــ رحم اور پناہ کی تلاش میں ہم کیسے نگر میں آ بھٹکے ہیں، جہاں ایک انسان دوسرے انسان کو اپنے بوجھ تلے پیس رہا ہے۔

حیدر آباد دکن کا یہ پہلا تحفہ تھا جسے میرے ننھے سے دل نے قبول نہیں کیا۔ درد کا تحفہ ـــــ

ہم سب شکراموں میں، تانگوں میں، ہاتھ رکشاؤں میں سامان کے ساتھ لدے چلے جا رہے ہیں۔ یہ چوڑی چوڑی شفاف سڑکیں۔ یہ جگمگاتے بازار۔ یہ پرجلال، باوقار حیدر آباد دکن۔ یہ کشادہ گلیاں ـــــ

راستے میں چار مینار پڑتا ہے۔ پرہیبت۔ رعب دار۔ سہما دینے والی شان و

شوکت ـــــ

شاہ گنج، چوک، خانہ باغ ہوتے ہوئے ہم اس شان دار حویلی میں پہنچتے ہیں۔ جس کے گرد پیدل ایک چکر لگایا جائے تو صبح سے شام ہوجائے۔ پتہ نانی اماں کے پاس لکھا ہوا تھا۔ بڑی آسانی سے اس حویلی کا پتہ مل گیا ہے۔ اس حویلی کے مختلف حصوں میں ہمارا پورا خاندان ـــــ نہیال؟ ددھیال، دونوں طرف کا ـــــ بکھرا پڑا ہے خود حویلی کے مالک نواب ظہیر یار جنگ کے خاندان کے افراد بھی یہیں رہتے ہیں۔ سینکڑوں گھر اس حویلی میں بنے ہوئے ہیں، سنگِ مرمر کے فرشوں، چاندی جڑے کلسوں، میناروں والے شادی خانے، مہمان خانے توشے خانے ـــــ سب 'خانے' پرہیں ہم بدنصیب سب سے بعد میں پہنچے ہیں، اس لئے معمولی سا ایک گھر ہمیں دے دیا گیا ہے۔ ہمارا گھر ایسے زاویے پر ہے کہ اوپری چاندنی سے اکثر گھرانوں کی گھر بیٹھے سیر ہوجاتی ہے۔ صرف ایک محل "شادی خانہ" ایسا ہے جس کا کوئی حصہ یہاں سے نظر نہیں آتا۔ شادی خانے کی آخری دیوار ہمارے گھر سے ملی ہوئی ہے۔

چند ہی دِن میں مَیں سب گھروں کے مکینوں کے بارے میں جان چکی ہوں۔

نیلے محل میں ایک بہت گوری چٹی خوب موٹی زیورات سے لدی پھندی بیگم صاحبہ رہتی ہیں۔ کئی نوکرانیاں ان کے آس پاس خواہ مخواہ کھڑی رہتی ہیں۔ بے حد غصہ ور ہیں۔ بات بات میں "اُجاڑ مٹی پڑ کو جاؤ" دُہراتی رہتی ہیں۔

حیدرآبادی زبان بڑی مشکل سے سمجھ میں آتی ہے۔ ہوتی اُردو ہی ہے، مگر ایسی تو نہیں جیسی میں اب تک اسکول میں پڑھتی آرہی تھی، مگر ان لوگوں کے بات کرنے کے انداز اور اتار چڑھاؤ سے سمجھ لیتی ہوں کہ کیا کہہ رہے ہیں۔

ایک اور معمولی شکل و صورت کی بیگم صاحبہ دوسرے محل میں رہتی ہیں۔ دستار اور اچکن پہنے ہوئے جب ان کے میاں (غالباً میاں ہی ہوں گے۔) اندرون محل میں داخل

ہوتے ہیں تو وہ پتہ نہیں کیوں گالیاں دے کر اپنی مخصوص خوب صورت سی نوکرانی کو اندر بھگا دیتی ہیں۔ ایک دن چٹیا پکڑ کر گھسیٹا بھی۔

نیلے محل میں رہنے والی بے حد شان دار اور پُرشکوہ عمارت جیسی مالکن نے ایک دن اس بات پر غصہ ہو کر کہ ان کی پالکڑی چھوکری نے ان کا کھڑا دوپٹہ بجائے زعفرانی کے گلابی رنگ دے دیا ہے اس کے آبشار کی طرح لہریں مارتے بے پناہ بال جڑ سے کٹوا دیئے۔ حجام اس کا سر مونڈتا رہا اور وہ بیٹھی دندناتی رہیں۔ اب اس کے سر پر کالی اوڑھنی لپٹی رہتی ہے۔

تعجب ہے، یہ نوکرانیاں گالیاں کھا کر، ڈانٹ سن کر، مار اور ظلم سہہ کر بھی پھر یہیں کیوں رہتی ہیں۔ یہ حویلیاں چھوڑ کر چلی کیوں نہیں جاتیں۔؟

یہ سامنے والے محل میں جو نواب صاحب رہتے ہیں ہمیشہ اپنے پاؤں نوکرانیوں سے ہی دبواتے ہیں۔ مگر بہت اچھے آدمی معلوم ہوتے ہیں —— اپنے بڑے پن اور اور شان و شوکت کو بھی نہیں دیکھتے، اور نوکرانیوں سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ انہیں گلے تک لگا لیتے ہیں۔ کئی بار میں نے دیکھا ہے کہ محبت کے مارے اُن کے گالوں کو بھی چوم رہے ہیں۔

ایک نواب صاحب سفید محل والے البتہ مجھے اچھے نہیں لگتے۔ نوکر نے جوتا لانے میں دیر کر دی تو اُسے اسی جوتے سے اتنا مارا کہ اس کی ہڈی پسلی توڑ کر رکھ دی۔ اتنے خراب تو مجھے وہ نواب صاحب بھی نہیں لگتے، جنہوں نے ایک خادم پر غصہ ہو کر باورچی خانے سے پسی مرچ منگوا کر اس کی آنکھوں میں بطور سُرمہ لگوا دی۔

ایک نواب صاحب بہت اچھے ہیں، وہ جب اپنی بڑی سی بگھی میں بیٹھ کر محل سے باہر جاتے ہیں تو اپنے بچوں کے ساتھ نوکر خانے کی پوری فوج کو بھی بٹھا لیتے ہیں اور گھما پھرا کر لاتے ہیں، تو اپنے اور نوکروں کے، سب کے بچوں کے ہاتھوں میں ایک

سے کھیلنے نہ ہوتے ہیں۔

ایک بیگم صاحبہ بہت بُری لگتی ہیں —— یہ عجیب قاعدہ میں نے اس حیدرآباد دکن میں ہی دیکھا۔ ہمارے شہر امراؤتی میں تو ایسا نہیں ہوتا تھا کہ بچہ تو بیگم صاحبہ کا اور دودھ پلائے بے چاری نوکرانی! اب اُس کا اپنا بچہ پڑا رو رہا ہے تو کوئی بات ہی نہیں —— کوئی اُسے اُٹھاتا بہلاتا نہیں۔ خود ماں بھی اُسے ہاتھ نہیں لگاتی، بس مُڑ مُڑ کر دیکھے جاتی ہے —— یہ بیگم صاحبہ اور وہ نوکرماں دونوں ہی مجھے پسند نہیں آتیں۔

اب یہ سارے محل، ان کے مکیں، ان کے روز مرہ کے معمولات دیکھتے دیکھتے ہی اُوب چکی ہوں اور پھر جادوئی محل کی اس شہزادی کی طرح جسے جادوگرنی سارے کمروں میں جانے کی اجازت دے کر بس ایک کمرے میں نہ جھانکنے کی ہدایت کرکے سو جاتی ہے اور شہزادی ہے کہ بس اسی دُھن میں مَری جاتی ہے کہ آخر اس کمرے میں کیا ہوگا۔ اور آخر اس کمرے کو کھول ہی لیتی ہے —— میں نے بھی ایک دن ہمّت باندھ کر شادی خانے والا دروازہ کھول ہی لیا۔

سنگِ مرمر کے بنے ہوئے اس شاندار کمرے میں ایک بے حد بڑا اور نرم قالین اِس کونے سے لے کر اُس کونے تک بچھا ہوا تھا۔ بیچ میں ایک چھپّر کھٹ پڑا ہوا تھا، جس کے پائے سونے کے تھے —— برابر میں ایک ہاتھی دانت کا بے حد قیمتی صوفہ سیٹ تھا، جس پر اعلیٰ مخمل کے چھوٹے چھوٹے تکیے رکھے ہوئے تھے —— قدِ آدم آئینے دو دیواروں میں فٹ تھے۔ چھت پر ایسا شاندار اور روشن فانوس آویزاں تھا کہ ایک بار اوپر نگاہ اُٹھ جائے تو اس کی خوب صورتی سے دل بھرے نہ نگاہ پھر نیچی ہو۔ ایک طرف الماری تھی جس کے دونوں پٹ کھُلے ہوئے تھے۔ اس میں ایسے ایسے قیمتی کپڑے لٹکے رہتے تھے جو تصور کی آنکھوں سے بھی میں نے پہلے نہ دیکھے

ہوں گے۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر جالی دار حسین ترین پردے تھے جو ہوا کے ہلکوروں سے دور دور اڑ کر جاتے۔ اور پھر سہم جاتے، ٹھٹھک جاتے —— زعفرانی رنگ کی بہتات تھی —— قالین، پردے، صوفے کے غلاف، دیواروں کی ہلکی رنگت، ہر چیز جیسے ہنس رہی تھی۔

"ہا!" ایک سحرزدہ سی آواز آپ ہی آپ میرے موہنہ سے نکلی —— اور اس آواز پر اس لڑکی نے پلٹ کر مجھے دیکھا جو پلنگ پرے نیچے پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی، جس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ میری طرف دیکھ کر پہلے تو وہ کچھ حیرت زدہ سی ہوئی، اس کے بعد ایک بڑی پیاری، محبت بھری اور شرمیلی سی معصوم مسکراہٹ اس کے چہرے پر بکھر گئی۔ وہ اٹھی اور میری طرف بڑھی اور میں نئے سرے سے حیرت میں ڈوب گئی۔

سنہرے بالوں کا ایک اُمنڈتا ہوا سمندر تھا جو نیچے جا کر زمین سے مل گیا تھا۔ جب تک کہ میں جی بھر کے اس کے حسین بالوں کو دیکھتی۔ وہ میری طرف موہنہ کر کے کھڑی ہو چکی تھی۔ اب جو وہ کھڑی ہوئی تو مجھے احساس ہوا کہ شاید یہ وہی کوئی پری ہے جس کی کہانیاں میں پڑھتی اور سنتی رہتی ہوں۔ (یہ میرے بچپن کا ایک احساس تھا، لیکن اتنے سال گزر جانے پر آج بھی میں سوچتی ہوں تو اس حسین عورت کے لئے روایتی پری سے موزوں کوئی نام مجھے سجھائی نہیں دیتا۔)

مجھے ڈرا سہما دیکھ کر وہ آگے بڑھی، اور بڑے پیار سے پوچھنے لگی۔" تم مہاجرہ بچی ہے نا؟"

میں نے 'ہاں' میں سر ہلایا تو وہ رحم اور خوشی کے ملے جلے جذبات سے مغلوب ہو کر آگے بڑھی اور میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر بولی" تم نے اپنا نام نئیں بتائے میرے کو۔"

میں ذرا شرما کر بولی "واجدہ بیگم۔"

وہ ہنسی ــــ "اے ماں یہ تو بہوت بڑا نام ہے ــــ میں تو خالی وجو ماں بولی تو بُرا مانیں گے کیا تم؟"

"جی نہیں ــــ میری ایک سہیلی بھی مجھے وجو ہی بولتی ہے۔" میں نے ذرا بے تکلفی سے کہا۔

"پن میں تو وجو ماں بولوں گی کیوں کہ میں تم سے بڑی ہوں نا؟"

میں نے اس کی بات کے جواب میں وہ بات کہہ دی جو بڑی دیر سے میرے دل میں تڑپ رہی تھی۔

"آپ بہت خوب صورت ہیں ــــ میری اتنی عمر ہو گئی ہے، میں نے آپ جیسی خوب صورت کوئی لڑکی نہیں دیکھی۔"

وہ زور سے ہنسی ــــ "اَئی ماں میں مَر گئی جی۔ اُنے تم کیا مور تمہاری عمر کیا۔ کتے برس کے تے؟"

"بارہ کی تو ہو بھی گئی ہیں۔"

"کون سی کلاس میں پڑھتے تم؟"

"نویں کلاس میں۔"

"اللہ!" وہ حیرت سے بولی۔ "بارہ برس کی بچی اور نویں میں! جھوٹی کہیں کی!"

"میں جھوٹ بات نہیں کیا کرتی ــــ میں تین سال کی تھی تب ہی بڑی بہن کے ساتھ نانی اماں نے اسکول میں پہلی میں داخل کرا دیا تھا اور دیکھئے میں پاس بھی ہوتی چلی گئی۔"

"نانی اماں کیوں ــــ امّی کاں ہیں تمہارے؟"

"وہ تو مر گئیں۔"

"کب؟"

"جب میں ایک سال کی تھی۔"

"چچ چچ چچ ـــــ" اس لڑکی نے بے حد افسوس سے کہا اور اس کی آنکھیں ایک دم گیلی ہو گئیں۔

"میں تمہاری نانی اماں سے ملنے کو آؤں گی ـــ لے کو چلیں گے نا تم؟"

"آپ؟" میں حیرت سے بولی۔ "آپ لوگ تو نواب لوگ ہیں نا؟ اور نواب لوگ تو ہر ایک کے گھر نہیں جایا کرتے۔"

"نہیں نہیں میں تمہارے گھر کو ضرور آؤں گی ـــــ کتی دُور پو ہے تمہارا گھر؟"

میں نے ذرا ڈر کر کہا "یہ آپ کی اس آخری دیوار والا دروازہ جس جگہ کھلتا ہے نا، وہیں سے ہمارا گھر شروع ہوتا ہے۔"

"اللہ!" وہ ذرا دُکھ سے بولی۔ "تم لوگاں تو بے چارے ہمارے گودام میں رہتے، مطلب ـــــ"

"گودام کیا ہوتا ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"گودام؟ جہاں گھر کا فضول سامان رکھتے۔"

میں نے جو جواب دیا تھا وہ مجھے آج تک یاد ہے "ہم لوگ بھی تو فضول سامان ہی ہیں نا؟"

"ایسا نکو بولو، بی بی ـــ" اس لڑکی نے اپنا دردمند اور محبت بھرا ہاتھ میرے موہنہ پر رکھ دیا۔ "انساناں انساناں سب برابر ہیں۔ اگر تم لوگاں فضول... ساماں ہوتے، تو ہم لوگاں بھی وئی اچ ہوتے۔ ایسے یاتاں اتے چھوٹے بچیاں نئیں کرنا، اچھا نئیں لگتا ـــ"، اس نے مجھے گلے لگا لیا تو میں بھی لپٹ گئی۔

"آپ کا نام ؟"

"رفیحہ بانو (رفیقہ بانو) مگر حویلی کے سب چھوٹے بچے میرے کو رفو باجی بولتے۔ تمے بھی ایسا چ بولنا ——"

"جی اچھا ——"

رفو باجی کو میں نے کبھی اسکول جاتے نہ دیکھا —— گھر پر ہی انہیں ہر قسم کی تعلیم ملتی تھی۔ قرآن شریف پڑھانے پہلے کوئی اُستانی ماں آیا کرتی تھیں۔ یہ انہوں نے ہی مجھے بتایا تھا۔ کیوں کہ جب میں اُن سے ملی تھی تو اُس وقت تو انہیں قرآن شریف ختم کئے مدت ہو چکی تھی۔ میرے سامنے صرف انگلش پڑھانے والے ایک ماسٹر آیا کرتے تھے۔ ان کی انا بی جو پوری حویلی میں مغلانی اماں مشہور تھیں۔ جب تک وہ پڑھتیں ان کے ساتھ لگی بیٹھی رہتیں —— وہ پانچوں وقت کی نماز پڑھتی تھیں۔ ان ہی دنوں مجھے خود بھی اسکول میں داخلہ مل گیا۔ میں دن بھر ان کے ساتھ تو رہتی نہ تھی۔ مگر جب بھی ملاقات ہوتی تو وہ دن بھر کی جو بھی مصروفیات بتاتیں، ان میں نمازوں کا ذکر ضرور آتا۔ مجھے خود آٹھ برس کی عمر سے نانی اماں نے نماز سکھا دی تھی، اور میں بڑی پابندی سے نماز پڑھتی تھی۔ وہ بڑی خوش ہوتیں۔ ایک دن کہنے لگیں " وجو ماں نماز تو تم کو آتی، پر اپنے مذہب کے ہور بھی باتاں ہیں۔ مسئلے مسائل ہیں، وہ سوب بھی تم کو آنا ہونا میں تم کو "بہشتی زیور" پڑھنے کو دیوں گی —— جہاں جہاں کچھ سمجھ میں نئیں آیا —— میرے کو پوچھ لینا ——"

میں کہہ نہیں سکتی رفو باجی نے مجھے مذہبی طور پر کس قدر مکمل کیا —— لیکن میں ان کی احسان مند ضرور ہوں۔

پھر زوالِ حیدر آباد کا دردناک المیہ —— نوابوں کی تباہ حالی —— ان کی مالی

پریشانیاں، خاندانی مراسم کی بنا پر ظہیر یار جنگ نے اپنی لمبی چوڑی کوٹھی مہمان داری کے لئے وقف کردی، لیکن حالات بگڑے اور ان ہی کے سگے سوتیلے بھائی بندوں نے اپنے اپنے حقوق کے دعوے کر دئے تو مہاجروں کو اس کوٹھی کو چھوڑنا پڑا ـــــ مجھے کم از کم کوئی غم نہ ہوا، اس لئے کہ ہمارا گھر تھا ہی کون سا بڑا حسین ؟ مجھے تو اُلٹا دوسروں کی شان دار حویلیاں دیکھ دیکھ کر غصّہ آتا تھا۔

وہ کوٹھی چھوڑنے کے بعد بنجارہ ہلز پر اتفاق سے ایسا خوب صورت کاٹیج جیسا گھر ملا کہ پھر تو اس گودام کے یاد آنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ہاں البتہ رفو باجی بہت یاد آتی تھیں ـــــ وہ پیار بھی تو بے حد کرتی تھیں نا۔ ان کے بابا یعنی بڑے نواب صاحب اور امنی جان، غریبوں کو کوئی خاص لفٹ نہیں دیتے تھے۔ یہ بات رفو باجی بھی جانتی تھیں۔ اس لئے وہ موقع کبھی آنے بھی نہیں دیتی تھیں کہ ان کی موجودگی میں مجھے بلائیں یا پیار کریں۔ ویسے ان کا اپنا شاہی کمرہ خود ہی ایک الگ تھلگ سی دُنیا تھا، جہاں کسی کو بھی داخل ہونے سے پہلے مغلائی اماں کی اجازت لینا پڑتی تھی۔ ہاں بس دو تین مخصوص کنیزیں ضرور ایسے ہی چلی آتیں۔ ان کے بال بے حد بڑے تھے نا اس لئے وہ کنگھی نہیں کر سکتی تھیں۔ ایک کنیز آ کر اُن کے بال سُلجھا کر جاتی تھی، ایک دوسری کنیز نہلا کر جاتی تھی۔ پھر دن بھر میں تین چار جوڑے وہ ضرور بدلتی تھیں۔ ایک جوڑا گھنٹہ بھر ہی پہن لیتیں تو وہ فوراً احاطہ میں رہنے والی دھوبن کے ہاں پہنچا دیا جاتا۔ دوپٹوں میں کلف اور ابرق لگا کر چُنے جاتے۔ مغلائی اماں گوٹے ٹپے ٹانکتی رہتیں، ایک درزن اماں بس انہیں کے کپڑے سینے پر مامور تھیں۔ اللہ جانے کتنے کپڑے جہیز بھر میں سلتے ہوں گے۔ نماز کے دوپٹے کلف اور گوٹے کے بغیر ہوتے کہ "گردن میں کلف چبھتا ہے۔ باریک نفیس ململ کے دوپٹے کی بُکل مارے وہ بڑے خشوع و خضوع سے نماز پڑھتیں اور ہمیشہ مجھے بھی تاکید کرتیں کہ " وجو ماں، خدا سے دُعا مانگا کرو کہ وہ ہمیں

صراط المستقیم پر چلائے"۔

اور اب یہ وہی رفو باجی تھیں جو کبھی ہوٹ پینٹ، کبھی جینیز، کبھی بیل باٹم، کبھی اوپن شرٹ میں نظر آتیں، اور بیچ پر جاتے وقت محض بکنی پر اکتفا کرتیں۔

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

"لندن سے میں پارسا آئی تھی۔ پن یہ امریکہ میرے کو تباہ کر ڈالا ——"

اُن کی آواز میں کرب تھا۔ "مجھے خدا سے کوئی گلہ نہیں، کوئی شکایت نہیں، میں آپ اچ بھٹکی۔ خدا کو کائے کو قصوروار ٹھیراؤں؟"

وہ اور میں "سی شور" پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بغیر کسی جھجک کے مجھے سنا رہی تھیں ——

"اصل میں اتنے عیش و آرام کر کو بیٹھے تھے اس راستے کے سوا کوئی دوسرا راستہ سوجھا اچ نہیں۔ تم لوگاں کو کٹی سے گئے۔ اس کے بعد بھایاں بھابیاں آپس میں ایسا لڑے ایسا لڑے کہ بس خون خرابے ہونا باقی رہ گیا —— غموں، فکروں سے بابا کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ اکیلی امّی جان ہور میں —— میری شادی خاندان میں اچ طے تھی، پھر جب جاگیرداری ختم ہو گئی تو سب سمجھ گئے کہ اب سسرال سے ملیں گا بھی کیا —— اُنوں بغیر کچھ بتائے کرے، پاکستان چلے گئیں۔ یہ صدمہ ایسا تھا کہ میں تو زندہ رہ گئی، پر امّی جان زہر کھا کو مر گئے۔ اب سوچو کیسی زندگی ہو گئی؟ اِتا پڑھے نہیں تھے کہ نوکری کرتے۔ اور نوکری کی عادت بھی یاں کس کو ہوتی؟ اُن ہی دنوں چچا لندن کو جارئے تھے۔ معلوم نہیں کیسا کر کے ترس آ گیا تو اپنے بیٹیاں کے ساتھ میرے کو بھی لے کو لندن آ گئے۔ اب میں کیسا کیا کر کے، تیرے کو یہ باتاں بتاؤں وجّو ماں —— چچا وطن چھوڑ کر اسی واسطے پاکستان نہیں جا کو لندن آ گئے تھے کہ ہم سب چھوکریاں کو ڈھیلی ڈور چھوڑ دینا۔ انگلش تو ہم سوب کو

آتی تھی۔ مہماناں آتے تو ہم سب بہناں خاطر تواضع کرتے۔ کوئی کوئی آدمی کوئی اوچھی حرکت کرتا تو ہم چچا کو بولتے تو انوں صفا ٹال جاتے۔ ایک دِن مَیں خود اپنے کانوں سے سُنی۔ انوں چچی جان سے کہہ رہے تھے۔ "حیدرآباد یا پاکستان میں رہ کو اپنی بیٹیاں سے غلط کام کراتے تو موتہہ دِکھانے کو جگہ نہ رہتی۔ یاں پردیس میں کون دیکھنے چلا؟ اچھا ہے ان آنے جانے والوں میں سے کوئی بیٹی منگ لیا تو ٹھیک نئیں تو جو ہور یا وہ ہونے دیو۔"

مگر دل بہلانے کو روزانا ہور بات ہے۔ ہور کسی کو عمر بھر کے واسطے گلے کا ہار بنا لینا ہور بات ہے۔ کسی نے پیغام نئیں دیا —— لندن کی ہائی سوسائٹی میں یہ بات کوئی خاص تھی بھی نئیں بس چلتا ہے۔ پن مَیں کیا بتاؤں میرے دِل میں کیسے کیسے اُبالاں اُٹھتے تھے۔ مَیں سات پردوں میں رہنے والی، نماز روزہ، حدیثاں جانی بوجھی، کیسے یہ اندھیر کرتی؟ مَیں اپنے تھوڑے بہوت جو بھی قیمتی زیوراں تھے، ایک پہچان والے کو بیچ کو ایک ہور جانے والوں کے ساتھ امریکہ چلی آئی۔ یہاں آکر مَیں وہ سب کام کرڈالی جس کو سوچتے بھی شرم آتی تھی۔ پیٹ کی آگ بھوت بُری ہوتی و جیّ ماں، ہور ہم جیسے لوگاں تو بھُوکے بھی رہ سکتے اِچ نئیں۔ ہور کام تو خیر کر سکتے اِچ نئیں —— عورت ذات کے اُوپر اللہ میاں کی یہ مہربانی اِچ سمجھو کہ وہ بے حد غریب ہو کے ایک طرح سے "صاحبِ جائداد" ہوتی —— مَیں تو، تو جانتی۔ دیکھنے دِکھانے میں بُری نئیں تھی —— یہاں لوگاں میرے پو ٹوٹ کر گرے۔ میرے کو پھر پیسے کی ریل پیل ہو گئی۔ مگر دِل کو سکون نئیں تھا، یہی سوچ آتا کہ کوئی پہچان والا مِل گیا تو۔ پھر مَیں اپنے لمبے لمبے بالاں کٹا دی اَور کانٹیکٹ لینس" استعمال کرنے لگی۔ اب کوئی بھُولے سے بھی نئیں پہچان سکتا تھا کہ مَیں انڈین یا حیدرآبادی ہوں۔ سالاں سال یہاں رہ کو انگلش بھی ایسی آگئی جیسے یہیں پیدا ہوئی ہوں گی ہور چالے بھی ایسے سیکھ گئی جو سب ہی امریکی چھوکریاں کرتے۔

ہور امریکہ کا ماحول ایسا تھا کہ لاکھ اپنے کو بچا کر رکھنا چاہتی تو بھی نہ رکھ سکتی تھی —— تو ویکھی یا نئیں میرے کو نئیں معلوم —— مگر ننگے آنگ سے سڑکوں پر لڑکوں لڑکیوں کا گھومنا، بیچ پر بُرے بُرے حرکتاں کرنا —— شادی سے پہلے بچے پیدا کرلینا —— کھلے راستے میں چلتے چلتے ایک دوسرے کے پیاراں لینا، یہاں کوئی بات اچ نئیں —— میں یہاں کتے لوگاں ایسے بھی دیکھی کہ رشتوں کی کوئی خدر نہیں —— ماموں بھانجی، چچا بھتیجی، ایک دوسرے سے بدنام۔ یہ تو جانے دیو، سگے بھایاں بہناں، آپس میں کبھی کبھی ناجائز رشتے قائم کرلیتے۔ ہور یہ امریکہ سب کو گلے لگا لیتا ہے۔"

وہ کچھ دیر رُکیں، ایک لمبی سسکی سی لی، پھر کہنے لگیں "میرے پر کیا گزری، کیا بولوں —— امریکہ میرے کو ننگا کردیا۔ کیا میں حیدرآباد میں رہتی تو عصمت نئیں بچتی —— یہ اکثر میں اپنے دل سے پوچھتی رہتی۔ پن اتا بولتیوں کہ اتی گر نئیں جاتی — ایسے ایسے کاماں یہاں میرے لئے ہوئے کہ اب کیا بتاؤں۔ یہاں لوگاں بہوت سارے گناہ کر ڈالتے تو چرچ میں جا کر پادری کے سامنے اعتراف کرتے ہور ایسا سمجھتے کہ اب سارے گناہ معاف ہوگئیں۔ میں بھی آج یہ سمجھ کر تیرے کو یہ ساری باتاں سُنا رئی جیسے میرے گناہ معاف ہوجائیں گے —— میں یہاں کیا نئیں کری —— ایک ایک رات میں دو دو بھایاں کے ساتھ آگے پیچھے —— سوئی۔ ناجائز حمل گرائی کی بچے کچے پیدا ہوگئے۔ تو کون بچوں والی کو ڈالر دیں گے۔ ڈالر کے واسطے تو یہ امریکہ دیوانہ ہے۔ یہاں نہ محبت کی خدر ہے نہ انسانی رشتوں کی۔ بس جو ہے سو ڈالر —— اس نگری میں گناہ کرتے کرتے گناہوں کی ایسی عادی ہو جاتی کہ انسان بجائے شرمندگی محسوس کرنے کے اس کا عادی ہو جاتا۔ میں کتا کتا بچنے کی کوشش کری، مگر پانی میں اُتر کر سوکھے رہنا بولے تو ناممکن ہے۔ یہ پانی میرے کو ایسا گیلا کرا کہ دُنیا نے میرا پور پور دیکھ لی۔ پھر بیچ میں کئی لوگاں کینیڈا آئے آکو تبلائے کہ نوا نوا شہر سستا ہوتا تو میں بھی یہاں آگئی۔"

"رفو باجی ــــ" میں نے بڑے دکھ کے ساتھ پوچھا "اس زندگی سے آپ اکتائیں نہیں ؟"

"اکتائی تو کیا ہور نہیں اکتائی تو کیا - اچھے برے سب کاموں کا انسان عادی ہوجاتا ماں ــــ بس ایک اچ خیال جان کو مارڈالتا کہ بڑھاپے میں کیا ہوئیں گا - یہ اجاڑ مارے ملک میں تو بڈھیوں کو کوئی پوچھنے والا نئیں - اولاد تک نئیں پوچھتی تو غیر کیا پوچھیں گے ــــ جب تک جسم چل رہا ہے ، میں بھی چل رئی ہوں - یہاں پو ایک ریسٹورنٹ ہے MYNAH BIRD تو گئی کہ نئیں ــــ وہاں جتنے بھی کام کرنے والے لڑکیاں ہیں سب ایک دم ننگے رہتے ہیں - میں وہاں کام مل رہا تھا، پر نئیں کری - بات تو ایچ ہے - گھر میں بھی ننگے رہو ، باہر بھی ننگے ، تو اپنے گھر میں اچ کیوں مت رہو ؟"

میں نے لرز کر انہیں دیکھا ــــ وہ بڑی کرب ناک سی ہنسی ہنسنے لگیں ــــ "بتا میں تجھ سے چھپتی پھر رئی تھی تو ٹھیک کری تھی کہ نئیں ؟ میں تو کبھی ماں کو نہ دیتی ، بھلے تو کتا بھی پکارتی کہ ہاں میں اچ تیری رفو باجی ہوں - پر تو واپس جارئی بول کے میں ڈھیر ہوگئی - کس کو معلوم زندگی اب ہور بھی کیا کیا ظلم ڈھاتے - میں سوچتی تیرے سے اب مل اچ لیوں - بس ایک اچ خیال ملنے سے روکتا تھا کہ تو میرے پر کہانی لکھ ڈالیں گی - میں تیرے کو واجدہ بیگم کے نام سے پہچانتی تھی - تبسم شاید تو نے بڑی ہوئے بعد بڑھا لی - تیرے کوئی کوئی کہانیاں میں پڑھتی تھی - پر اچھے سے یقین نئیں تھا کہ یہ تو اچ ہوئیں گی - پر جب حیدرآباد کے متعلق تو لکھنا شروع کردی تو میں ایک دم سمجھ گئی کہ نئیں یہ تو اچ ہے ــــ"

"میں آپ پر کوئی کہانی نہ لکھوں گی رفو باجی ــــ" میں نے دکھ سے بوجھل دل سے کہا -

"لکھ بھی دی تو کیا فرق پڑجائیں گا ؟ ایسے تو کتے ہزاروں بدنصیب لوگاں

دُنیا میں پڑے ہیں۔ ہم جیسے لڑکیاں تو آج تو کہانیوں کے ہیروئناں بنتے!" اک دم وہ رُکیں۔ "تو شاید ہنس رئی ہو گی کہ عمر میں تُجھ سے بھی سات آٹھ سال کی بڑی ہو کر، میں خود کو ابھی تک لڑکی بول رئی ——" وہ دُکھ بھری ہنسی ہنسیں۔ "اپنے اس جسم کو سنبھال سنبھال کر رکھنے کے واسطے میں لمبے لمبے فاقے کرتی۔ بھُوکی رہتی۔ رسیاں کُودتی، پر پیٹ بھر کو کھائیں سکتی کہ موٹی ہو گئی بوڑھی ہو گئی تو پھر کون میرے کو پوچھیں گا؟ تیرے کو حیرت ہو گی، پینتالیس سال میری عمر ہو گئی، ابھی تک کتے لوگاں میرے کو پچیس کی سمجھتے ——" پھر وہ عجیب دُکھ بھرے لہجے میں بولیں۔ "سمجھنے کو پچیس چھوڑ پندرہ کی بھی سمجھے، حقیقت تو اپنی جگہ پر ہے ——"

"رفو باجی، آپ ویسے بھی دیکھنے میں اتنی کم سِن لگتی ہیں۔ شادی کر لیجئے باقی زندگی تو سکھ سے گزر جائے ——"

"اِدھر کے مُلکوں میں شادی کیا ہور طلاق کیا۔ ایسی شادی کا فائدہ ہے کچھ۔؟ رہی بات اپنے لوگاں میں سے —— مطلب پاکستان یا ہندوستان کے کسی آدمی سے شادی کرنے کی، تو دِل بولتا، اپنے والوں کو دھوکا نکو دیو —— کبھی کبھی دِل بولتا گاڑی کے نیچے آ کر جان دے دیوں۔ ایک دو دفعے بیزار آ کو اتی تیز ڈرائیونگ کری کہ اب مری کہ اب مری، پر کچھ نئیں ہوا۔ جتنے دِن جینا ہے سو ہے —— ایک بات رہ رہ کر سوچتی ہوں کہ میں ایسے کیا گُناہ کری تھی کہ جس کی سزا میں اللہ میاں میرے کو ایسی زندگی دے ڈالے۔ یہ سوال ایسا ہے کہ آج تک اس کا جواب میرے کو نئیں ملا۔"

شام گہری سانولی ہو چکی تھی، میں نے چپلیں اُتار کر اپنے پیر سمندر میں ڈالنے چاہے تو پانی کی ٹھنڈک نے جیسے کاٹ لیا ہو —— رفو باجی نے اپنے پیر پانی میں ڈال کر مجھے دیکھا "میں تو ہر قسم کے سرد و گرم کی عادی ہو چکی ہوں۔"

میں کچھ نہ بولی —— بے بسی سے انہیں دیکھتی رہی ——۔

رفو باجی —— بہت دیر بعد میں بڑی مشکل سے کہہ سکی ۔

"آپ میرا ایک گناہ معاف کریں گی —— ؟"

وہ سوالیہ انداز میں مجھے دیکھنے لگیں ۔ میں نے کہا "میں نے ایک دفعہ یہاں آپ کے متعلق ایک گستاخی اور بے ادبی کی ہے ۔ میں آپ کو پہچان تو گئی تھی، مگر یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ آپ رفو باجی ہی ہیں ۔ یہاں سب آپ کو امریکن سمجھتے ہیں ۔ میں نے ایک بار کہا کہ " پیچھے سے کوئی جا کر آپ کو کُتیا کہے تو آپ جواباً اردو میں گالی دیں گی یہ بات آپ کو معلوم نہیں تھی، لیکن آج میں خود ہی سُنا کر آپ سے معافی مانگ رہی ہوں ۔

وہ مسکرائیں —— "کُتیا ؟ میں تو خود کو اتنا ذلیل سمجھتی ہوں کہ کُتیا تو بہت اعلیٰ چیز ہو گئی ۔ تو میرے اُوپر ایک کہانی ایسی لکھ جس میں میرے کو خوب گالیاں دے ۔ میرے جسم میں خوب کیڑے ڈال تو شاید میرے دل کو ذرا تو بھی تسلی ہوئیں گی ۔"

" رفو باجی پلیز، آپ ایسی باتیں نہ کیجئے —— آپ کا دل تو بے حد خوب صورت اور معصوم ہے —— آپ اتنی پریشان رہتی ہیں تو نماز پڑھنا شروع کر دیجئے —— "

وہ ندامت سے ہنسیں —— " نماز میں تو خدا سے اتی شرمندہ ہوں کہ یہی سوچ ہوتا ہے کہ اس سے مَر کو کیسا سامنا کروں گی —— اب میرے سامنے کوئی اچ راستہ نہیں ۔

ان کا چہرہ جیسے سیاہیوں میں ڈوب گیا ۔

میں ۱۹۷۲ میں امریکہ اور کینیڈا گئی تھی ۔ تین چار مہینے رہ کر واپس ہندوستان آ گئی تھی ۔ بہن بھائیوں، بھابیوں سے خط و کتابت ہوتی رہتی ہے ۔ ابھی تھوڑے دن پہلے افروز کا خط آیا ہے جس میں اس نے برسبیلِ تذکرہ یہ اطلاع بھی دی ہے : " اپیا

تجھے شاید یاد ہوگا کہ یہاں پارٹیز میں ایک امریکن لڑکی رازیکا اکثر آیا کرتی تھی (جسے تو خواہ مخواہ حیدرآبادی سمجھتی تھی) چند روز پہلے اس بے چاری کا انتقال ہوگیا —— کسی گاڑی کے نیچے آ گئی تھی —— پتہ نہیں یہ حادثہ آخر ہوا کیسے؟ یہاں سب نے اُس کی موت کو بہت محسوس کیا —— بڑی باغ و بہار لڑکی تھی۔ تجھے اُس لئے لکھ رہی ہوں کہ تو بھی اس سے کئی بار مل چکی تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ممکن ہے اس نے خودکشی کی ہو، مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی بھلا اسے کیا غم تھا جو خودکشی کرتی؟"

**رفو باجی** —— میں آج یہ ساری پرانی یادیں دُہرا کر آپ کی رُوح کو دُکھ تو نہیں دے رہی ہوں؟

# پیٹ

سہاگ رات کس قدر گرم تھی !

حالاں کہ اس کی شادی جاڑوں کے ٹھنڈے ٹھنڈے برف سے دِنوں میں ہوئی تھی ــــــ

سُرخ سُرخ کپڑوں میں لپٹی اس کی دُلہن جیسے انگیٹھی دہک رہی ہو ــــ لیکن انگیٹھی تو کبھی نہ کبھی سَرد پڑ جاتی ہے ــــ اس کی دُلہن تو سدا بہار آگ تھی ۔

دوستوں کا سکھایا پڑھایا قطعاً کام نہ آیا ۔ مدتوں تو وہ یوں ہی دُلہن کو یک ٹک دیکھے گیا ۔ ساری گھبراہٹ یہ تھی کہ کانچ کی اس مورتی کو دیکھتے دیکھتے ہی رات صبح سے نہ بدل جائے ۔ لیکن دیکھنے سے جی بھرتا تب ہی تو وہ ہاتھ پاؤں ہلاتا ــــ یہاں تو مرنے والے کی طرح جسم کا سارا دَم دو آنکھوں میں آکر اٹک گیا تھا ۔

آنکھوں کا دِل تو بھرنے سے رہا ــــ اُس نے ایک ترکیب سوچی "آنکھیں بند کر لوں ــــ ؟ وہ مسکرایا ، پھر اُس نے آنکھیں بند کر لیں ، اور نرم نرم گڑیا کو

بانہوں میں بھر لیا۔

وہ پاگلوں کی طرح بکھر رہا تھا۔

"میں تمہاری دھجی دھجی اُڑا دوں گا ۔۔۔" ہلکی ہلکی کسمساہٹ اور شرم کے ساتھ دُلہن "نہیں نہیں" کہتی جا رہی تھی، لیکن انداز حیا میں ایک سپردگی تھی ۔۔۔

"پلیز ۔۔۔ پلیز ۔۔۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا موںھ، اپنا سراپا چھپا چھپا لیتی۔ لیکن وہ اپنی طاقت کے بل پر اس کے ہاتھوں کے پیالے میں سے چہرے کا پھول اپنے ہونٹوں کے قریب لے آتا ۔۔۔

وہی التجا ۔۔۔

پلیز ۔۔۔ پلیز ۔۔۔

"پلیز نہ پلیز ۔۔۔" وہ وحشی ہوا جا رہا تھا۔ "پھر تم اتنی حسین کیوں ہوئیں؟"

اور وہ سہاگ رات والی بے قراری آج چھ سال گزرنے پر بھی اسی طرح قائم تھی۔ اور وہ دیوانہ کر دینے والا حسن دو بچوں کو جنم دینے پر آج بھی اسی طرح قائم تھا۔

وہ دونوں جب کبھی گھومنے پھرنے جاتے محمود ہمیشہ ساتھ میں ایک تیز دھار والا چاقو اپنے ساتھ لئے رہتا۔ پہلے پہل اس نے گھبرا کر پوچھا تھا۔

"یہ ۔۔۔ یہ اتنا بڑا اور تیز چاقو ۔۔۔ یہ پھینک دیجئے ۔۔۔ مجھے اس سے ڈر لگتا ہے، آخر اس کا مصرف کیا ہے ۔۔۔!"

"مصرف ۔۔۔؟" وہ خوش دلی سے ہنسا تھا ۔۔۔ "ارے بابا میں کوئی ایسا غنڈہ نہیں ہوں جو چاقو چھرے اپنے ساتھ لئے گھومتا رہوں۔ لیکن جانِ من تم اس قدر حسین ہو اور اتنی عزیز ہو کہ میں برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی اور تمہیں نظر بھر کے بھی

دیکھ لے ــــــ"

وہ ہنسی ــــــ "ارے واہ ــــــ سڑک پر بغیر پردے کے چلیں گے تو کبھی نہ کبھی کسی کی نگاہ تو پڑے گی ہی ــــــ"

"نہیں ــــــ" وہ بُری طرح چیخا تھا ــــــ پھر وہ اپنے لہجے کی تیزی پر وزرا شرمندہ ہو کر بولا ــــــ "معاف کرنا میری چاند ــــــ میری ثریا ــــــ اس معاملے میں میں بڑا قدامت پرست اور حاسد ہوں۔ جو تمہیں بُری نظر سے دیکھے گا وہ سیدھا اللہ میاں کے پاس پہنچ جائے گا . . . . . ."

یہ سارا محبت کا کھیل تھا۔ لیکن ثریا نے سہم کر سوچا ــــــ

"اللہ نہ کرے جو کبھی میں بھٹکوں ــــــ"

سہاگ رات کا نشہ ایسا نشہ تھا جو ایک بار چڑھا تو پھر کبھی اُترا ہی نہیں۔ لڑکی دلہن بنتی ہے ــــــ دُلہن سے ماں ــــــ ماں سے عورت ــــــ ماں بن کر کہنے والے کہتے ہیں: عورت اپنا وہ جادو اور جادو کھو دیتی ہے جو مرد کو باندھ کر رکھتا ہے۔ جسم ڈھل جاتا ہے تو مرد کی محبت بھی چاند کی طرح ڈھل جاتی ہے، لیکن ثریا تو جیسے اتنے سارے دنوں سے کسی برف خانے میں بند رہی تھی۔ وہی کسا ہوا جسم ــــــ وہی دلبری کی ادائیں ــــــ وہی بہکا دینے والی معصومیت ــــــ وہی گرما دینے والی شریر آنکھیں ــــــ سنیچر کی رات اپنے دامن میں دیوانگی کے جراثیم لے کر آتی ــــــ "آج میں بادشاہ ہوں ــــــ" محمود فخر نے سینہ پھیلا کر کہا ــــــ "جانتی ہو کہ ــــــ آج سنیچر ہے۔ آج ہماری سُہاگ رات ہے۔ کل اتوار ہے۔ جی بھر کر جاگیں گے اور جی بھر کر سوئیں گے ــــــ"

دل میں خوش ہو کر بظاہر شرما کر ثریا بولتی ــــــ اور جو یہ دو دو رقیب رُوسیاہ ہیں ــــــ؟" اس کا اشارہ بچوں کی طرف ہوتا۔

"افیون کھلا کر سُلادیں گے سالوں کو ــــ" وہ خوش دِلی سے ہنستا ثریا ہنس دیتی ــــ ہنسے ہی جاتی۔

اور رات جب چپکے سے اپنا آنچل پھیلاتی محمود نئے دُولہوں کی سی بے قراری سے بچّوں کے سو جانے کا انتظار کرتا اور جیسے ہی بچے سوتے وہ جھپٹ کر ثریا کو گود میں اٹھا کر بھاگ جاتا۔

دوسرے کمرے میں لا کر وہ اُسے دھیرے سے صوفے پر لٹا دیتا۔ اور جاڑوں کے ٹھنڈے ٹھنڈے برف جیسے دِن گرمیوں کی طرح تپنے لگتے۔

"کہو تم میری ہو ــــ"

اُس کی بے وقوفیوں سے تنگ آ کر وہ بچّوں کی طرح جواب دیے جاتی ــــ

"ہاں بابا، آپ کی ہوں ــــ"

"ہمیشہ میری رہو گی نا؟ ہر حال میں ــــ!"

"سو فی صد ــــ"

"کبھی کسی کی طرف جھکو گی تو نہیں نا ــــ؟"

وہ ہنس دیتی ــــ "میں کبھی سدا تمہارا ہی رہوں گا ــــ"

اور یہ حقیقت تھی کہ ہر حال میں وہ اسی کی تھی ــــ اب جب کہ چند مہینوں سے اس کی نوکری چھوٹ گئی تھی اور دانے دانے کی محتاجی ہو گئی تھی ــــ گھر کا سامان بکنے کی نوبت آ گئی تھی وہ اُسی کی تھی ــــ بے حد صابر اور شاکر۔ نہ ہونٹوں پر فریاد نہ چہرے پر شکایت ــــ کبھی کبھار وہ خود کو گنہ گار محسوس کرتا۔ جب نوکری پرمننٹ نہیں تھی تو مجھے شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ آخر کسی کی آرزوؤں کا گلا گھونٹنے کا اختیار مجھے کس نے دیا تھا ــــ؟ لیکن یہ بھی کسے معلوم تھا کہ ادھر بیچ میں یوں نوکری

چھُٹ جائے گی اور وہ ایم اے کی ڈگری لٹکاتا یوں ہی ٹھلے کھاتا پھرے گا ——"
پھر بھی وہ اُس کی تھی۔
سنیچر کی ہر رات وہ بادشاہ تھا —— ویسے تو بے کاری نے ہر دن کو اتوار بنا دیا تھا لیکن سنیچر کی رات "سہاگ رات" منانے کی جو عادت اُس کی سرشت میں پڑ گئی تھی وہ بہر حال برقرار تھی۔

مرد غریب ہو جائے تو کچھ وہمی سا ہو جاتا ہے، ورنہ کوئی بات نہ تھی جو محمود سوچتا کہ ثریا بدل سی گئی ہے —— اور یہ صرف پندرہ دنوں سے وہ محسوس کر رہا تھا ——

پچھلے سنیچر کو جب اس نے اپنی چاند جیسی چمکیلی اور مصری کی ڈلی جیسی میٹھی دلہن کو بچھونے میں بھرا تو جذبات سے ٹوٹ کر بولا۔
"خدا کی قسم کیا عورت ہو —— نامرد بازو بیٹھ جائے تو مرد ہو جائے۔"
لیکن اتنے بھرپور، تعریف سے لبریز جملے کا ثریا نے کوئی نوٹس ہی نہ لیا۔
چپ چاپ لیٹی رہی۔
ورنہ عورت —— اور بچوں والی عورت، جسے اپنے شباب کے بکھر جانے کا ذرا زیادہ ہی احساس ہوتا ہے، تھوڑی سی تعریف سُن کر کھل ضرور جاتی ہے، مگر وہ تو مسکرائی تک نہیں۔
اس نے پے در پے اُس کے کئی پیار لے ڈالے، تب بھی وہ جیسے اپنے ہی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔
"تم مجھ سے کچھ کترا رہی ہو ثریا ——" اچانک وہ اٹھ کر بیٹھ گیا ——
"اب بکنے کے لائق کوئی سامان نہیں رہا۔ زیور تو سب جا چکا۔ اور راشن بھی

ختم ہو گیا ——"

"لیکن اس وقت اِن بے تکی باتوں کا کیا مقام ہے ۔" وہ جھلا گیا —— یہ عجیب بات ہے کہ مرد جب "سہاگ رات" منانے کے موڈ میں ہو تو پھر اسے کوئی پریشانی یاد نہیں رہتی —— اس نے پھر سے بساط بچھانی چاہی۔ اس کے گلے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا —— سب ٹھیک ہو جائے گا —— آؤ میرے گلے لگ جاؤ ——" لیکن اس نے محسوس کیا کہ اس کی دُلہن کچھ کترا رہی ہے —— چھ سالوں سے جو اندازِ خود سپردگی اس میں رچا ہوا تھا، وہ کہیں کھو سا گیا۔ وہ کچھ ڈری ڈری سی لگ رہی ہے —— شاید حالات سے !!

اس نے بہت منانا چاہا۔ لیکن وہ بیٹھ کے سسکتی ہی رہی۔

وہ بھوکا ہی سو گیا —— نہ جسم کی بھوک مٹی نہ پیٹ کی۔

دوسرے دن وہ حسبِ معمول بشاش تھا۔ اتنی پیاری بیوی سے وہ ناراض رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ باہر جانے لگا تو ثریا لجاجت آمیز لہجے میں بولی :

"شام کو مجھے گھمانے لے چلئے گا !"

وہ اتنے پیار سے فرمائش کر رہی تھی کہ وہ یہ بھی نہ کہہ سکا کہ "میری جیب میں ایک پیسہ تک نہیں ہے۔ تمہیں باہر لے جانے کے لئے ایک روپیہ تو ہو —— بہر حال اس کا دل توڑا نہیں جا سکتا تھا۔ وہ بے حد پیار سے بولا :

"میری جان فرمائش کرے اور میں نا کہوں ! شام کو تیار رہنا —— بچوں کو بھی لے لینا ——"

شام کو وہ گھر آیا تو سب تیار تھے۔ محمود نے بڑے اچنبھے سے دیکھا کہ ثریا

نے آج اپنی شادی والا سُرخ سُرخ جوڑا پہن رکھا ہے۔ اتنے سالوں میں کوئی دوسری عورت ہوتی تو جنے کتنی موٹی ہو جاتی۔ لیکن چھ سالوں کے بعد بھی ثریا کے وہ جوڑا جوں کا توں برابر تھا ــــ اس نے تعریفی انداز سے بیوی کو دیکھا اور چاقو کو ٹٹولا ــــ

"چاقو رکھ لیا ہے نا ــــ؟" ثریا سنجیدگی سے بولی۔

"ایسی بیوی ساتھ ہو تو چاقو رکھنا ہی پڑتا ہے۔" وہ ہنسا۔

"ایسی بیوی کے لئے چاقو رکھنا ہی پڑتا ہے۔" وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑائی پھر زور سے بولی۔

"مگر چلیں گے کہاں ــــ!" "بس کے کرائے بھر کے پیسے بھی تو نہیں ہیں۔" اُس نے جیبیں تھپ تھپائیں ــــ "ہاں پیسہ تو ایک بھی نہیں۔"

"تو پھر یوں کریں کہ سمندر کے کنارے چلتے ہیں۔ پیدل پیدل نکل جائیں گے۔ قریب ہی تو ہے۔"

"ہاں آئیڈیا بُرا نہیں ــــ جگہ اچھی ہے ــــ"

"خودکشی کے لئے زیادہ ہی اچھی ہے ــــ" وہ اپنی دھن میں پتہ نہیں کیا کہہ گئی۔

جب وہ چاروں سمندر کی ٹھنڈی گیلی گیلی ریت پر بیٹھ گئے تو اچانک محمود نے ثریا کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اب مجھے تم سچ سچ بتا دو کہ تمہارے دل میں کیا ہے۔ یہ تمہارا اُکھڑا اُکھڑا رہنا پھر گھر سے چلتے وقت چاقو کے بارے میں پوچھنا ــــ اور پھر یہ کہنا کہ سمندر خودکشی کے لئے اچھی جگہ ہے... تم چاہتی کیا ہو؟ جانِ من مجھے سب کچھ بتا دو ــــ دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا... ..."

ثریا نے سکون کے ساتھ سانس لیا۔

"میں خود اسی لئے آپ کو یہاں لائی ہوں ـــــ تاکہ میں خودکشی کر سکوں یا آپ مجھے چاقو مار کر ہلاک کر دیں ...   ... وہ آنسوؤں پر قابو پانا چاہ رہی تھی، اس لئے رُک رُک کر بول رہی تھی ـــــ " میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ جیسے شوہر کے ساتھ ایسی زیادتی کہاں تک روا ہے کہ جو چھ سالوں کے بعد آج تک بھی اپنی بیوی کو اسی طرح چاہتا ہے جیسے پہلی شب ہو ... ..."

"لیکن تم کچھ بتاؤ گی بھی ... ... محمود انتہائے زیادہ بے چین نظر آ رہا تھا۔

میں ... ... وہ سسکی ... ... میں ابھی سب کچھ بتاتی ہوں ...

..... اور وہ اس طرح سب کچھ کہتی گئی، جیسے چابی بھر دینے پر ریکارڈ بج اُٹھتا ہے ـــــ

" آج سے پندرہ دنوں پہلے کی بات ہے میں نہا کر بالکنی میں بال سکھانے کھڑی تھی۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ بچوں کو میں نے ذرا سی شکر پانی میں گھول کر دودھ کے بہانے پلا کر سُلا دیا تھا ـــــ میں مستقبل کے بارے میں سوچ رہی تھی جب ہمارے پاس بہت سے پیسے ہوں گے ـــــ بنگلہ ہوگا ـــــ کار ہوگی ـــــ فون، فرج، بہت سے نوکر۔ کسی بات کے لئے ترسنا نہیں پڑے گا، اور ہونٹوں پر خوشی کے نغمے ہوں گے ...   ... اور شاید انہی خوش آئند خوابوں نے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ اپنے خوابوں سے میں اس وقت جاگی، جب نیچے کار میں سے ایک خوش پوش نوجوان اُتر کر سیدھا اُوپر ہی چلا آیا ـــــ میرا ہاتھ تھام کر وہ مجھے کمرے میں لے گیا اور ایک ایک کر کے میرے سارے کپڑے اتارتا گیا ـــــ بیچ بیچ میں وہ کہتا رہا :

" ڈارلنگ ـــــ کپڑے تو بدصورت عورتیں اپنی بدصورتی چھپانے کو

پہنتی ہیں ۔ تم جیسی حسین عورتوں کو تو ننگا ہی رہنا چاہیئے ۔"

مجھے پتہ تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے، کیوں کہ میں کوئی بچہ نہیں تھی —— ایک بیوی تھی جس نے چھ سال کی کئی خوب صورت راتیں اس انداز سے گزاری تھیں لیکن اُس وقت میرے ذہن میں صرف دو بچے تھے جو شکر ملا پانی پی پی کر سوئے ہوئے تھے، جو جاگ کر مجھ سے روٹی کا مطالبہ کرنے والے تھے۔ جن کا باپ شام کو نوکری کی ناکام تلاش کے بعد بھوکا ماندہ گھر واپس آنے والا تھا —— گھر جو مالکِ مکان کے تقاضوں سے ہاتھ سے جانے ہی والا تھا —— ایسے میں میں نے کوئی مزاحمت نہ کی —— مجھے رونا تو اُس وقت آیا جب وہ دس دس کے نہیں ...... سو سو کے دو نوٹ میرے ہاتھوں میں یہ کہہ کر تھما گیا کہ ——"ڈارلنگ تم جیسی حسین اور پیاری گڑیا کے لئے یہ دو سو روپے کوئی حقیقت نہیں۔ تم اسی طرح مسکراتی ہوئی بالکنی میں کھڑی رہو تو میں قسم خدا کی روز روز پھیرے لگاؤں..."

پھر جب وہ چلا گیا تو میں راشن کارڈ لے کر سیدھی راشن کی دکان پر گئی۔ دال، چاول، آٹا، گوشت سبھی چیزیں آ گئیں —— میں نے ساروں کے پیٹ کا دوزخ بھر دیا —— لیکن خود ایک ایسے دوزخ میں جلنے کے لئے زندہ رہ گئی جس کا حال سوا میرے کوئی نہیں جان سکتا تھا —— میں نے یہ سارے دن کیسے گزارے ؟ اُس کا دُکھ میں کیا کہوں ؟ آپ کے ڈر سے پڑوسن سے قرض کا ڈھونگ رچایا اور باقی کے روپے ابھی تک صندوق میں پڑے ہیں ...."

ریکارڈ ختم ہو چکا تھا —— بڑی دیر خاموشی چھائی رہی —— دونوں بچے کھیلتے ہوئے دور نکل گئے تھے —— پھر ثریا نے خاموشی توڑی —— اسی لئے میں نے چاقو کے بارے میں پوچھا تھا، آپ جو اتنے حساس، اتنے حاسد تھے کہ ہر بات مجھ سے پوچھتے تھے کہ "تم میری رہو گی نا؟" وہ شوہر یہ کیسے

برداشت کرسکتا ہے کہ اس کی بیوی نے کسی اور کا پہلو گرمایا ہو اور سمندر پہ آنے کے لئے میں نے آپ کو یوں اُکسایا تھا کہ ممکن ہے کہ آپ کو دو بچوں کی ماں پر رحم آجائے اور آپ ہاتھ نہ چلا سکیں تو میں سمندر میں کود کر اپنی زندگی ختم کر لوں . . .

محمود موہنہ پھیرے بیٹھا سب کچھ سن رہا تھا —— ثریا خاموش ہوئی تو بڑی دیر بعد وہ اتنا بولا —— "کیا تم اُسی طرح مسکراتی ہوئی بالکنی میں روز روز نہیں کھڑی رہ سکتیں میری جان —— !"

# عبادت گاہ

میرے ماموں خدا بخشے بہت ہی رنگیلے اور رجی دار نواب تھے۔ زندگی بھر ایکو ایک بڑھیا اور طرحدار رنڈی ان کے پاس رہی —— آخیر عمر جھیل کنول ایسی بڑی بڑی آنکھوں والی ایک طوائف کے ساتھ گزری —— کچے پکے جنے کتنے بوجھ انہوں نے گرائے ہوں گے۔ مگر جب فلمی دنیا میں آکر اُن کے نصیب جگمگا گئے تو ایسی پارسا بن بیٹھیں کہ محفل میں کبھی سر سے پلو نہ گرتا اور ہر انٹرویو میں رقت طاری ہو جاتی کہ" اس اچھی صورت کی خرابی دیکھئے کہ ستر پردوں میں رہنے والی کو لوگوں نے مجبوراً کس طرح بے پردہ کر دیا ہے!

اے لیجئے بات کدھر سے کدھر نکل گئی —— یوں دیکھا جائے تو میری اس داستان سے ان بی بی کا براہِ راست کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ لیکن یہی کیا کم تعلق ہے کہ پتہ نہیں کیوں کر میرے آس پاس کے لوگوں میں یہ بات پھیل گئی کہ وہ بی بی جو فلمی آسمان پر چاند بن کر جھم جھما رہی ہیں —— نواب ماموں کے رشتے سے میری

ممانی لگتی ہیں، اور اب بھانجی کا انہیں اتنا لحاظ تو ہوگا ہی کہ ضرورت پڑنے پر کام آسکیں —— اور جسے میں کہوں، اسے بلا کسی شرط کے فلمی دنیا میں کھپا سکیں۔

—— اس رشتے نے مجھے بہت تنگ کیا کہ رلا رلا چھوڑا —— حالانکہ آج کے دن تک نہ ان ممانی سے میری ملاقات ہی ہوئی ہے، نہ مونہہ پہ مونہہ ہی پڑا ہے —— لیکن آس پاس والے تو یہی سمجھتے ہیں کہ وہ تو بس تیار ہی بیٹھی رہتی ہیں کہ کب میں کسی امیدوار کو لاتی ہوں اور وہ کوئی موٹا سا فلمی رول انہیں پکڑاتی ہیں۔

اس سلسلے میں ایسے ایسے رنگروٹ میرے پاس سفارش کے لئے آتے ہیں کہ پوچھئے مت۔ لیکن وزیرن کی بات ہی اور ہے۔ انہوں نے تو یہ سمجھ رکھا تھا کہ حسن یوسف کے بعد سارا حسن انہیں کے حصے میں آیا ہے۔ اور اداکاری کی حد تک ان کا یہ کہنا تھا کہ "یہ موئی رانڈیں کرتی ہی کیا ہیں۔ کبھی ہنس پڑیں کبھی رو پڑیں تو ایسے ہنسنے اور رونے میں میں کون کم ماہر ہوں۔ آپ کہئے تو ابھی ٹھٹھا مار ہنس کر بتا دوں، اور کہئے تو جھکو جھکو رو کر بتا دوں ——" اور یہ حقیقت بھی تھی کہ ہنسی میں تو ایسے کون سے گدھے گھوڑے لگتے ہیں جو میں حیرت کرتی۔ یہی کہ لیا اور مونہہ پھاڑ دیا —— لیکن ایک دو منٹ کی ذرا سی کوشش میں جب وہ دھواں دھار رونے لگتیں تو میرا جی اندر سے سچ مچ چاہنے لگتا کہ انہیں واقعی ہیروئن بنا دوں —— لیکن ان کا حلیہ دیکھ کر اپنی حماقت پر آپ ہنسی آنے لگتی —— دراصل بقول ان کے زندگی بھر کھانا پکاتے پکاتے اور روتے روتے ان کا حلیہ ہی ٹائٹ ہو گیا تھا —— اور میری ان کی ملاقات بھی اصل میں یہ پکانے پیسنے کے سلسلے میں ہی ہوئی تھی۔

ہوا یوں تھا کہ ہماری پرانی بڑی بی جو ایک ساتھ ہماری انا آیا بھی تھیں اور ماما بھی —— بیمار پڑ گئی تھیں۔ کھانا پکانے کی سخت مصیبت ہو رہی تھی، ایک دو لوگ ہوتے تو کوئی بات نہ تھی لیکن یہاں تو ماشاءاللہ سے گھر بھرا پڑا تھا۔ اور

ہم سبھی بہنیں پکاتے پکاتے اُکتا چکی تھیں ۔ ایسے میں ہم سبھوں کو ایک ماما کی تلاش تھی ۔ اتفاقاً ایک دن ہم لوگ گیلری میں باتیں کرتے بیٹھے تھے کہ دروازے پر کھٹکا ہوا اور ایک مہذبانہ سلام کے ساتھ انہوں نے وہیں سے اپنی دکھ بھری کہانی شروع کر دی ــــ

"بیبیو، میں مہاجر ہوں، مگر بڑے اچھے خاندان سے ہوں ــــ میرے خسر ڈاکٹر تھے ۔ میں خود بھی وکیل کی بیٹی ہوں ــــ میرا تعلق بھوپال سے ہے ــــ لٹ پٹ کر یہاں آنا پڑا ــــ" (بعد میں پتہ چلا کہ بھوپال سے تو اُن کا تعلق واجبی سا رہا ہی ہوگا ۔ ہاں البتہ یہ حقیقت تھی کہ ہر مرد سے اُن کا گہرا تعلق تھا)

ہم نے چونک کر دیکھا ــــ ایک بہن نے اُٹھ کر دروازہ بھی کھول دیا وہ بڑی نفاست سے اپنی گندی ساڑی کا آنچل سر پر جماتی ہوئی آئیں اور انکسار سے ہمارے قدموں میں بیٹھ گئیں ۔ اور بغیر کسی انتظار کے شروع ہوگئیں :

"مجھے زیادہ کی ہوس نہیں ہے بیبیو ــــ بس پیٹ بھر روٹی اور تن بھر کپڑا مل جائے یہی غنیمت ہے ۔ اور اوپر کے خرچ پانی کو بس دس روپے ــــ زندگی بھر دعائیں دیتی رہوں گی ــــ"

ان کا مطالبہ اس قدر کم تھا اور ہماری ضرورت اس قدر شدید کہ ہم میں سے کسی نے کچھ سوچنا مناسب نہ سمجھا ۔ لیکن آپی کو یہ خیال کبھی بھولتا ہی نہیں کہ گھر میں جان جوان لڑکے ہوں تو عشق کے کھیل بڑی جلدی شروع ہو جاتے ہیں ــــ بھلے سے عورت لنگڑی ہو، لولی ہو مگر بس جوان ہو ــــ اور آپی نے پہلے ہی تاک لیا کہ انہوں نے حلیہ بگاڑ رکھا ہے تو کیا ہوا، آنکھیں چندھی ہیں تو کیا ہوا ــــ ہیں تو جوانی کی ریل میں بیٹھی ہوئی ــــ اسی لئے محض ٹالنے کی خاطر آپی نے ایک حیلہ گھڑ ڈالا ــــ

"دیکھو بھئی، بات ایسی ہے کہ ہم تمہیں رکھ تو ضرور لیتے لیکن ایسا لگتا ہے کہ تمہیں آنکھوں کی کوئی بیماری ہے۔ اور ظاہر ہے جب تمہارا کام ہی کھانا پکانا ہو تو دھوئیں اور کوئلے اور جلتی لکڑی کی تپش سے اور زیادہ خراب ہوجائیں گی ——"

آپی نے اپنے حسابوں گویا ان کی خلاصی کردی۔ مگر وہ بے حد اطمینان سے بولیں —— " اے بی بی ان نامراد آنکھوں پر نہ جائیے —— بارہ برس کی میری موتی جیسی بچی تھی —— فسادات میں جانے کون اٹھالے گیا۔ اس کے غم میں روتے روتے پلکیں تک جھڑ گئیں۔ ورنہ میں بھلی خاصی ہوں۔"

اس کے بعد آپی کو کوئی مزید حیلہ نہ سوجھ سکا۔ مگر وہ عقل مند تھیں کہ تذبذب کی حالت جان گئیں اور بولیں —— "آپ ان آنکھوں کی فکر نہ کریں بی بی —— میرے خسر نے بھی بہت علاج کئے، مگر گئی ہوئی پلکیں پھر نہ آئیں۔ اب یہ میری بدنصیبی . . . . . !" ڈیڈی نے اکتا کر بات کاٹی —— "تم تو چوبیس گھنٹے یہیں رہوگی ؟ تمہارا گھر بار، مرد یا بچے تو ہوں گے —— ؟"

اس ذکر پر قدرے پورسی نظر آئیں۔ پھر بولیں۔ "ہاں بی بی —— سب ہیں، مگر کسی کو میرا خیال ہوتا تو یوں دربدر ٹھوکریں کھانے کی نوبت آتی —— ؟ اب تو میرے ماں باپ آپ ہی لوگ ہیں ——"

انھوں نے بات کا اختتام اس خوبی سے کیا کہ ڈیڈی کو سوائے اس کے اور کچھ نہ سوجھا کہ حمام کی طرف اشارہ کریں اور کہیں —— اچھا تو تم جا کر نہا دھو تو لو۔ ساڑی بلاؤز تمہیں چھوٹی بی بی دے دیں گی ——"

اور یوں وہ ہمارے گھر ٹک گئیں —— مگر وہ جو مثل ہے کہ انسان دیکھو، بس کے، سونا دیکھو گھس کے —— تو ان کے بسنے پر پتہ چلا کہ کن گنوں کی ہیں —— بلا مبالغہ ہر دوسرے تیسرے مہینے پیٹ گراتی ہی تھیں اور اس شان سے کہ جہاں قے

متلی کا سلسلہ شروع ہوا۔ فوراً ہاسپٹل کے پھیرے شروع کر دیتیں ـــــــ بدہضمی کی شکایت کر کر کے الا بلا دوائیں کھاتی رہتیں اور اس سے کام نہ بنتا تو کچے پپیتے پر تان آکر ٹوٹتی ـــــ اور جب ایسے آثار شروع ہو جاتے کہ گھر میں رہنے سے بھد ہو جائے گی تو سیدھے دو دن ہاسپٹل کا رخ کرتیں ـــــــ چار پانچ دنوں بعد زردی سا پیلا چہرہ لئے نمودار ہوتیں۔ اور کبھی مان کر نہ دیتیں کہ ابارشن کروا کر آئی ہیں ـــــــ ہمیشہ یہی رونا روئے جاتیں۔" موئی چنے کی دال ہی تو کھائی تھی بس۔ اللہ نہ کرے جو اَب کھاؤں ـــــــ سب جانتے تھے کون سی چنے کی دال کھا کر انہیں سیدھے ہاسپٹل بھاگنا پڑتا ہے ـــــ مگر نوکروں کے کال کے اس دور میں ہم سب جان بوجھ کر انجان بن جاتے ـــــــ آپی کو بھی اب ان کی طرف سے زیادہ چنتا نہ تھی، اس لئے کہ پتہ نہیں یہ ان کی آنکھوں کی کرم فرمائی تھی یا بے انتہا گندے کپڑوں کی عنایت، کہ کسی بھائی بھتیجے کا دل ان پر نہ آیا اور وہ گویا ہمارے گھر کی ہو کر رہ گئیں ـــــــ لیکن ہماری پرانی ماما ئیں اور ان میں اکثر ٹھنی رہتی ـــــــ انا بھی کھلم کھلا کہتیں کہ" تمہارے کرتوت اس لائق نہیں کہ تم کنواری بن بیاہی لڑکیوں میں ایک منٹ بھی بیٹھ سکو ـــــ" مگر وہ ہمیشہ اپنی پارسائی کا ڈھونگ یہ کہہ کر رچاتیں ـــــــ" اے خالہ ـــــ بیا ہتا عورت ہوں۔ ذرا میرے عورت ہونے کا مان کرو ـــــــ بیاہتا عورت تو ایک عبادت گاہ کی طرح ہوتی ہے کہ جس کے در و دیوار سے ہی تقدس ٹپکتا ہے ـــــ"
انا بھی ان کی یہ بھوپال والی لچھے دار زبان سن کر ذرہ برابر بھی مرعوب نہ ہوتیں اور جل کر بولتیں ـــــ" نوج تم اور عبادت گاہ ـــــ تمہاری تو کم بخت صورت پر ہی پھٹکار برستی ہے ـــــ"
مگر وزیرن پر قطعاً اثر نہ ہوتا ـــــ جب بھی ہاسپٹل بھوگ کر آتیں، سب کے چہروں پر بیزاری بھانپ لیتیں۔ اس لئے خواہ مخواہ ہر ایک میں دم اٹکاتیں اور

اپنے ڈاکٹر خسر کی عنایت سے ایک ایک کا دل جیتنے کی کوشش کرتیں ــــ کسی بچے کے کان میں درد، کھجلی ہوتی تو ہائیڈروجن پراکسائیڈ کی دو بوندیں ٹپکانے کا مشورہ دیتیں کسی کے پیٹ میں درد اٹھتا تو اینو فروٹ سالٹ کا اشتہار بنی گھومتیں یا گھر میں اینو نہ ملتا تو سادہ نمک ہی تجویز کر دیتیں ــــ کسی کے پھوڑیاں پھنسیاں نکلتیں تو اک دم حکیم بن جاتیں، اور زمانے بھر کی مشہور دوائیں، ہمدرد مرہم اور صافی اپنے خسر سے منسوب کر کر کے استعمال کرنے کا مشورہ دیتیں ــــ ماؤں کو ان کے چال چلن سے کیا سروکار تھا ــــ جب اُن کے بچوں کی ایسی اُوپر اُوپر کرتیں، تو وہ موم ہوجاتیں۔ اور اگلی بار کی "بدہضمی" کے لئے گویا میدان صاف ہوجاتا۔

ہمارا باورچی خانہ ــــ ہم بہنوں کے کمرے سے کافی قریب ہی تھا ــــ جب بغیر سائیلنسر والا اسٹوو شوں شوں شاں شاں کی آوازیں نکالتا جلتا رہتا، تب تک تو وزیرن کے کان ہماری گفتگو سے ناآشنا رہتے، لیکن جب وہ لکڑی کے چولھے یا سگڑی پر کھانا پکا رہی ہوتیں تو پھر کان اُٹھا اُٹھا کر ہماری باتیں سنتی جاتیں اور بعد میں حسبِ ضرورت تبصرہ بھی کرتیں ــــ ہمارا کمرہ ہمارا کاہے کو تھا، اچھا خاصا کامن روم تھا ــــ عموماً کھانے کے بعد جو محفل جمتی تو پھر دُنیا بھر کے موضوع زیرِ بحث آجاتے۔ اس میں بھائی بھتیجے، ماموں، چچا سب ہی ہم عمر حصّہ لیتے ــــ ایسے ہی ایک دن ہندوستانی فلمیں اور ہندوستانی ستارے زیرِ بحث تھے کہ اُن طوائف کا بھی ذکر آگیا ــــ اُن دنوں فلم ڈم میں ان کا طوطی زور شور سے بول رہا تھا۔ ایسے ہی موڈ میں آکر چھوٹے بھتیا بولے ــــ "یار کوئی سلسلہ ایسا چلائیں کہ ممانی جان سے رابطہ بڑھے۔ بس فلم ڈم میں وارے نیارے ہیں۔"

پھر ان کا نام لے لے کر اُن کے ماضی کے پردے سرکائے گئے۔ اور یہ بعد میں ہمیں احساس ہوا کہ اس دن وزیرن لکڑی کے چولھے پر روٹیاں پکا رہی تھیں۔

ایک دن موقعہ پا کر وزیرن میرے پاس آ دھمکیں۔ اس سے پہلے وقتاً فوقتاً وہ اپنے مفید مشوروں سے مجھے نوازچکی تھیں کہ "کنواری لڑکیوں کو قطعاً کہانیاں وغیرہ نہیں لکھنی چاہئیں ــــ سیدوں کی کنواری بیٹی کے ہاتھ میں دراصل قلم ہونا ہی نہیں چاہیئے ــــ" اور میں بے حد سنجیدگی سے ان کی بات پی جاتی تھی ــــ اس لئے کہ میری عادت بک بک کرنے کی ہے ہی نہیں ــــ لیکن اس دن انہوں نے بجائے نصیحت کرنے کے بڑے اچنبھے سے پوچھا ــــ "بی بی، آپ یہ کہانیاں کیسے لکھ لیتی ہیں ــــ؟"

میں نے ہنس کر انہیں دیکھا اور خاموش رہی ــــ

وہ بڑی جلد اپنے مطلب پر آ گئیں ــــ "آپ کی کہانیاں تو چھپ چھپ کر بڑی دُور دُور جاتی ہوں گی ــــ"

میں نے ذرا غور سے ان کی طرف دیکھا ــــ

" وہ آپ کی بمبئی والی ممانی (نام لے کر) بھی پڑھتی ہوں گی نا ــــ"

میں جھنّا کر بولی ــــ " دیکھو وزیرن ــــ ان بی بی سے میرا قطعاً کوئی رشتہ ناطہ نہیں ہے۔ وہ ماموں میرے سگے ماموں تھوڑی تھے۔ میری ماں تو اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھیں ــــ مجھے ... ... "

وہ بات کاٹ کر بولیں ــــ " بہرحال ماموں تو تھے ــــ تو اس رشتے سے وہ تو ممانی ہونے ہی والی ــــ"

"کوئی نکاح ہوا تھا ان کا ــــ؟" میں جل کر بولی ــــ" وہ تو تھے ہی رنگیلے ــــ ایسی ایسی تو پھر جتنے کتنی ہی میری ممانیاں ہوئیں ــــ"

" اے ہے بی بی، تو آپ چڑتی کیوں ہیں ــــ"

" اس لئے چڑتی ہوں کہ اس بیہودہ رشتہ کی آڑ لے کر لوگ مجھ سے اُلٹ

پلنٹ کام کی سفارش کروانے پر تُل جاتے ہیں ——" میں نے آگے ہی بات صاف کردی۔

وہ بھی اسی ڈھٹائی سے بولیں: " اے ہے بی بی، آخر دو حرف لکھ دینے میں آپ کا بگڑتا ہی کیا ہے، جو کسی کا کام بن جاتا ہے —— ویسے تو فضول یہ پٹارا سی کہانیاں لکھتی رہتی ہیں ——"

میں نے ان کی سادگی پر تلملا کر انہیں دیکھا " تم چاہتی کیا ہو آخر وزیرن؟"

وہ ذرا رک کر بولیں —— " اگر مجھے بھی کسی فلم میں کام مِل جاتا تو سارے دلدر دور ہو جاتے!"

اب کے میں ذرا غصے سے بولی —— " کیوں جی، پھر تم اپنی پارسائی اور شرافت کا ڈھنڈورہ کیوں پیٹتی پھرتی ہو —— کہیں شریف عورتیں فلموں میں کام کیا کرتی ہیں ——؟"

وہ بڑی شرافت سے بولیں —— " اے بی بی یہ سب بے کار کی باتیں ہیں —— فلموں میں کام کرنے سے کوئی بُرا نہیں بن جاتا —— حج کر لینے سے کوئی نیک نہیں بن جاتا —— اصل حیا تو عورت کی آنکھ میں ہوتی ہے ——"

ان کی حیاداری کے اس ذکر پر میں چکرا سی گئی —— " لیکن وزیرن تم تو اس زندگی سے بے حد مطمئن ہو نا —— تمہیں پیٹ بھر کھانے کو مِل جاتا ہے، تن بھر پہننے کو —— پھر پیسے کی ہوس کیوں؟"

" اللہ نہ کرے جو مجھے پیسے کی ہوس ہو بی بی۔ مجھے تو بس اتنا پیسہ چاہیئے کہ میں اپنے شوہر کا جی کھول کر علاج کروا سکوں۔ اپنے بچوں کی اچھی اچھی اسکولوں میں پڑھا سکوں —— ورنہ مجھے کیا پڑی ——"

اس ذکر پر میں ذرا چونکی ——" وزیرن تم اکثر اپنے بچّوں کا ذکر کرتی رہتی ہو. لیکن آج تک کبھی ایک بچّہ نظر نہ آیا —— کبھی تو ماں کے پیچھے پیچھے بچّہ آتا ہی ہے —— اور ہمارا گھر بھی تمہاری کھولی سے ایسا کتنا دُور ہے ؟"

وہ سٹ پٹا گئیں ——" کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر سے تالا ڈال کر جو آجاتی ہوں ——"

" اور تمہارے شوہر —— ؟ انہیں بھی بند کر کے آجاتی ہو ——" میں ذرا طنز سے بولی ——" اصل میں تم ہو چھڑی چھانٹ —— بال نہ بچّے، میاں نہ گھر داری —— خواہ مخواہ تم دوسروں کو بے وقوف بنانے کی کوشش مت کیا کرو ——"

وہ جیسے تڑپ کر بولیں ——" اے بی بی، سُہاگن ہوں، خدا کے لئے ایسی بدفال مونہہ سے نہ نکالئے —— میاں کو اصل میں دق ہے بی بی، اس لئے میں کسی سے ذکر نہیں کرتی —— لوگ ایسی بیماری سے دُور بھاگتے ہیں نا ——"

میں نے اس صریح گپ پر انہیں قدرے گھُور کر دیکھا۔ اِن کی مُسلسل بکواس سے سخت جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی —— لیکن مُجھے غصّہ بھی اتنا آ رہا تھا کہ چُپ بھی نہیں رہ سکتی تھی —— اُلجھ کر بولی :" تو تمہیں بڑا اچھا لگے گا میاں تو مرتا پڑا ہے اور تم فلموں میں کام کرتی پھرو :"

" تو یہ سارے پاپڑ اور کِس لئے بیل رہی ہوں پھر —— ؟ پیسہ آئے گا تو ان ہی کا علاج کروں گی نا آخر ——"

میں نے اُکتا کر بات ختم کرنا چاہی ——" وہ سب ٹھیک ہے وزیرن۔ مگر یہ اداکاری بڑی مُشکل چیز ہے —— تم سے نہ سنبھل پائے گی ——"

" اے لیجئے اور سُنئے —— آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ میں کیا فلمیں کم دیکھتی

ہوں ــــ؟ کم بخت موئی رانڈیں کرتی ہی کیا ہیں ــــ کبھی رونے لگیں۔ کبھی ہنسنے لگیں۔ کبھی گانے بیٹھ گئیں ــــ کیا مجھے یہ سب نہیں آتا ــــ" اور انہوں نے بیٹھے ہی بیٹھے ہنس کر، گا کر، حد یہ کہ رو کر بھی بتا دیا۔

"اب کیا کروں ــــ؟ میں نے عاجز آ کر انہیں دیکھا اور ذرا رک رک کر بولی ــــ" وہ تو سب ٹھیک ہے وزیرن ــــ مگر اصل بات یہ ہے ــــ وہ کچھ ... ..." میں مناسب اور مہذب الفاظ ڈھونڈھنے لگی۔

اصل بات یہ تھی کہ بے چاری پیدا تو عورت کی جون میں ہوئی تھیں، لیکن آگے پیچھے سے بالکل ایک سی تھیں۔ زیادہ سے زیادہ بارہ پندرہ برس کا چھوکرا جیسا لگتیں ــــ رنگ گورا ہونے سے کیا ہوتا ہے بھلا ــــ ویسے رنگت تو ان کی میدہ شہاب تھی، ناک بھی تیکھی تھی، ہونٹ بھی برے نہ تھے۔ لیکن آنکھوں پر سے پلکیں غائب تھیں اور جسم! ــــ جیسے میں سوچ سوچ کر بولی۔ "اصل میں فلمی دنیا میں بڑے خوب صورت جسم کی ضرورت ہوتی ہے وزیرن ــــ رنگ روپ سے کچھ نہیں بنتا۔ کیوں کہ میک اپ سے سارا عیب چھپا دیا جاتا ہے ــــ"

وہ ایک دم سمجھ گئیں اور تڑسے بولیں ــــ"اب مجھے اتنا نادان بھی مت سمجھئے بی بی ــــ ساری حقیقت مجھے معلوم ہے ــــ کم بخت رانڈیں جب ناچتی ہیں تو ذرا تو بوٹی نہیں ہلتی ــــ کیا گوشت پوست کے اصلی جسم ایسے ہی لکڑی کے بنے ہوتے ہیں کہ دھما دھم اچھل پھاند سے بھی پتہ نہ ہلے ــــ"

میں ان کی معلومات پر دنگ رہ گئی ــــ ہماری بات چیت ابھی کسی موڑ پر نہیں پہنچ پائی تھی کہ باہر چند ملنے والے آ گئے اور انہیں چائے بنانے کے لئے اٹھ کر جانا پڑا ــــ

پھر کئی دنوں تک بات چیت کا موقعہ نہ مل سکا۔ ان ہی دنوں پتہ چلا کہ

وزیرن واقعی سُہاگن تھی، مگر ایک شرابی اور بے کار اور اپاہج مرد کی بلکہ نامرد کی، لیکن اب بیوہ ہو گئی ہیں —— دو تین دن اسی وجہ سے کام پر بھی نہ آئیں —— جب آئیں تو میلی سی سفید ساڑی اور سوُنے ہاتھوں میں موہنہ چھپا کر خوب روئیں —— اناّ بی کا کہنا تھا کہ موہنہ چھپانے کی ضرورت ہی نہ تھی —— اگر دھاروں دھار آنسو بہتے —— موہنہ دراصل اس لئے ڈھانپا تھا کہ آنسو ہی نہ تھے، اور اپنا غم تبائیں کیسے —— ؟؟

یہ سب سمجھ رہے تھے کہ اب وہ چونکہ بیوہ ہو چکی ہیں اس لئے چنے کی دال تو کیا چنے کا پورا کھیت بھی اگر وہ کھالیں تو انہیں ہضم ہو جائے گا —— لیکن سب کو حیرت جب ہوئی کہ میاں کو مرے تین چار مہینے بھی نہ ہو پاتے تھے کہ وہ پھر چنے کی دال کو کوسنے بیٹھ گئیں —— "کم بخت ہضم ہی نہیں ہوتی۔ بس چنے کی دال میرے پیٹ میں گئی اور الٹیاں آنی شروع ہوئیں ——"

اناّ بی جل کر بولیں —— "کیوں ہمارے پیٹ، نہیں ہے؟ اور ہم تو بوڑھے بھی ہیں۔ دانت موہنہ میں نہ آنت پیٹ میں —— پھر ہمیں کیسے ہضم ہو جاتی ہے —؟"

ان کی پارسائی پر جو حرف آیا تو پھپھک پھپھک کر رونے لگیں —— "مجھ بیوہ رانڈ پر خالہ کو الزام لگاتے شرم نہیں آتی ——" اور انھوں نے انتہائی وثوق سے اعلان کر دیا کہ خالہ کی قبر میں بجّ بجّ کیڑے پڑیں گے۔ مجھے بھی ایک لمحے کو وزیرن پر ترس سا آگیا —— ممکن ہے بد ہضمی ہی ہوتی ہو۔ کوئی انہونی بیاری تو ہے نہیں۔ لیکن بعد کی باتوں سے مجھے ان کے ازلی کمینہ پن کا یقین ہو گیا۔

میرا ایم اے فائنل کا امتحان دس دن رہ گیا تھا —— اب تک کچھ بھی نہ پڑھا تھا۔ چاہ رہی تھی کہ ایک ایک بار ہی ہر کتاب دیکھ لوں۔ اس خیال سے اقبال کو لے کر بیٹھی ہی تھی کہ وارد ہو گئیں —— اور میرے غصّے کا عالم نہ پوچھئے کہ پھر وہی فلم

میں کام کرنے کی دُھن ـــــ

میں سمجھا کر بولی ـــــ "دیکھو وزیرن اب تو سب کو پتہ چل چکا ہے کہ تمہارے بچے وچے خاک نہیں ہیں، خواہ مخواہ جھوٹ سچ کہتی پھرتی ہو ـــــ اور اب تو تمہارے شوہر کا بھی انتقال ہو گیا ہے ـــــ چلن سے رہو کسی شریف آدمی سے نکاح پڑھا لو۔ اور خدا نے تمہاری مٹی بڑی زرخیز بنائی ہے۔ ایک دو بچے پیدا کر لو اور شریف عورتوں کی طرح زندگی گزارو ـــــ تمہیں شرم نہیں آتی ہر مہینے دو مہینے کو ہاسپٹل کی ہوا کھاتی ہو، اور لوگوں کی باتیں سنتی ہو ـــــ"

ایسا لگا جیسے انہیں میری نصیحت آمیز تقریر بے حد کڑوی اور بُری لگی مونہہ تھتھائے بڑی دیر تک بیٹھی رہیں ـــ پھر اُٹھتے اُٹھتے بولیں ـــــ فلمی دُنیا میں اتنے سارے لوگ ہیں تو کیا سب آپ ہی کے برتے پر گئے ہوں گے۔ مجھے بھی کوئی نہ کوئی، کہیں نہ کہیں کھپا ہی دے گا ـــــ اب سے آپ سے بولوں تو قبر میں اُجالا نہ ملے ـــــ

آپی دیدی کی شادیاں ہو چکی تھیں ـــــ میرا ایم اے کا امتحان اِدھر ختم ہوا اور اُدھر میری اور افروز کی بھی شادیاں ہو گئیں ـــــ میں شادی کے بعد بمبئی چلی آئی ـــــ گھر سے بھائی میاں کے خطوط آتے رہتے تھے، جس میں وہ پالتو بلی سے لے کر وزیرن تک ہر ایک کی خیر خیریت لکھتے رہتے تھے ـــــ ایک خط میں انہوں نے کافی اہم اطلاع دی کہ "وزیرن نوکری چھوڑ کر بھاگ گئیں ـــــ" یہ اطلاع اہم اس لئے تھی کہ وزیرن کو ہمارے گھر کا دانہ پانی ایسا بھایا تھا کہ کئی مرتبہ ان کی بیہودگیوں سے چڑ کر بھائیوں بہنوں نے ہاتھ پکڑ کر انہیں گھر سے باہر تک کر دیا۔ مگر وہ رات رات بھر گرمی، سردی، بارش کا خیال کئے بنا دروازے پر ہی

پڑی رہیں ۔ اور یوں مجبوراً ہمیں انہیں پھر سے رکھ لینا پڑا ۔ وہ کہا کرتیں "اب آپ لوگوں کے سوا میرا دِل کہیں نہیں لگتا ۔ بس اب تو مر کر ہی نکلوں گی ——"

مگر بھائی میاں کے خط سے پتہ چلا کہ وہ جیتے جی ہی نکل گئیں —— میں سمجھ رہی تھی کہ بھائی میاں کے اس خط کے ساتھ اب میری زندگی سے بھی وزیرن کا نکال ہو گیا —— لیکن ایک دِن جب میں مشین پر سر جھکائے بڑے انہماک سے گنگنا گنگنا کر اپنے بیٹے کا چھوٹا سا فراک سی رہی تھی کہ مجھے لگا کہ میرے سر پر کوئی کھڑا ہے —— سر اُٹھا کر دیکھا تو حیرت سے آنکھیں پھیل گئیں ——

"وزیرن —— تم بمبئی میں —— ؟"

مگر مجھے حیرت کرنے کی کوئی خاص ضرورت تھی بھی نہیں ۔ اس لئے کہ وزیرن ایسی چنڈال تھیں کہ دُنیا کے کسی بھی حصے میں پہنچ سکتی تھیں ، اور یہ تو خیر بمبئی تھی ——

"ہاں بی بی ——" وہ خوشی خوشی مسکرائیں —— میں نے ذرا غور سے انہیں دیکھا ۔ چُندھی آنکھوں پہ پلکیں چڑھی ہوئیں —— کمانی دار بھوئیں —— ہونٹ سستی قسم کے لپ اسٹک سے چھپا چھپ بھرے ہوئے —— رنگ رُوپ تو خیر ہمیشہ سے ہی گورا تھا ۔ جسم بھی بھرا بھرا نظر آ رہا تھا —— میں نے دِل ہی دِل کہا "واہ رِی بمبئی —— تیرا بھی جواب نہیں ——"

"کہاں رہتی ہو ——" پہلا سوال میں نے یہی کیا کہ کہیں یہ بلا میرے سر نہ آ پڑے ۔

"ارے اپن کو بہت ٹھکانے ہیں ——" وہ بھوپال کی لچھے دار اردو اب بمبئی کی ٹھیٹ بولی میں کہیں دب دبا کر بس چکی تھی ۔

"تو یہ ٹھاٹ ہیں تمہارے ——" میں ان کے قیام کی طرف سے مطمئن

ہو کر ذرا سی مُسکرائی : "کہاں کام کر رہی ہو آج کل ــــ ؟"

"فلمستان میں ایکسٹرا لگ گئی ہوں ــــ"، انہوں نے بڑے فخر سے بتایا!

پھر بڑے یقین سے بولیں : ــــ "سُنا ہے بمبئی میں آپ کی تو بڑے بڑوں سے میل ملاقات ہوگئی ہے ــــ"

مَیں نے بَوکھلا کر کہا ــــ "نہیں تو، تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے ــــ مجھے اپنے گھر، میاں، بچّوں سے ہی کب فرصت ہے جو بڑے بڑوں سے میل ملاقات بڑھاتی پھروں گی ــــ"

وہ مجھے شرمندہ کرنے کے انداز میں بولیں "آپ گھبراؤ مت۔ دو تین فلموں کے بعد سیٹھ نے خود ہیروئن بنانے کا بولا ہے۔ مَیں تو ایسے ہی پوچھ رہی تھی:

آدھ پون گھنٹہ بیٹھ کر وہ چلنے کو ہوئیں تو جاتے جاتے میرے بچّے کے ہاتھ میں دس روپے کا ایک نوٹ موڑ توڑ کر ٹھونس گئیں۔ مَیں نے بہت نہیں نہیں کہا۔ مگر وہ بولیں "اب دس روپے سے بھی گئی گزری نہیں ہوں ــــ"

مَیں نے سوچا، بمبئی بھی بڑے کمال کی بستی ہے۔ کیڑوں کی طرح یہاں سے وہاں تک انسان بکھرے ہوئے۔ کوئی جاہل کوئی پڑھا لکھا۔ کوئی شریف کوئی کمین ۔ مگر اپنے اپنے گزارے لائق ہر کوئی کچھ نہ کچھ کما ہی لیتا ہے۔ اس بستی میں کچھ نہ کچھ گلیمر، کوئی نہ کوئی خاص بات ایسی ہے ضرور۔ جبھی تو سب یہیں کھنچے چلے آتے ہیں اور آکر پچھتاتے بھی نہیں !!

اس بات کو دو برس گزر گئے تھے، اور مَیں اس آس میں ہی رہی کہ کبھی تو کسی فلم میں وزیرن ہیروئن کے روپ میں نظر آئیں گی ــــ لیکن مجھے وہ فلم کبھی نظر نہ آسکی یا ممکن ہے، مَیں نے سوچا کہ انہیں ہیروئن بننے کا چانس ملا بھی ہو، لیکن اتفاقاً

میں نے وہی فلم میں کر دی ہو۔ اس لئے کہ بال بچّوں کے بعد سے اب نہ تو فلم دیکھنے کی وہ کنوارہ پن جیسی لگن ہی باقی رہی ہے ـــــ نہ فرصت ہی ملتی ہے ـــــ"

سُنتی تھی باندرہ کا "سلمز ایریا" جسے عُرفِ عام میں جھونپڑپٹی کہتے ہیں، ممبئی کا اصل روپ ہے۔ پیارے ہندوستان کا صحیح نقشہ یہیں نظر آتا ہے۔ مجھے وہ جگہ دیکھنے کی بڑی تمنا تھی، لیکن میرے میاں نے کبھی یہ بات پوری نہ کی۔ ویسے تو وہ ایک فرماں بردار شوہر ثابت ہونے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ لیکن جہاں میں نے باندرہ کی جھونپڑپٹی دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "غنڈوں کا مسکن ہے، کیا کروگی وہاں جا کے ـــــ"

لیکن ایک دن ہمارا نوکر جو سلمز ایریا میں ایک جھونپڑی میں رہتا تھا، بیمار ہوگیا اشفاق اس کی مزاج پرسی کو جانے لگے تو میں بھی ان کے سر ہوگئی۔ اس بار انہیں ٹالتے بن نہ پڑی میں حیرت سے اس طلسماتی ماحول کو دیکھتی آگے بڑھ رہی تھی کہ ایک جھونپڑی کے اَدھ کھلے پٹ سے ٹھٹھک کر میری نگاہیں اندر جا پڑیں ـــــ پہلے تو میں نے غور سے دیکھا اور پھر دوسرے ہی لمحے جھونپڑی کا پھولس کا دروازہ کھول کر ایک دم اندر گھس گئی۔

اندر ایک سڑی ماری کھٹیا پر ایک مریل اور بیمار آدمی اوندھا لیٹا ہوا تھا اور وزیرن اس کے پاؤں کے بڑے سے پھوڑے سے خون پیپ صاف کر رہی تھیں۔ میں نے بوکھلا کر اِدھر اُدھر دیکھا تو ایک گودڑی میں ایک ننھا سا بچّہ انگوٹھا چوستا پڑا تھا میں حیرت سے ایک ایک چیز کو دیکھ رہی تھی۔ اور وزیرن جو کہ میری موجودگی سے باخبر ہو چکی تھیں، بے حد انہماک اور محبت اور ممتا کے ساتھ روئی کے پھایوں سے دھیرے دھیرے خون پیپ پونچھتی جا رہی تھیں۔ جب وہ مرہم لگا چکیں اور ہاتھ دھو دھلا کر فارغ ہو گئیں تو مسکرا کر مجھ سے ملیں۔ پھر وہ مُڑیں۔ بے حد پیار سے بچّے کو اُٹھایا اور خالص ماؤں والے محبت بھرے انداز سے بولیں، "یہ میرا بچّہ ہے۔"

مَیں نے غور سے بچے کو دیکھا، اور اس آدمی کی طرف نگاہ کی جو اب کھاٹ پر اُٹھ کر بیٹھ چکا تھا ـــــ بچے کی صورت ہُو بہُو باپ کی سی تھی ـــــ

وزیرن سدا کی عقل مند تھیں ـــــ میرے کچھ پوچھنے سے قبل ہی بول اُٹھیں:

"یہ میرے شوہر ہیں بی بی ـــــ ایک دن جب مَیں فلستان سے واپس آ رہی تھی، راستے میں بے ہوش پڑے تھے۔ فیکٹری میں کام کرتے کرتے بے حد کمزور ہو گئے تھے نا ـــــ چکر آیا اور راستے میں گر پڑے ـــــ ان کا کوئی عزیز رشتے دار نہیں ہے۔ اکیلے ہی رہتے تھے ـــ میں بڑی مشکل سے انہیں اُٹھا کر ٹیکسی میں ڈال کر اپنی کھولی تک کھار روڈ لائی ـــــ بہت دِن تک اِن کی دیکھ ریکھ کی، تب کہیں جا کر اس قابل ہوئے کہ کام پر جا سکیں ـــــ" وہ ذرا ہنس کر رُکیں ـــــ "اچھے ہونے کو تو یہ ہو گئے، مگر مجھے ایسا لگا کہ انہیں اب کسی خدمت گزار کی ضرورت ہے ـــ جو وقت پر انہیں پکا کر کھلا سکے ـــــ ان کے کپڑے دھو سکے ـــــ ان کے کام کر سکے۔ کمزوری دُور کہاں ہوئی تھی، ـــــ اس وقت خود مجھ ہی کو خیال آیا کہ مجھے ان کی ضرورت ہو نہ ہو، انہیں تو میری ضرورت ہے ـــــ" وہ بے حد دُلہنوں کے انداز میں شرمائیں ـــــ میں نے ہی اِن سے شادی کر لینے کو کہا، اور پھر یہ مجھے بیاہ کر کھار روڈ سے یہاں باندرہ لے آئے ـــــ" وہ رُکی، اور بڑی لگن سے اپنے میاں کی طرف دیکھ کر بولی: ـــــ "میں ٹھیک ہی کہتی تھی نا، انہیں میری ضرورت ہے ـــــ دیکھئے ان کے پاؤں کی حالت، جانے کیسے ایک پھڑیا نکل آئی اور بڑھتے بڑھتے پھوڑا بن گئی ـــــ میں ہی روز مرہم پٹی کرتی ہوں ـــ" وہ بے حد غرور سے ہنسیں ـــــ "اور جتنے زندگی بھر اِن کا کتنا پیار سمیٹنا ہے مجھے ـــــ" اسی دَم بچہ رو پڑا اور وہ بے حد پیار سے اسے بانہوں میں جھلانے لگیں ـــــ

میرا دِل پُوچھنے کو چاہا —— "کیوں وزیرن۔ اب تمہیں فلموں میں ہیروئن بننے کا خیال نہیں ستاتا ——"، لیکن میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا تو مجھے وہاں وہ تقدّس نظر آیا جو کسی عبادت گاہ کے درودیوار سے ہی ٹپک سکتا ہے پھر میری ہمّت نہ پڑی ——

آج اتنے دنوں بعد میں وزیرن کی کہانی لکھنے بیٹھی ہوں تو سوچ رہی ہوں کہ کہنے کو تو میں وزیرن کی ساری داستان لفظوں میں بیان کر دوں لیکن وہ تقدّس اور پاکیزگی جو صرف دیکھنے اور محسوس کرنے کی چیز ہے کیوں کر دائرۂ تحریر میں لاؤں۔

# زخمِ تمنّا

موسم ہے جوانی کا سنبھالا ہی نہیں جائے۔

موسم ہے جوانی کا . . .

ایسا سراپا جو کبھی بیان کی حدوں میں نہ آسکے، زیورات سے بوجھل بدن' لچکتی شاخِ گل کی سی جوانی۔ انگ انگ سے چھلکتا نشہ، گلابی گلابی گال جو اب یوں سرخ ہو رہے تھے کہ جیسے خون ٹپکنے ہی کو ہو۔ متوالی بل کھاتی زلفوں کے پچھے ماتھے پر جھُولتے ہوتے۔ اور آواز ——؟ بس شعلے سے لپک رہے تھے۔ اور اس پر مستزاد گیت کے بول :

موسم ہے جوانی کا . . .

ناچ ختم ہونے پر نیلم نے جھُک کر سلام کیا تو گریبان کچھ اور نیچا ہو گیا —— چاندی کی لکیر بجلی کی طرح لہرائی، جس نے نواب اختر کو لوٹ کر رکھ دیا۔

یہ نہیں کہ نواب اختر ایسے ہی شریف تھے کہ کبھی کسی بالاخانے کا رُخ ہی نہ

کیا ہو یہ کبھی نہیں تھا کہ کبھی کسی طوائف سے مڈبھیڑ ہی نہ ہوئی ہو۔ وہ تو پشتوں کے نواب رئیس تھے۔ جن کے ہاں کے اصول ہی یہ ہوتے ہیں کہ بچے ... یب، گفتار، آداب محفل اور اُٹھنے بیٹھنے کے رکھ رکھاؤ سیکھنے سکھانے خاص طور سے طوائفوں کے ہاں بھجوائے جاتے ہیں ــــــ ان کی زندگی اب تک خانہ داری کے بکھیڑوں سے پاک تھی ــــــ عمر تیس سے بڑھ چلی تھی، لیکن شادی کا بوجھ انہوں نے اب تک نہیں ڈھویا تھا ــــــ ہزاروں ہی لڑکیاں نظروں سے گزری تھیں کہ اگر شمار کرنے بیٹھتے تو صورتیں بھی یاد نہ آتیں، مگر دل کسی کو نہ دیا ــــــ ویسے تھی بھی یہ واہیات بات کہ کسی طوائف کو بیوی بنا لیتے ــــــ ابا میاں کا کہنا تھا۔ "پاؤں کی جوتی پاؤں میں ہی بھلی لگتی ہے ــــــ گھنٹہ دو گھنٹہ شوق سے رات ساتھ گزار لو، مگر آم کا رس چوس لینے کے بعد گٹھلی چھلکے کو کون موںہہ سے لگائے پھرتا ہے ــــ؟" اور حقیقت بھی یہی تھی کہ نواب اختر نے کبھی ایسا سوچا بھی نہ تھا کہ یوں بھی ہو سکتا ہے ــــــ

مگر یوں بھی ہو گیا ــــــ اس دن جب وہ نیلم کے کوٹھے سے اُترے تو اس طرح مرے مرے سے تھے جیسے برسوں کی بیماری جھیل کر اُٹھے ہوں ــــــ گیت کے بول ان کے کانوں میں اب تک گونج رہے تھے ــــــ نیلم کا جوانی سے بھرپور چہرہ جس پر گمان ہوتا تھا کہ خوب چڑھا رکھی ہے ــــــ ان کو رہ رہ کوئی ہنگامہ کر گزرنے پر اکسا رہا تھا ــــــ پھر اس کی کافر ادائیں، بھولا بھولا چہرہ، جس پر طوائف ہونے کے باوجود بازاریت بالکل نہ تھی، ایسا معصوم جیسے ابھی ابھی فرشتے جنت کی کسی پاکیزہ نہر کے پانی سے موںہہ دھلا کے گئے ہوں ــــــ ننھی سی ناک میں چمکتی ہوئی تنھنی، اور پھر اس کا جھک کر سلام کرنا اور نیچے گریبان کا اور نیچا ہو جانا ــــــ ایک دم ان کا خون سنسنا اٹھا: "نہیں نہیں یہ حق سوائے

میرے کسی اور کو نہیں پہنچنا چاہیے —— یہ نظارہ عام نہیں ہونا چاہیے —— نیلم کی نتھنی میں ہی اتاروں گا، اور ایسے ویسے نہیں، بیوی بنا کر!"

یہ آخری خیال اتنی تیزی اور پختگی سے ان کے ذہن میں آیا کہ وہ اپنی ہمت پر خود ہی حیرت زدہ رہ گئے —— اونچے اونچے گھوڑوں والی بگھی کے جھکولوں میں ان کا سر ادھر ادھر یوں ڈولنے لگا جیسے کہہ رہے ہوں "نہیں نہیں"۔ لیکن پھر انہوں نے زور سے سر جھٹک کر اپنے آپ میں گویا اعلان کیا "نہیں کیوں؟ یہ ہوگا اور ہو کر رہے گا —— بھلا کبھی ایسا ہوا ہے کہ نواب اختر نے کوئی بات سوچی ہو اور پوری نہ کی ہو —— ؟"

رات کے کھانے کے بعد وہ چپ چپاتے، شرماتے شرماتے اماں حضور کے کمرے میں داخل ہوئے —— بڑے بیٹے تھے۔ اور اماں حضور کے ایسے چہیتے اور لاڈلے کہ اگر وہ کہتے تو کلیجہ بھی کاٹ کر کھلا دیتیں۔ جس کی زندگی کی آس ہی لے دے کے دو بیٹوں پر ہو، وہ ماں اور سوچ بھی کیا سکتی ہے؟ بڑے نواب کی تو ساری زندگی باہر ہی باہر گھنگھرو والیوں میں ہی گزری تھی —— ان کی خوشیوں کا سارا مدار بس دو بیٹوں پر ہی تھا۔ شیرنی کی طرح بارہ بارہ برس میں اماں حضور نے دو ہی بیٹے پیدا کئے تھے۔ خود بھی کس بل میں شیرنی سے کیا کم تھیں۔ اور بیٹے تو دونوں ہی شیر تھے —— اختر بڑے، اصغر چھوٹے۔

بیٹے کو آتے دیکھا تو ماں کے چہرے پر ممتا کا رنگ چھا گیا —— خوش ہو کر پاندان ایک طرف سرکاتی ہوئی بولیں: "جیو میرے لال —— کیسے آئے؟"

اوّل تو وہ خود ہی مجرا دیکھ دکھا کر چڑھتی رات کو پلٹے تھے، پھر کھانا کھاتے کھاتے تک تو خوب ہی رات بھیگ چلی تھی۔ ایسے میں اتنی رات کو ان کا ماں کے پاس آنا یقیناً کسی بات کا پیش خیمہ تھا۔ وہ بات بنا کے بولے: "امی جان اب تک

جاگ رہی ہیں آپ ؟"

" ہاں بیٹیا وظیفہ ختم کر کے پان کھایا اور اب سونے ہی والی تھی بس ـــــ اچھا ہوا تم آ گئے، ورنہ یوں ہی لوٹ جانا پڑتا۔ تم بھلا مجھے نیند سے کیسے جگاتے۔"

اماں حضور کے لہجے میں جو بے پناہ ممتا اور اعتماد تھا اس نے انہیں ایک لمحے کو ہلا سا دیا، مگر ہمت کر کے بول ہی اُٹھے : " امی جان میں آپ کو ایک دُکھ دینے آیا ہوں ـــــ"

" ووئی ـــــ" وہ خوش خوش بولیں : ـــ" ایک دُکھ کی کون بات ہے بیٹیا مجھے سو دُکھ دے دے۔ مگر بول تو سہی کہ آتی رات کو تیری نیندوں کو کس نے بے چین کیا ـــ ؟" شاید ممتا خود ہی ہر بات بھانپ جایا کرتی ہے۔

عشق کی بے کلی نے ان سے خوف اور تکلف چھین لیا تھا ـــــ دھیمے مگر مضبوط لہجے میں بولے : " امی جان اگر آپ برا نہ مانیں تو میں نیلم طوائف سے شادی کر لوں ـــ !"

ایک لمحے کو اماں حضور چکرا سی گئیں ـــــ بیٹے نے اجازت لینے نہ لینے کی کوئی کسر ہی باقی نہ رکھی تھی۔ صاف سیدھے لفظوں میں بس یہی تو کہا تھا کہ " اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ؟" مطلب یہ کہ اگر میں بُرا مانوں تو بھی وہ کرے گا، وہی جو اس کے دل میں ہوگا۔ پھر خواہ مخواہ کی دھونس جمانے سے فائدہ۔ لیکن خاندان بھر میں یہ اندھیر کس نے کیا تھا کہ رنڈی کو بیوی بنا لیا ہو ؟ یوں گھڑی دو گھڑی کو جی بہلا لینا اور بات ہے، لیکن گندی نالی کے کیڑے کو عمر بھر کے لئے اپنی سیج کی زینت بنا لینا قطعی اور بات . . . . . .

یہ خاموشی دو چار لمحوں کی رہی ہوگی۔ مگر نواب اختر کو یہ محسوس ہوا جیسے وہ برسوں سے امی جان کے سامنے یونہی سر جھکائے بیٹھے ہیں اور وہ گردن نیہوڑائے

سروتے سے کھیل رہی ہیں۔

"امی جان ——" انہوں نے بس اتنا ہی کہا۔

"بیٹا تمہیں پتہ ہے، میری ساری عمر سوکنوں کا دکھ جھیلتے گزری ہے۔ یوں بھی ہوا ہے کہ رات رات بھر بازو کے کمرے میں پائلیں چھنکی ہیں اور میں واہ وا کے شور میں آنسو پیتی زندہ رہی ہوں —— لیکن یہ تم نے کبھی دیکھا ہوگا کہ تمہارے ابا میاں نے سوا میرے شادی کسی اور سے نہیں کی —— یہ سوتیا ڈاہ بس رات کی رات ہی مجھے جلاتی رہتی —— ویسے میری ہستی کا شریک تو آج تک کوئی نہ ہوا۔ تمہارے دادا حضور اور چچاؤں کے کارنامے تم سے پوشیدہ نہیں۔ تمہاری شادی بھی ماشاءاللہ سے اصغر میاں کی طرح ہو گئی ہوتی تو آج تم بھی تین چار بچوں کے باپ ہوتے —— ویسے عمر تمہاری بھی ماشاءاللہ اتنی ہے کہ تم برا بھلا سوچ سمجھ سکو۔ یہ سوچ لو میرا کیا ہے، آج مری کل دوسری —— کل سب بھول بھال جائیں گے کہ اس جھلملاتی چلمنوں کے پیچھے کوئی دبدبے والی نواب بیگم بھی ہوا کرتی تھیں جن کی آوازسے ہی حویلی گونج کر رہ جاتی تھی —— میرا کچھ نہیں، تم اپنا سوچو —— عمر بھر کو ماتھے پر کلنگ کا ٹیکہ لگا بیٹھو گے اور یہ بھی میں غلط کہتی ہوں، کلنک کے ٹیکے مردوں کے نہیں، عورتوں کے لگا کرتے ہیں۔ سوال صرف نسل کا ہے —— اگر رنڈی سے تمہاری کوئی اولاد ہو تو کیا تمہارے خاندان والے اسے برابری کا درجہ دیں گے ؟ ارے بیٹا بازو بٹھاتے یوں ناک بھوں سکوڑیں گے جیسے پھوڑے سے بدبو آرہی ہو ——"

اتنی دیر میں نواب اختر بھی جیسے جواب کے لئے خود کو تیار کر چکے تھے۔

تڑپ کر بولے: "امی جان، میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو ہر بات میں ایک ایک کا مونہہ تکا کرتے ہیں —— بخدا میں آپ کی اولاد ہوں آپ کی مجھے نہ خاندان

کی پروا ہے نہ ناک کی، میں اس خاندان یا ندان کے جھگڑے ہی سے نکل جاؤں گا۔ نیلم کو لے کر دُور کسی شہر کو چلا جاؤں گا جہاں کوئی نواب اختر کو پہچانتا ہو نہ نیلم کو ——— پھر ہم نئے سرے سے زندگی کا آغاز کریں گے اُمی جان . . .

لیکن اماں حضور نے بیٹے کی بات کاٹ دی اور دھیمے لہجے میں بولی: "یہ سب ٹھیک ہے بیٹے، مگر دُنیا میں نے بھی دیکھی ہے۔ کیا تم خود ایک رنڈی سے نباہ کر لو گے؟"

نواب اختر نے بڑے اچنبھے سے ماں کو دیکھا "اُمی جان یہ آپ کہہ رہی ہیں۔ آپ؟ کیا آپ اپنے بیٹے کو نہیں پہچانتیں؟ آپ ——— جس نے اسے اپنا خونِ دِل پلا کر پالا، پال پوس کر بڑا کیا، وہی ماں اپنے بیٹے کے مزاج سے واقف نہیں؟ کیا آپ نے نہیں آزمایا کہ میں نے جس چیز کے لئے ہٹ کی، حاصل کر کے رہا، جس چیز کو اپنا لیا اسے کبھی الگ نہ کیا۔ جس راہ پر چلا بس منزل پر ہی پہنچ کر دَم لیا۔

چوکی دار نے باہر پیتل کے گھنٹے پر ٹناٹن دو کا عمل بجایا۔ اور ماں نے محبّت بھرے لہجہ میں کہا: "بیٹا مجھے خوشی یہ ہے کہ میں نے سدا اپنے رسولِ مقبول ؐ کا فرمان نبھایا۔ کبھی کسی بچّے کا دِل نہ توڑا ——— انہیں پھول ہی سمجھا، اور اتنی ہی نرمی سے پیار کیا۔ میں اس معاملے میں بھی تمہارا دِل نہ توڑوں گی۔ لیکن ———"

وہ رُک کر بولیں: "نیلم جسے تم بیوی بنانے پر تُلے ہوتے ہو، کیا اس آسانی سے تمہارے ساتھ شادی کرنے پر راضی ہو جائے گی، رنڈی کبھی گھر گرہستن نہیں بننا چاہتی، اسے تو صرف پیسہ عزیز ہوتا ہے اور عیش ———"

"یہ مجھے خود پتہ نہیں امی جان، لیکن اسی لئے تو آپ سے پہلے سے پوچھ لیا کہ اگر وہ راضی ہو گئی تو یہ نہ ہو کہ آپ ناراض رہیں ——— ویسے میں یہ سمجھتا ہوں

امی جان کہ وہ راضی ہو جائے گی۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو میاں؟"

"پتہ نہیں —— ہو سکتا ہے میری خوش فہمی ہو، یا خام خیالی کہ مجھے اس کے چہرے کے بھولپن، معصومیت اور آنکھوں کی بے بسی سے ایسا اندازہ ہوا کہ وہ خود اس پیشے کو پسند نہیں کرتی ——"

"خدا تمہیں خوش رکھے ——" انہوں نے ٹوٹی ٹوٹی آواز سے کہا —— "جاؤ اب سو رہو بہت رات جا چکی ——"

اُٹھتے اُٹھتے انہوں نے اپنا آخری خدشہ بھی ظاہر کر دیا —— "اور ابا میاں کو بھی پتہ چل گیا ——"

اماں حضور ہنسیں —— انہیں ان کے شغلوں سے فرصت ملے تب نا —— اور جب تم شہر چھوڑنے ہی کا فیصلہ کر چکے ہو تو یہ بہانہ بھی گڑھا جا سکتا ہے کہ تم نوابی سے تنگ آکر بزنس وغیرہ کے سلسلے میں دور جا کر بس گئے ہو ——"

ایک دم نواب اختر کی آنکھوں سے جلتا جلتا پانی اُبل پڑا —— یہ ماں —— یہ محبت والی عظیم ماں، جس نے مجھ سے بڑا بیٹا ہونے کے ناطے کیسی کیسی اُمیدیں اور ارمان نہ جوڑ رکھے ہوں گے، ماتما کے ہاتھوں کس قدر بے بس ہے کہ ہر وہ بات کر گزرنے کے لئے آمادہ ہے جس سے میرے دل کو ہلکا سا بھی سکھ پہنچ سکے —— انہوں نے چاہا کہ اپنا سر جھکا کر ان کے قدموں میں رکھ دیں۔ پھر انہیں خود ہی ایسا لگا کہ یہ اماں حضور کی محبت کی بڑی سخت توہین ہو گی اور وہ دل کا درد دل میں دبائے کمرے سے نکل گئے ——

**نواب** اختر کی رات بڑی بے کلی میں کٹی تھی۔ ماتما کا جو روپ، وہ روپ

جو اولاد کی خاطر ہر قربانی دینے کو تیار ہو جاتا ہے ۔ اُنہوں نے رات دیکھا تھا وہ انہیں رُلا چھوڑنے کو بہت کافی تھا ۔ مگر صبح ہوتے ہوتے ان کے جذبات اور دل دونوں معمول پر آچکے تھے ۔ اور عشق کا گہرا رنگ پھر ان پر غالب تھا ۔ شام پڑے کسی دوست مصاحب کے بغیر ہی وہ اکیلے بگھی میں بیٹھ نیلم کے ہاں جا پہنچے ۔

ملکہ جان بڑے کلے ٹھسے سے پاندان سنبھالے سامنے والے کمرے میں براجمان تھیں ۔ نواب اختر کو دیکھ کر مارے ادب اور چاپلوسی کے دوہری ہو گئیں ۔ جانتی تھیں کہ شہر کے سب سے بڑے نواب ہیں اور ایسی آسامی مشکل سے ہی نصیب ہوتی ہے ـــــ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیئے ہوئی تھیں ۔ یہ بھی جان چکی تھیں کہ نیلم کی نگاہ کا وار سیدھا دل تک اُترتا چلا گیا ہے ۔ اسی لئے اور خوش تھیں کہ چلو اب تو ٹھاٹ ہی ٹھاٹ ہیں ـــــ نواب اختر نے بلا کسی تمہید کے کہا:

"نیلم کہاں ہیں ـــــ ؟"

وہ خواہ مخواہ کی خوشامدی ہنسی ہنس کر بولیں : " اے حضور، آپ اتنا بھی نہیں جانتے کہ گانے ناچنے والیوں کا یہ وقت بناؤ سنگھار کا ہوتا ہے ۔ کہیں کوٹھے پر ابھی بال سکھاتی ہو گی ، سنگھار کرلے ، ابھی حاضر ہوتی ہے ـــــ"

" اتنی شام کو بال سکھا رہی ہیں ـــــ ؟ " نواب اختر ذرا ناگواری سے بولے :

"جی ہاں حضور ، آج اس کا جی ذرا ماندہ تھا ، دیر سے نہائی ہے ـــــ"

" لیکن میں تو ان سے اسی وقت ملنا پسند کروں گا ـــــ " نواب اختر کسی اڑیل اور ڈھیٹ سے بچے کی طرح بولے ۔

بائی جی اُن کی انگلی میں جگمگاتے ہیرے کو للچائی نظر سے دیکھتی اور اُٹھتی ہوئی بولیں : " جو مرضی سرکار کی ـــــ"

نیلم جس انداز سے کمرے میں داخل ہوئی اُس نے کل سے زیادہ آج انہیں

تباہ کر کے رکھ دیا۔ سادگی کی تصویر ــــــ سادگی بھی کیسی؟ لمبے لمبے، کھلے کھلے سیاہ گیسو، جن سے اکا دکا پانی کا قطرہ جھلمل موتی کی طرح ٹپک جاتا تھا ــــــ نہ آنکھوں میں کاجل نہ رُخ پہ غازہ۔ ہاتھ چوڑیوں اور انگشتریوں سے بے نیاز ــــــ سڈول پنڈلیوں پر غلاف کی مانند چڑھا ہوا سفید تنگ اطلس کا پاجامہ۔ گھیردار سفید ہی کرتا اور سفید اوڑھنی ــــــ نواب اختر اس بے پناہ سادگی اور حسن سے مبہوت ہو کر رہ گئے ــــــ کتنی ہی دیر انہیں بات کرنے تک کا یارا نہ رہا ــــــ نیلم نے جب میٹھی اور پیاری سی آواز سے مخاطب کر کے "جی فرمایئے ــــــ" کہا تو ان کی محویت ٹوٹی۔ وہ ہڑبڑا سے گئے ــــــ

"بیٹھو ــــــ بیٹھو ــــــ" وہ ذرا سسکتے ہوئے بے حد بڑے پن اور اپنائیت سے بولے: "کھڑی رہ کر یوں بجلیاں نہ گراؤ۔"

ایک دم نیلم کی آنکھوں میں آب دار موتی سے دو آنسو اُمڈ آئے ــــــ بے حد دُکھ اور اپنائیت سے اتنا ہی بول سکی: "میں تو آپ کو ایک نظر دیکھ کر یہ سمجھی تھی کہ آپ اوروں سے الگ ہوں گے، لیکن آپ نے بھی بالکل عام مردوں کی سی بات کہی ــــــ اور یہی سمجھ کر کہی نا کہ میں طوائف ہوں ــــــ"

نواب اختر حد درجہ سراسیمہ اور پریشان ہو گئے ــــــ ہکلا کر بولے ــــــ"م ــــــ م ــــــ میں نے کیا کہا؟"

وہ اسی انداز سے بولی: "اگر آپ مجھے ایک گھریلو عورت سمجھتے تو کبھی بجلیاں گرانے کی بات نہ کہتے۔ آپ یوں بھی تو مجھے بیٹھنے کو کہہ سکتے تھے نا۔؟"

نواب اختر کے ذہن میں ایک چاند سا چمکا۔ یوں جیسے بچے کو پچکارتے ہیں، پیار اور نرمی سے بولے: "کیوں تمہیں یہ زندگی پسند نہیں ــــــ؟"

نیلم نے اِدھر اُدھر ڈری نگاہوں سے دیکھا۔ پھر دھیرے سے کہا: "کیا

چہرہ دل کا آئینہ نہیں ہوتا ـــــ؟"

"آئینے کبھی کبھی دھوکا بھی دے جاتے ہیں۔" وہ سانس بھر کر بولے۔

ایک دم نیلم جھکی، اتنا جھکی کہ اس کی جوانی اور بے پناہ خوب صورتی اپنی تمام تر گرمیوں کے ساتھ نواب اختر کو جھلسا گئی ـــــ چہرہ ان کے چہرے کے قریب لاکر بولی۔ "بتائیے اس آئینے میں کس جگہ دھبہ ہے ـــــ صاف، روشن کتاب کی طرح کھلا ـــــ ایسا آئینہ دھوکا دے سکتا ہے نواب صاحب؟" پھر وہ سمٹ کر وہیں بیٹھ گئی، اور بری طرح رونے لگی ـــــ "یقین کیجئے ان برسوں میں کتنے ہی مرد اس کوٹھے پر چڑھے ہوں گے، لیکن جو اپنائیت اور پیار میں نے کل صرف آپ کے چہرے پر دیکھا، وہ کبھی نہیں دیکھا، کہیں نہیں دیکھا۔"

نواب اختر ایک لمحے کو پریشان سے ہو گئے ـــــ مگر ایک گہری مسرت نے ان کے پریشان چہرے کو شاداب کر دیا ـــــ "تو ـــــ تو کیا میری طرح نیلم بھی محبت کا شکار ہو گئی ـــــ یہ تو بڑی ہی عجیب واردات ہو گئی۔"

نیلم بے حد سچائی بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی: "کل آپ کو دیکھا تو یوں لگا جیسے دل میں بہت سارے پھول یکبارگی چٹک اٹھے ہیں۔ رات بھر سوچتی رہی کہ کہیں میں پاگل تو نہیں ہو گئی ہوں، لیکن جب بھی دل میں جھانکا، یہی لگا کہ ایک چور دروازہ، جو اب تک بند تھا، کھل گیا ہے اور کوئی اس میں اس طرح داخل ہو گیا ہے کہ اب جانے کی راہ ملتی ہی نہیں ـــــ" اور اس نے خود ہی شرما کر سر جھکا لیا۔

نواب اختر کچھ آگے جھکے اور رازداری سے بولے "ہماری دلہن بنو گی؟"

نیلم نے گھبرائی ہوئی ہرنی کی طرح خوب صورت آنکھوں سے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ کوئی آتا نہ ہو، کچھ سنتا نہ ہو، پھر تڑپا دینے والے انداز میں بولی": "لیکن ایک رات کی نہیں، زندگی بھر کی ـــــ"

نواب اختر کا دل پھول کی طرح کھل اٹھا۔ لیکن شبہ کی ایک پرچھائیں ان کے چہرے پر ڈولی۔

"بائی جی اجازت دے دیں گی؟"

نیلم نے دوسرا ہی جواب دیا۔ "میں آپ کو کیسی لگتی ہوں؟"

نواب اختر نے مبہوت سا ہو کر نیلم کو دیکھا وہ کیا کہہ سکتے تھے کہ تم مجھے کیسی لگتی ہو ــــ شاید دنیا میں آج تک وہ الفاظ ہی تخلیق نہ ہوئے تھے جو نیلم کی صحیح تعریف کر پاتے۔ یا الفاظ مل گئے ہوتے تو زبان میں اتنی اہلیت نہ تھی کہ وہ بول ادا کر بھی دیتی جو دل میں دبے ہوئے تھے ــــ وہ بے حد جھجکلانے پن سے بولے: "اتنی اچھی لگتی ہو کہ زندگی میں آج تک کوئی اتنا اچھا نہ لگا تھا۔ اسی لئے تو دلہن بنانا چاہتا ہوں ــــ"

"یہی میں بھی آپ سے بتانا چاہتی تھی کہ جب ایک طوائف ایسی ہو کہ عمر بیس کے لگ بھگ ہو، حسن میں اس کا ثانی نہ ہو، پڑھی لکھی ہو، محفل کے آداب سے واقف ہو، ناچ گانے میں ماہر ہو اور پھر مفت کا مال ہو ــــ تو ہر ایک گاہک ہی اسے دلہن بنانا چاہتا ہے ــــ مگر ایک رات کی دلہن ــــ اور اس رات کا مول جب دس دس ہزار میں آجاتا ہو تو کون سی دل والی بائی جی ایسی سونے کے انڈے دینے والی مرغی کو اپنے سے الگ کرنے کی سوچ بھی سکتی ہے؟ آپ کتنے بھولے ہیں ــــ" وہ پیار سے ہنس پڑی ــــ

نواب اختر نے بہت غور سے اس کی بات سن کر بڑے تعجب سے پوچھا۔

"مفت کا مال؟ میں سمجھا نہیں ــــ"

"مفت کا مال یوں نواب صاحب کہ پتہ نہیں میں کن بد نصیب ماں باپ کی اولاد ہوں کہ بچپن ہی سے مجھے ان سے جدا کر دیا گیا۔ سوچتی ہوں تو کچھ بھی یاد نہیں

آتا سوائے ایک دُھندلی سی تصویر کے ——— میں ایک بڑے سے میلے میں اپنے ابا کی اُنگلی پکڑے گھوم رہی ہوں کہ بھیڑ بھڑکے میں وہ محبت بھرا ہاتھ اور ساتھ مجھ سے ہمیشہ کے لئے چھُوٹ گیا ہے ——— پھر جو آنکھ کھولی تو اسی گھنگھرو اور طبلے والے ماحول میں خود کو دیکھا۔ ان ہی بائی جی نے پالا پوسا، پڑھایا لکھایا، کبھی پیار سے کبھی سختی سے۔ اور اس راستے پر لا کھڑا کیا ——— ظاہر ہے مُفت کا مال ہوں کہ جتنی بھی آمدنی مجھ سے ہوتی ہے ساری ان ہی کی تجوری میں جاتی ہے ——— میں تو سوا دو وقت کی روٹی کے اور کسی قسم کا مطالبہ کرتی ہی نہیں، کروں بھی کیا ——— ؟'' مجھے نہ پہننے کا شوق ہے نہ اوڑھنے کا ——— بس یوں سمجھئے کہ اُنگلی پکڑ کر جہاں وہ چاہیں لے جائیں ——— مگر یقین کیجئے اندرون الادل ان تمام باتوں پر نہیں ماتا۔ پتہ نہیں کیوں، جب سے ہوش سنبھالا ہے، ایک ہی خواہش دِل کو مسوستی رہتی ہے کہ ایک چھوٹا سا گھر ہو، اپنا شوہر ہو، جو کبھی محبت کرے کبھی ڈانٹ بھی دے ——— چھوٹے چھوٹے دو تین بچے ہوں جو صاف ستھرے گھر کو ننھے ننھے گندے پیروں سے بار بار گندہ کریں اور میں صاف کرتی پھروں ——— خود ہی کام کروں، پکاؤں پیسوں، خود ہی تھک جاؤں اور میاں سے شکایت گزار ہوں کہ تمہارا تو مجھے کوئی آسرا ہی نہیں، گھر بھی دیکھوں، چولھا چکّی بھی سنبھالوں، بچوں سے بھی نمٹوں، آخر دُنیا کے اور مرد بھی تو ہوتے ہیں جو بیویوں کا ہاتھ بٹاتے ہیں ——— اور اُس نے یہ سب کہتے کہتے سر اُٹھا کر یوں نواب اختر کو دیکھا جیسے وہی اس کے شوہر ہوں اور ان سے سچ مچ ہی گلہ کر رہی ہو ———

نواب اختر کے دِل میں چھپے حاسد مرد نے سر اُٹھایا ——— '' ویسے تو تم کہتی ہو یہ زندگی پسند نہیں۔ مگر کل ایک بازاری سا گیت تو بہت لہک لہک کر گا رہی تھیں ——— ''

نیلم کے معصوم چہرے پر آنسوؤں بھرا کرب چھا گیا۔ سسک کر بولی "مجھ سے مار برداشت نہیں ہوتی ــــــ"

"مار ـــــ؟" نواب صاحب تڑپ کر بولے ـــــ "باقی جی تمہیں مارتی ہیں ـــــ؟"

"ہاں ـــــ" وہ روتی ہوئی بولی: "روتی صورت سے گیت گا کر ناچوں تو دام نہیں ملتے۔ اور جس دن دام نہیں ملتے میری چمڑی اُدھیڑ دی جاتی ہے ـــــ روتے روتے وہ ہنس دی، جیسے بھری برسات میں دھوپ چمک جائے۔ "بتایئے یہ بھی کوئی زندگی ہے ـــــ؟"

انھوں نے اس کا ننھا سا گلابی ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ "میں تمہیں ایک حسین زندگی دینے کا وعدہ کرتا ہوں نیلم ـــــ"

لیکن بجائے خوش ہونے کے نیلم نے دھیرے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا: "مشکل ہے نواب صاحب، بہت مشکل! ہم لوگ گندی موری کے کیڑے ہوتے ہیں ـــــ کسی مرد نے آج تک یہ ہمت نہیں کی کہ اس کیڑے کو اپنی زندگی کا ساتھی بنا لے ـــــ وقتی ولولہ اور چیز ہے، ہمیشہ ساتھ نبھانے کا حوصلہ اور چیز ـــــ میں ماضی میں جو کچھ بھی تھی مگر اب تو رنڈی ہی کہلاؤں گی ـــــ کیا میں نے آپ کے خاندانی شجرے اور دبدبے کے بارے میں سنا نہیں ـــــ؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک خاندانی نواب ایک طوائف کو بیوی بنا لے؟ یا بنائے تو نباہ بھی کر لے۔ بہت کچھ کھونا پڑتا ہے نواب صاحب، جائداد، روپیہ، عزت، شہرت، ماں باپ، محبتیں ـــــ ایک دنیا تیاگ دینی پڑتی ہے، ایسا تو مجھے دنیا میں کوئی نظر نہیں آتا ـــــ"

"ڈیوک آف ونڈسر کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟ ان کا نام سنا تو

ہو گا کبھی ؟"

نیلم نے نواب اختر کے دونوں ہاتھ تھام لئے —— اس کا چہرہ جذبات کی شدت سے سُرخ ہو اُٹھا تھا۔ آواز مونھہ سے نکلتی نہ تھی۔ مگر وہ زبردستی بولے جارہی تھی : " مجھے آپ کی محبت پر پورا یقین ہے نواب صاحب ، اس لئے کہ آپ نے خواب اور خیال کی باتوں کی مثال نہیں دی —— آپ حقیقت پرست ہیں تب ہی آپ نے ڈیلوک کی مثال دی۔ اتنی سی بات آپ پر ایمان لانے کے لیے بہت کافی ہے —— میں آپ کی پاکیزہ اور سچی محبت کے آگے اپنا سَر جھکاتی ہوں "۔ اور سَر جھکاتے جھکاتے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اتنے میں کئی بار بائی جی پھیرے مار چکی تھیں ، اور دونوں کو مصروفِ ناز و نیاز دیکھ کر بے حد خوش ہو رہی تھیں کہ چلو موٹی آسامی پھنس گئی۔ جب فانوسوں میں رکھے ہوئے مومی چراغ جل اُٹھے تو بائی جان کھنکھارتی ہوئی کمرے میں داخل ہو ہی گئیں اور خوشامد سے بھری چکنی چکنی ہنسی ہنس کر بولیں : " اے لڑکی کچھ دھیان بھی ہے کہ وقت کدھر سے کدھر ڈھل گیا —— کپڑے گہنے بدلنے ہیں یا نہیں۔ —— بیٹھکے میں کتنے لوگ جمع ہو گئے ہیں "۔

اور اس جُملے کے ساتھ خاص طور سے انہوں نے کن انکھیوں سے نواب اختر کی طرف دیکھا کہ چہرہ کیا کہتا ہے۔ نواب اختر کے چہرے پر ناگواری کی ایک دبیز تہہ سی چھا گئی —— بُز بُز ہو کر بولے : " آپ ہمارے کہنے سے آج کی رات سب کو واپس لوٹا دیجئے۔"

وہ مکارانہ ہنسی ہنسیں : " اے حضور کا کہنا سر آنکھوں پر۔ مگر ——"

وہ رُکیں ، پھر بولیں : " آج کا ناچ اور گیت دیکھنے سُننے کے وہ لوگ پہلے ہی سے ہزاروں روپے دے چکے تھے جو خرچ بھی ہو چکے —— اب کس مونھہ سے انہیں

واپس پھیروں ؟"

"کتنے روپے تھے ؟" وہ بے پروائی سے بولے۔

اُنگلیوں پر بناوٹی حساب جوڑ کر بائی جان بولیں : "سب کے ملا کے یہی کوئی سات ہزار بنتے ہیں ——"

نواب اختر نے کُرتے کی جیب سے جھل جھلاتا بٹوہ نکالا اور بائی جی کی طرف اُچھال کر ناگواری سے بولے : "زیادہ ہی ہوں گے —— گن سکتی ہیں آپ "

مطلع صاف ہو گیا تو وہی نکھری نکھری پیاری صورت آنکھوں کے سامنے تھی —— نواب اختر نے بے چینی سے پوچھا : "مگر اس دوزخ سے نکلنے کی کیا صورت ہو گی —— ؟"

کچھ دیر سوچنے کے بعد نیلم بولی : "بس ایک ہی راہ ہے۔ پتہ نہیں کیا بات ہے بائی جی کبھی مجھے درگاہ جانے سے منع نہیں کرتیں اور اکثر میں اکیلی بھی چلی جاتی ہوں —— بس وہیں سے کوئی راہ سوچی جاسکتی ہے۔"

نواب اختر خوش ہو کر بولے : "یہ تو بڑی آسان سی بات ہے۔ تم کوئی ایک دن مقرر کر لو کہ کس دن درگاہ جاؤ گی۔ اندر سے باہر آؤ گی تو میری بگھی تمہاری منتظر رہے گی —— پروگرام کے مطابق تم حویلی پہنچا دی جاؤ گی " اور پھر دبی دبی خوشی ان کے چہرے سے پھوٹ پڑی۔ "پھر —— پھر تم ہمیشہ کے لئے میری ہو جاؤ گی ——"

نیلم نے عجیب خوابناک انداز میں کہنا شروع کیا —— "یہ صرف کل ہی کی تو بات ہے ناکہ آپ سورج بن کر آئے اور میری تاریک دُنیا کو جگمگا گئے۔ کل اور آج کا فاصلہ کتنا کم ہے —— مگر کوئی میرے دل سے پوچھے کہ اجنبیت اور بیگانگی کے سارے پردے کس طرح ایک ایک کر کے اُٹھ گئے ہیں —— مجھے بخدا اب بھی

یقین نہیں آتا کہ یہ جو کچھ ہونے والا ہے حقیقت ہے ——" اور اس نے اپنے چمکیلے دانتوں تلے زور سے اُنگلی دبائی ——

نواب اختر نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا —— "کیا حماقت کرتی ہو، کبھی خون نکل آیا تو —؟"

"اس محبت کے انداز پر میری سو جانیں ہوں تو وہ بھی نثار —— زندگی میں اس بات کی کب توقع تھی کہ ایسی چاہت بھی مجھے نصیب ہو گی" اس کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔

"اچھا تو تم اگلی جمعرات کو درگاہ پہنچ رہی ہو نا ——" نواب اختر نے زندگی بھر کی خوشیاں لہجے میں سمیٹ کر کہا۔

"انشاء اللہ پورا بھروسہ رکھئے ——"

"تو پھر میں چلوں ؟"

"آج تو جی چاہتا ہے کہ وقت یہیں تھم جائے۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو اس لمحہ بہ لمحہ سرکتے چاند کو پکڑ کر اپنے ماتھے پر جھومر بنا کر سجا لیتی کہ وہیں اٹک کر رہ جائے۔ ان دم بہ دم چمکتے ستاروں کو توڑ کر اپنی اوڑھنی میں کامدانی بنا کر ٹانک لیتی کہ رات یہیں رُک جائے —— لیکن مجھے خوشی یوں بھی ہے کہ ان گزرتی گھڑیوں کے ساتھ ساتھ میری زندگی کی ابتدا اور خوشیاں قریب سے قریب تر ہوتی جائیں گی۔ خدا حافظ —— اللہ نگہبان ——" نیلم کے لہجے میں محبت کرنے والی بیوی کا سارا پیار سمٹ آیا تھا ——

سیاہ برقعے میں لپٹی لپٹائی نیلم درگاہ سے نکلی اور حویلی سے آئی ہوئی بگھی میں جھجکتے، لرزتے قدموں سے، مگر دل میں گہرا اعتماد لئے یوں دھیرے دھیرے چڑھی جیسے نئی نئی دُلہن پالکی میں سوار ہوتی ہے —— ایک لمحے کو اس کا دِل زور سے ڈگمگا

گیا۔ "کہیں ایسا نہ ہو کر چولھے سے نکل کر بھٹی میں جا پڑوں ـــــ پھر کیا ہوگا، وہی در در کی ٹھوکریں، وہی نصیبوں کی مار ـــــ" لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے ان فاسد خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا ـــــ اور گھر گرہستی کے خواب بُننے لگی ـــــ نواب اختر سب کچھ ہو سکتے تھے، لیکن دغا باز نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کے چہرے کی شرافت نے یاد آکر اسے اپنے آپ ہی شرمندہ کر دیا ـــــ

**نواب اختر** کو پیچھے چھوٹ آنے والا زمانہ بالکل یاد نہ رہا۔ یہ بھی یاد نہ رہا کہ امی جان کیسی عظیم محبت والی خاتون ہیں کہ اتنے بڑے حادثے کو وہ یوں برداشت کر گئیں کہ نہ صرف بہو کا موںہہ دیکھا بلکہ وہ بھاری اور تولواں کا مدار جوڑے اور وزنی زیورات تک سونپ دیئے جو اس لئے سینت کر رکھے تھے کہ کسی خاندانی بڑے نواب گھرانے کی بہولاؤں گی تو چڑھاوے میں لے جاؤں گی۔ وہ یہ بھی بھول گئے کہ جب انہوں نے ابا حضور سے نیلم کو ساتھ لے جا کر یہ کہا تھا "ابا حضور ـــــ یہ آپ کی بہو ہے"! تو وہ کس طرح موںہہ پھیر کر کھڑے ہو گئے تھے اور ان کا بھاری بھرکم وجود کس طرح خزاں کے مارے ہوئے پتے کی طرح لرز لرز اٹھتا تھا۔ انہیں یہ بھی یاد نہ رہا کہ خاندان بھر میں اور جان پہچان والوں میں کس طرح تھڑی تھڑی مچ گئی تھی کہ رنڈی کو بیوی بنا لیا ہے۔ انہیں صرف یہ یاد تھا کہ انہوں نے جو سوچا تھا کر لیا تھا ـــــ محبت کو جیت لیا تھا ـــــ ان کی بیوی کو دُنیا والوں کے طعنے تشنوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اسی لئے وہ اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر اتنی دُور بمبئی آ بسے تھے۔ اس لئے کہ اسی طرح وہ اپنے دِل کی ملکہ کو خوش رکھ سکتے تھے انہوں نے جو سوچا کر دکھایا، ان کی تمام زندگی کا مصرف بس اب یہ رہ گیا تھا کہ وہ اسے زیادہ سے زیادہ خوشی دیں۔ اور یہ حقیقت تھی کہ اب جب کہ زندگی کے

کتنے ماہ و سال گزر چلے تھے ـــــ وہ آج بھی اسی والہانہ انداز سے اسے چاہے جا رہے تھے۔ انہوں نے اپنی جان پہچان کے لوگوں سے بالکل ناطہ توڑ لیا تھا کہ کہیں وہ آئیں اور کوئی چھوٹی سی بات بھی ایسی کر جائیں جس سے ان کی بیوی کا دل دکھ جائے اور اسے یہ یاد آجائے کہ دراصل وہ اسے بیوی کا درجہ نہیں دیتے ـــــ انہوں نے اس کا نام بھی بدل دیا تھا ـــــ نیلم سے بانا ریت کی بو آتی تھی ـــــ اب وہ اسے پُتلی کہتے تھے۔ جو سچ مچ اُن کی آنکھ کی پُتلی تھی۔

ایک دن پُتلی نے ان سے یوں ہی پوچھ لیا: "پتہ نہیں کیا بات ہے۔ حقیقت ہے یا میرا وہم، بہر حال مجھے یوں لگتا ہے کہ آپ نے کوئی خوشی کھو دی ہے ـــــ"

"کیا کہہ رہی ہو جان، مَیں نے کوئی خوشی کھوئی ہے؟ ارے مَیں نے تو تُم کو پا کر ایک دُنیا پا لی ہے ـــــ کیا کھویا اور کیا پایا، اس کا حساب تو مجھے ہی معلوم ہے ـــــ"

پُتلی اداس ہو گئی، بولی: "مَیں نے تو سبھی کچھ پا لیا، لیکن خُدا اگر اولاد بھی دے دیتا تو میری ساری زندگی سنور جاتی ـــــ پھر مَیں شاید دُنیا کی سب سے خوش نصیب عورت ہوتی ـــــ"

"ممکن ہے اولاد نہ دے کر خُدا نے اچھا ہی کیا ہو ـــــ" نواب اختر ذرا آزردگی سے بولے۔

زندگی میں پہلی بار پُتلی کے دل میں کسی نامعلوم شُبہ نے سر اٹھایا۔ چونک کر بولی: "کیوں؟ یہ بات آپ نے کیسے کہی؟"

"نہیں ایسے ہی کہہ دی ـــــ" نواب اختر ٹال گئے ـــــ "کوئی خاص بات نہیں ـــــ"

"اتنی بڑی بات ایسے ہی نہیں کہہ دی جاتی ۔ آپ کے دِل میں جو ہے آپ صاف کہتے کیوں نہیں ۔ ؟ یہی نا کہ ہمارا بیٹا بڑا ہوتا اور لوگ اُنگلی اُٹھا کر کہتے کہ یہ رنڈی کے بطن سے ہے تو شاید وہ بَرداشت نہ کر پاتا ، کیوں میں نے جھوٹ تو نہیں کہا نا ـــــ ؟"

نوّاب اختر گھبرا گئے ـــــ میرے دِل میں گھُس کر اس نے کیسے بات کی تہہ پالی ـــــ ؟ کیا اتنے دِنوں میں کبھی ایک بچّے کے بارے میں نہیں سوچتا رہا ـــــ اور کیا ہر بار یہی خیال میرے ذہن کو کچھ کے نہیں دیتا رہا ؟ وہ بلند آواز سے بطاسر ہنس کر بولے : "کمال کرتی ہو تم بھی ، جو دِل میں آئے سوچ لیتی ہو ، اور پھر اس پر رونے بھی لگتی ہو ـــــ" انھوں نے سسکتی ہوئی پتّلی کو سینے سے لگا لیا ـــــ

اس دن کی آزردگی نوّاب اختر کو ایسی لپٹی کہ اب ان کا زیادہ وقت اُداس اداس ہی گُزرتا ۔ کام دھام تو انہیں پہلے بھی نہ تھا ۔ اب بھی وطن سے ایک بندھی ہوئی آمدنی پہنچ جاتی تھی ، لیکن زندگی میں سُونے پن کا احساس شدید سے شدید تر ہوتا جاتا تھا ـــــ ویسے دیکھا جائے تو مَرد آدمی کے لئے بات ہے بھی بے ڈھب کہ خالی بیٹھا رہے ، زندگی میں کچھ نہ کچھ مصروفیت تو ہونی ہی چاہیئے ـــــ لیکن نوّاب اختر کا یہ تھا کہ یوں کہ نوّاب تھے تو کام تو کبھی کیا ہی نہ تھا ، کنوارپن میں البتہ تسکار ، کبھی شطرنج ، کبھی کھیل تماشے اور کبھی اِدھر اُدھر "تاک جھانک" کر لیتے تھے ـــــ لیکن اب تو سب کچھ تج دیا تھا ۔ حد یہ کہ اب کبھی کبھار کیرم پر آ کر ٹک گئی تھی تو وہ بھی بیوی سے ایک آدھ بازی کھیل کر اُکتا جاتے تھے ـــــ لے دے کر اتنا مشغلہ رہ گیا تھا کہ کبھی دِل نہ لگے تو کار میں بیوی کو بٹھال کر بمبئی کی چکنی چکنی لمبی لمبی سیاہ سڑکوں پر لمبی ڈرائیو کے لئے نکل گئے ـــــ لیکن چند روز سے

وہ اس طرف سے بھی بَد دِل ہو گئے تھے ـــــ ان کی صحت بھی جواب دیتی جا رہی تھی ـــــ ویسے تو عمر کا بھی تقاضا تھا۔ لیکن بال کچھ زیادہ ہی تیزی سے سفید ہوتے جا رہے تھے ـــــ دھیرے دھیرے ان کے سینے میں بھی درد رہنے لگا ـــــ اکثر بیٹھے بیٹھے دِل پکڑ لیتے ـــــ پتلی ان کی یہ حالت دیکھتی مگر کچھ سمجھ نہ پاتی۔ کیوں کہ ان کے تعلق سے وہ محبت کے علاوہ کچھ اور سوچ بھی نہ سکتی تھی ایک دن ان کو زیادہ تکلیف تھی، پتلی انہیں بے حد مجبور کر کے خود بمبئی کے بڑے ہسپتال لے گئی۔ وہاں ان کے معائنے ہوئے اور اگلے ہفتہ پھر بُلایا گیا ـــــ اسی طرح کئی بار کے آنے جانے اور کئی معائنوں کے بعد ایک دن انہیں یہ سُنایا گیا کہ انہیں کینسر ہو چکا ہے۔ کچھ تو مرض ہی تکلیف دہ اور پھر اس سے سوا یہ احساس کہ میں کینسر کا مریض ہوں ـــــ نوّاب اختر بالکل ہی بستر سے لگ کر رہ گئے۔ مارے تکلیف کے ان کا چہرہ ذرا سا نکل آیا ـــــ پتلی نے خدمت گزاری میں دِن رات ایک کر دیے۔ جب دیکھو تب بستر سے لگی کھڑی ہے ـــــ نہ دن کو دِن سمجھا نہ رات کو رات ـــــ جب بھی نوّاب اختر کی آنکھ کھُلتی، دیکھتے کہ پتلی پاس ہی بیٹھی ہے ـــــ وہ اسے بار بار سونے کو کہتے مگر وہ ٹال جاتی ـــــ حد یہ تھی کہ دِن میں بھی نہ سوتی۔ مُسلسل جاگنے سے یہ ہُوا کہ اس کی نیند ہی اُڑ گئی۔ اب تو اگر وہ سونا چاہتی تو بھی شاید ہی آنکھیں جھپک پاتیں ـــــ بس ایک ہی دُھن اور ایک ہی دُعا تھی کہ "اے خُدا تو میرا سہاگ لازوال کر دے۔ ان کے سارے دُکھ مجھے دے دے ـــــ"، لیکن جس کے دُکھ ہوں اُسی کو بھُگتنے پڑتے ہیں۔ نوّاب اختر اور بھی گھُلتے گئے۔

ایک دِن پتلی نے اپنی ایک سہیلی کی رائے دینے پر ایک سن رسیدہ اور تجربہ کار حکیم صاحب کو بلُوا لیا ـــــ بڑی دیر تک وہ معائنہ کرتے رہے، اور پھر

وثوق سے بولے "مَیں شرطیہ کہتا ہوں کہ آپ کو کینسر وینسر کچھ نہیں ہے ـــــ"
بیماری کی زردی کے باوجود ایسی اُمیدافزا بات سُن کر نواب اختر کے چہرے پر سُرخی جھلملا گئی ـــــ حکیم صاحب کہتے رہے: "ایکسرے میں غلط عکس نہیں اُتر سکتا، لیکن مَیں آپ کو بتاؤں کہ جس کو سب اور آپ کینسر سمجھ بیٹھے ہیں وہ کینسر نہیں غم کا زخم ہے ـــــ"

"جی ـــــ" نواب اختر نے حیرت سے پوچھا: "کیا فرمایا آپ نے؟"

"جی ہاں، میرے علاج میں کئی ایسے مریض رہے ہیں جن کو کسی نہ کسی غم یا صدمے نے بے حد مار رکھا تھا، ایسا کہ وہ کسی سے اظہار تک نہ کر پاتے، اور سہتے رہنے کی ایک حد وہ بھی آئی کہ سینے میں ایک آبلہ سا اُبھر آیا۔ اور آپ کو حیرت ہو گی کہ جب نفسیاتی طور پر ان کا علاج کیا گیا اور ان سے کُھل کر دل کی بات کہہ دینے کو کہا گیا اور انھوں نے وہ بات کہہ بھی دی تو چند روز میں وہ زخم مندمل ہو گئے ـــــ" حکیم صاحب اتنا کہہ کر چپ ہو گئے ـــــ نواب اختر بھی بہت دیر تک لیٹے رہے۔

ممکن ہے آپ کے دِل میں کوئی زخم ایسا پل رہا ہو کہ جس کو آپ اپنی شریک حیات تک سے نہ کہہ سکے ہوں۔ مَیں اس غم کی نوعیت نہیں جانتا، لیکن یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ کی زندگی کو کسی نہ کسی غم نے دبوچ ضرور رکھا ہے ـــــ اگر ایسا نہ ہوا تو مَیں اپنی طبابت کو لات مار دوں گا ـــــ" بڑی دیر تک عجیب سی خاموشی پورے ماحول پر چھائی رہی ـــــ پھر حکیم صاحب خود ہی بول اُٹھے ـــــ "لیکن مَیں آپ کا علاج دواؤں سے بھی کروں گا، اس لئے کہ یہ سوچ سوچ کر کہ آپ کینسر کے مریض ہیں ـــــ آپ ضرورت سے زیادہ کمزور ہو گئے ہیں ـــــ خُدا نے چاہا تو آپ چند ہی دِن میں جوانوں سے بڑھ کر جوان ہو جائیں گے ـــــ"

برابر کے کمرے میں پُتلی فرطِ مسرت سے کانپ رہی تھی ——" اگر اللہ نے ایسا کر دیا —— انہیں کینسر نہ ہوا، وہ کس قدر خوش ہوں گی۔"

حکیم صاحب کے چلے جانے کے بعد وہ کمرے میں آئی تو اس طرح جیسے شراب پی رکھی ہو —— ہاں اس نے خوشی کی شراب ہی تو پی رکھی تھی۔ قدم رکھتی کہیں تھی، پڑتا کہیں تھا۔ اس کا دِل نئی خوشیوں سے معمور تھا۔

"آپ نے سُنا حکیم صاحب کیا کہتے تھے؟" وہ چہچہائی۔

"مریضوں کو خوش کرنے کے لئے معالج سدا ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔" وہ اوپری بناوٹ سے بولے۔ حالاں کہ اُن کا اپنا دِل خوشی سے اُچھل رہا تھا۔

"مگر مجھے تو پورا یقین ہے کہ حکیم صاحب کی تشخیص صحیح ہے —— لیکن ——" وہ رُک رُک کے لہجے میں بولی: "مجھے بڑی عجیب سی بات یہ لگی کہ پتہ نہیں کہ آپ کے دِل کو کون سا غم دبوچے ہوئے ہے جس نے پھوڑے کی شکل اختیار کر لی ہے ——"

نواب اختر کا ہنستا ہُوا چہرہ سنجیدہ ہوگیا بولے: "کیا سچ مچ تمہیں حکیم صاحب کی تشخیص صحیح لگی ——؟"

"میں تو ایمان لے آئی ——" وہ گہرے یقین سے بولی۔

"تو اسی خوشی میں آج رات تُم نیند بھر کر سو جاؤ —— اس لئے کہ میری اس نامراد بیماری میں تُم نے اپنی ان پیاری پیاری نرگسی آنکھوں پر نیند حرام کر لی ہے ——" پتلی حیرت سے بولی: "آپ کو ایک بات پر تعجب ہوگا کہ مُسلسل جاگنے سے اب یہ ہوگیا ہے کہ مجھے فرصت ملے اور سونا چاہوں تو بھی نیند آتی ہی نہیں ——" کل جب آپ سو رہے تھے تو میں نے سوچا میں بھی دو گھڑی آنکھ جھپکا لوں —— ساری رات یوں ہی بیت گئی۔ چاند اِدھر سے اُدھر ہوگیا،

سُورج نکل آیا، مگر مَیں پڑی جاگتی رہی ——"

"یہ تو بڑی خراب بات ہے —— ایک طرح کی بیماری ہی سمجھو —— کل حکیم صاحب آئیں تو دکھا لینا ——"

حکیم صاحب کا علاج اور طریقِ کار ایسا تھا کہ واقعی آہستہ آہستہ نوّاب اختر صحت مندی کی طرف آتے گئے۔ پہلے وہ حکیم صاحب کی آمد کے وقت بہت جھلائے جھلائے سے رہتے لیکن دھیرے دھیرے یہ ہوا کہ وہ بے چینی سے گھڑی دیکھ کر وقت گزارنے لگے کہ کب حکیم صاحب کے آنے کا ٹائم قریب آتا ہے۔

ایک دِن اچانک حکیم صاحب نے نوّاب اختر سے پوچھ لیا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو —— "تو نواب صاحب آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ آپ کو کس غم نے ان حالوں تک پہنچایا تھا ——"

بہت دیر تک تو نوّاب اختر چپ ہی رہے۔ پھر اچانک انہیں یہ خیال آیا کہ ممکن ہے زندگی بھر پھر کبھی کوئی دوست اور ہمدرد ملے نہ ملے اور دِل کی گھٹن اتنی بڑھے کہ پھر سے وہ فریش ہوجائیں —— بہت سنبھل سنبھل کر وہ کہنے لگے —— "حکیم صاحب —— جوانی میں ایک بھول ہوگئی تھی ——" بازو کے کمرے میں پتلی چونک اُٹھی ——

حکیم صاحب ہمہ تن گوش بن گئے۔ "کیسی بھول؟"

اِدھر اُدھر دیکھ کر کہ کہیں پتلی سُن نہ رہی ہو وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنے لگے "پتہ نہیں حکیم صاحب آپ نے محبت کی ہے یا نہیں —— مَیں نے کی تھی اور محبت جیتی تھی —— لیکن یہ سُن کر آپ کو حیرت ہوگی کہ میری محبت کا مرکز اور کوئی نہیں، ایک طوائف تھی، جسے مَیں نے ہر ممکن کوشش سے بیوی بنا کر

ہی چھوڑا ـــــ مجھے گویا سب کچھ مل گیا ـــــ سب کچھ پا لیا ـــــ لیکن ۔۔۔۔"
وہ کچھ رُک کے : "لیکن حکیم صاحب جب سر میں سفید بال اور چہرے پر جھرّیاں نمودار ہوئیں تو مجھے یہ احساس ہوا کہ میں نے پایا تو کچھ نہیں ـــــ محبت کو میں آج بھی افضل مانتا ہوں، لیکن ہے تو وہ ایک غیر مادّی شے ہی ـــــ میں ایک دُنیا سے اس محبت کے لئے ٹوٹ گیا۔ دُنیا میں ہوتے ہوئے بھی دُنیا سے دُور ہو گیا ـــــ اور جب سوچتا ہوں کہ یہ سب کیوں ہوا تو اس لئے کہ وہ طوائف تھی۔ اگر شریف خاندانی ہوتی تو کیوں یوں مُونہہ چھپا کر زندگی گزارنی پڑتی؟ لیکن بھُول کا انجام کیا ہوتا ہے؟ عورت کے لئے آنسو اور مرد کے لئے پچھتاوا اور غم ـــــ سو آپ میری حالت دیکھ ہی رہے ہیں۔ حالانکہ یقین کیجئے۔ مجھے یہ اعتراف ہے کہ زندگی میں اس سے بہتر بیوی شاید ہی مل سکتی ہوتی ـــــ" نواب اختر چُپ ہو گئے۔
حکیم صاحب سر ہلاتے رہے۔ جب اُنھوں نے دیکھا کہ مریض کا دِل ہلکا ہو چکا ہے اور جذبات ٹھنڈے پڑ چکے ہیں تو اُٹھتے ہوتے بولے : "خیر آپ اس کا خیال نہ کریں ـــــ یہ ایسی کوئی بھُول نہ تھی جس پر آپ اتنا پریشان ہوتے کہ زندگی لُٹا بیٹھتے، جب کہ آپ کو یہ اعتراف بھی ہے کہ آپ کی بیوی دُنیا میں واحد بیوی ہے جو اتنی صفات کی حامل ہے ۔۔۔ ۔۔۔"

"جی ہاں، یہ تو میں مرتے دَم تک کہوں گا ـــــ" نواب اختر بولے۔
پھر حکیم صاحب کو اُٹھتا دیکھ کر وہ اچانک جیسے کچھ یاد کر کے بولے : "ارے سُنئے حکیم صاحب، دماغ پر پتھّر پڑ گئے ہیں ـــــ کچھ یاد ہی نہیں رہتا ـــــ روز آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ ذرا بیگم صاحبہ کو بھی دیکھ لیجئے۔ پتہ نہیں کیا بیماری ہو گئی ہے کہ سونا چاہئیں بھی تو نیند آتی ہی نہیں ـــــ بے چاری میری تیمارداری اور خدمت میں اتنا جاگی ہیں کہ اب نیند ہی اُڑ کر رہ گئی ـــــ"

"فکر نہ کیجئے۔ زیادہ پریشانی میں عموماً ایسا ہو جاتا ہے۔ پھر بیگم صاحبہ تو آپ کو بے حد ہی چاہتی ہیں، کیوں کہ جب کبھی میں نے دیکھا یہی دیکھا کہ آپ کے لئے کچھ نہ کچھ پکار ہی ہیں —— آپ کا کام کر رہی ہیں ۔۔۔۔۔"

**حکیم صاحب** کھنکارتے ہوئے برابر کے کمرے میں داخل ہوئے اور پلنگ پر لیٹی ہوئی پتلی کی نبض دیکھنے کے لئے اس کی کلائی تھامی تو انہیں پتہ چلا کہ بغیر کسی دوا کے وہ ایسی نیند سو چکی ہے جس سے آج تک کوئی نہیں جاگ سکا ——

# باندی

ریشم اتنی حسین تھی کہ بس رے بس!!

چاند نگر میں میلہ بھرا تو اوروں نے جانے کیا کیا خریدا۔ مگر نواز، مگر سونا کر چاندی لے آیا —— ایسی زوردار باندی کے پانچ سو روپے قطعاً زیادہ نہ تھے —— بلکہ بہت کم تھے ——

"ارے یار پانچ سو تو اس کی ایک رات کا مول ہے۔ یہ تو زندگی بھر کی بات ہے —— جب تک چاہے نبھاؤ —— جب تک جی چاہے استعمال کرو —— اور جی بھر جائے تو ایک لات رسید کر دو ——" نواز اپنے دوستوں میں فخر سے کہہ رہا تھا ——

جب نواز کے دو چار دوستوں نے اسے یہ بات سنائی کہ لونڈیوں، باندیوں والا دور آج بھی باقی ہے تو اسے بالکل یقین نہ آیا —— یقین آئے جیسی بات بھی تھی نہیں —— وہ دور تو مدت ہوئی بیت گیا۔ ہوا یوں کہ محض دل لگی دل لگی میں

جب نواز اور اس کے دوستوں کی ٹولی چاند نگر کے میلے پہنچی تو نواز نے رنگ ہی جدا پایا ـــــ یہ بات نہیں تھی کہ چوڑیوں، کپڑوں، برتنوں اور کھلونوں کی طرح چھوکریوں کو بھی دوکانوں میں سجا کر رکھ دیا گیا ہو ـــــ بلکہ بات یوں تھی کہ یہ اشیا بیچنے والیاں بڑی طرح دار لڑکیاں تھیں جن کے ماں باپ نے جان بوجھ کر انہیں دوکان دار کے روپ میں سجا رکھا تھا کہ گاہک مال سے زیادہ دوکان دار کی ٹوہ لے ـــــ دیکھے پرکھے اور دام کے ساتھ دل بھی دے بیٹھے

نواز ایک دوکان پر یوں ہی رُک گیا ـــــ

"اے بی بی ـــــ ذرا انگوٹھیاں تو دکھانا ـــــ" اور ریشم نے اپنی چکنی چکنی ہتھیلی پر سرخ رنگ کی ایک انگوٹھی رکھ کر نواز کے سامنے کیا بڑھائی کہ نواز تو چکرا گیا۔

ریشم کا باپ پیچھے کھڑا صورتِ حال کا جائزہ لے رہا تھا۔ شکار پھنس چکا تھا پھر وہ آگے بڑھا اور بڑے کامیاب لہجے میں بولا :

"حضور کو مال پسند آیا۔ ؟"

نواز نے گڑبڑا کر دیکھا ـــــ پھر ریشم سے پوچھنے لگا ـــــ "قیمت ـــــ ؟"

باپ بولا : "ارے حضور اس نگ کی قیمت کیا پوچھتے ہیں آپ ـــــ بس آپ کو پسند آگئی یہی کیا کم ہے۔" نواز نے دیدے پھاڑ کر اسے دیکھا تو وہ ہنس کر بولا ـــــ "بڑی لاجواب انگوٹھی ہے سرکار ـــــ"

نواز بڑا تنو مند تھا، مگر اسے چکر پہ چکر آنے لگے ـــــ بڈھا پھر بول اٹھا :

"یہاں سمجھ نہ پڑ رہا ہو تو حضور میری جھونپڑی پر ہی تشریف لے آئیں۔" اور قبل اس کے کہ نواز جواب دیتا، اس نے اس کے کوٹ کی جیب میں پتے والی پرچی

ٹھونس دی۔

شام کے جھٹ پٹے میں جب نواز سہمے سہمے اس پتے پر پہنچا تو محلّے بھر میں گہما گہمی مچ رہی تھی —— اس کے پہنچتے ہی ادھر ادھر سے عورتیں، بچے سر نکال نکال کر دیکھنے لگے ——

"ارے وہ آگیا——"

"ارے ریشم کا سگا آگیا——"

"اری او بہنا، ریشو چلی —— دیکھو تو کیسا بانکا آیا ہے ——"

نواز کو سمجھتے دیر نہ لگی کہ اس کی آمد کے چرچے یہاں سے وہاں تک پھیل گئے ہیں اور یہ کہ ریشم تقریباً اس کی ہو چکی ہے —— بوڑھا شور شرابا سن کر باہر نکلا، اور دیکھتے ہی دانت اچکانے لگا —— "حضور آگئے —— مجھے معلوم تھا کہ لوہا کھینچ کر رہے گا —— آئیے تشریف لائیے ——"

نواز گھر میں داخل ہوا، جگ مگ کرتا لیمپ جل رہا تھا۔ جس کی روشنی میں ریشم پری کی طرح چم چما رہی تھی —— نواز کو سمجھتے دیر نہ لگی کہ یہ لیمپ صرف آج کی رات کے لئے حاصل کیا گیا ہے کہ اس کے اجالے میں حسن دمکے اور مول بڑھے —— ایک کونے میں دو لڑکیاں اور بھی بیٹھی ہوئی تھیں، بظاہر انجان مگر چہرے تمتمائے ہوئے —— نواز نے سراسیمہ ہو کر چاروں طرف دیکھا—— مذہب وذہب کا وہ ایسا قائل نہ تھا، مگر پھر بھی اسے حیرت ہوئی کہ یہ کون سی نگری ہے، کون سا دیش ہے، کون سا ماحول، جہاں مذہب کے نام پر نہ بیاہ ہوتا ہے نہ شادی رچتی ہے —— بس مٹھی بھر روپوں کے عوض عمر بھر کے لئے ایک جوانی کسی کے ہاتھ سونپ دی جاتی ہے۔ غریبی بے شک بری چیز ہے، —— مگر —— مگر ——!!

اس نے اپنا سر جھٹک کر ان فاسد خیالات کو نکال پھینکنا چاہا۔ "اونہہ میں کون بھلا مذہبی رہنما ہوں جو ان مذہبی باتوں پر دھیان دوں —— بھوکے کو یہ نہیں سوچنا چاہیئے کہ یہ روٹی جو سامنے رکھی ہے کہاں سے آئی —— کیوں آئی بُنیادی سوال یہ ہے کہ بس سامنے ہے اور چونکہ سامنے ہے اس لئے کھا لو —— کھاؤ بیٹا ——" اس نے خود کو آمادہ کیا ——

بُڈھا ایک پکے بیوپاری کی طرح چالو ہو گیا۔

"حضور —— نام ریشم اور سچ مُچ بھی ریشم ہے —— میں مونہہ سے کچھ نہ بولوں گا —— آپ ہی سوچ سمجھ کر دام لگا لیں ——"

نواز اس ماحول سے ذرا گھبرا سا گیا تھا —— اس نے حیل و حجت کی بجائے مناسب یہ جانا کہ جیب سے چند کرارے نوٹ نکالے اور بُڈھے کے حوالے کر دے —— اور اُس نے کیا بھی یہی —— بڈھے نے لیمپ کی روشنی میں نوٹ گنے اور اس کے مونہہ سے ایک بچکانہ سی حیرت اور خوشی بھری بے چینی نکلی اور وہ چلّایا:

"اری او نورن —— ریشم کا مول مِل گیا —— لے اسے سرکار کے ساتھ تو کر دے ——" اندر سے ایک کالی کھجنگ عورت، جو قطعاً ریشم کی ماں نہیں سجتی تھی، برآمد ہوئی —— دَھڑا دَھڑ ٹرنک کھول کر اس نے لال اوڑھنی نکالی —— تو اکھینچ کر اس پر اُنگلی پھیری، ریشم کی آنکھوں میں لپا چھپ کاجل کے ڈورے بھر کر، سر پر لال آنچل ڈال کر، اسے قدرے دھکیل کر نواز کے سامنے کرتی ہوئی بولی:

"لو اپنی باندی کو سنبھالو ——"

ریشم نے کسمسا کر کالی عورت کو دیکھا، پر مونہہ سے کچھ نہ بولی —— نواز جب اسے لے کر باہر نکلنے لگا تو دو لڑکیوں میں سے جو بڑی تھی وہ اُٹھی اور اندر سے

دوڑ کر ایک پوٹلی اٹھا لائی ــــ بڑے دُکھے لہجے میں بولی ــــ

"آپا راستے میں بھوک لگے گی تو یہ روٹی اور بیسن کھا لینا ــــ"

آپا چھم چھم رونے لگی ــــ

نواز تو آگے ہی اس سارے بکھیڑے سے باؤلا سا ہوا جا رہا تھا ــــ ریشم کا رونا دیکھ کر تو سٹ پٹا ہی گیا ــــ دھیرے سے اس کا ہاتھ تھام کر بولا :

"اچھا اب روؤ دھوؤ نہیں ــــ ہمیں دیر ہو جائے گی ــــ شہر جانا ہے گاڑی پکڑنی ہے ــــ"

ریشم نے ایک تنا کے کے ساتھ اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور نواز اس ادا کو ادائے دلبری جان کر جھوم گیا۔

وہ رات تو دوستوں کے ساتھ نواز نے گاؤں ہی میں گزار دی اور رات بھر ریشم کی تعریف کے سوا اس کے پاس اور کوئی موضوع ہی نہ تھا ــــ وہ بازو کے کمرے میں بیٹھی ریشم کے متعلق مسلسل کہے گیا۔

"ارے یار ــــ پانچ سو ــــ پانچ سو تو کیا پانچ ہزار بھی کم ہیں ہاں ــــ"

نواز اُن مر بھکوں میں سے نہ تھا جو کھانا دیکھتے ہی تبا ہاتھ مونہہ دھوئے بس پل پڑتے ہیں۔ وہ بڑے سلیقے سے، سکون سے مونہہ ہاتھ دھو کر، دسترخوان بچھوا کر مزے لے لے کر کھانے کا عادی تھا ــــ صرف ایک دِن ہی کی تو بات تھی ــــ اپنا گھر کون بڑا دُور تھا جو وہ ایسی تندیدی حرکت کا مظاہرہ کرتا ــــ اطمینان سے سوچ سوچ کر مسرور ہوتا رہا۔ ایک بار وہ اپنے دوست سلیم کی شادی میں بروقت نہ پہنچ سکا تھا ــــ شادی کا دِن ٹل کر دوسرے دن کے ہنگامے میں پہنچا تھا، جب کہ چوتھی کے دھوم دھڑاکے تھے ــــ سلیم نے اپنی دُلہن کا

اس سے پردہ نہ کرایا تھا —— ہرے ریشم کے سرسراتے لباس میں جب اس نے بیگم سلیم کو دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہا —— پھر اس کے دل میں، ذہن میں ایک ہی تمنا رہ گئی کہ کوئی پھول سا بدن ہو —— ہرا ہرا سرسراتا لباس ہو —— اپنا قیمتہ ہو، مگر بیوی نہ ہو —— کرائے کی عورت ہو ——

وہ عورتوں کے بارے میں بُری طرح اس نظریے کا قائل تھا کہ پیر کی جوتی جب چاہے بدل لو —— یہ تصور ہی اس کے لئے اذیت ناک تھا کہ مسلسل ایک ہی بیوی سے برسوں نباہ کئے جاؤ —— انسان ایک دن قورمہ کھاتا ہے تو دوسرے دن بھاجی پر جی چاہتا ہے۔ تیسرے دن بریانی پر —— چوتھے دن مرغی۔ پانچویں دن ۔۔۔ یہ کیا حماقت ہے۔ روز دال —— روز دال —— وہ نئی نئی ہانڈیاں کھانے کا عادی تھا —— اور کہتا بھی تھا —— شہر کی عمدہ کوٹھیوں میں بسی ایک کالونی میں وہ چھڑا چھانٹ مزے کرتا تھا —— ماں، باپ کو بس تھاپ پہ تھاپ دئے جا رہا تھا کہ "کروں گا شادی ضرور کروں گا ——" اور آئے دن شادی رچتی، مگر دُلہن ہر روز نئی ہوتی —— ماں باپ کو کیا پتہ تھا کہ شہر میں کیا کھیل کھیلے جاتے ہیں —— پاس پڑوس والوں سے فخریہ کہتے پھرتے —— لڑکا انگریزی نوکری میں ہے۔ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔

اب تو نواز کے نصیب زوروں پر تھے، پیسے رُپلے کی اسے کبھی کمی نہ پڑی۔ —— معقول تنخواہ تھی، خود ماں باپ گھر کے رئیس —— پیسہ کیا ہوتا ہے —— کہاں سے آتا ہے، یہ جاننے کی کبھی کوشش کی نہ اس کی ضرورت ہی پڑی —— اب پانچ سو میں تو کئی دنوں کے ٹھاٹ تھے —— اور ریشم نظر بھی ایسی آتی تھی کہ ستار کے تنے تاروں کی طرح دلوں تُن تُن بجے جائے گی ——

دوسرے دن نواز ریشم کو لے کر اپنی کالونی میں پہنچ گیا —— ریشم کو گھر بٹھا کر

وہ سیدھا صدر مارکیٹ گیا اور بڑھیا قسم کا ہرا بنارسی لباس خرید لایا ــــ آتے آتے لیڈیز امپوریم سے سنگھار کا بکسا بھی لے آیا ــــ ہر چند کہ ریشم خود سراپا سنگھار تھی، مگر بھئی مردوں کے شوق !!

کل سے اب تک ریشم نے نواز سے ایک بات تک نہ کی تھی ــــ راستے میں اُس نے کھانے پینے کی چیزیں دلانی بھی چاہیں مگر وہ مونہہ پھیر کر بیٹھ گئی اور جب بھوک لگی تو اپنے ساتھ کی بیسن روٹی کھانے بیٹھ گئی ــــ مگر نواز کو یہ سب کچھ بہت اچھا لگتا۔ کرائے کی عورتیں وہ اب تک استعمال کرتا رہا تھا۔ جو بغیر نخروں ٹخروں کے من مانی کرنے دیتیں۔ ریشم کے تو سارے انداز نئی بیاہیوں کے سے تھے۔

ــــ وہ بغیر دولہا بنے ہی شادی کے مزے لوٹ رہا تھا ــــ مارکیٹ سے سامان لا کر اس نے ریشم کے سامنے ڈھیر کر دیا اور بڑی لگاوٹ سے بولا:

"جانِ من ــــ اب ذرا نہا دھو کر چوتھی کی دلہن تو بن جاؤ ــــ"!

ریشم مونہہ سے کچھ نہ بولی ــــ بس کپڑے سمیٹ کر غسل خانے میں چلی گئی۔

اور جب واپس آئی تو؟ اتنی حسین تھی کہ بس رہے بس!

اب نواز کا سارا صبر لٹ گیا ــــ وہ لپکا کہ اس کا ہاتھ تھام لے، مگر وہ اس کے ہاتھ سے یوں پھسل گئی مانو عورت نہ تھی مچھلی تھی ــــ نواز نے کچھ جھلا کر کچھ کھسیا کر، مگر بظاہر ہنس کر کہا ــــ جانِ من ریشم کی طرح مت پھسلو، کانٹوں کی طرح مجھ سے اُلجھ جاؤ ــــ"

مگر نواز پر چودہ طبق روشن ہو گئے، جب وہ گاؤں کی زر خرید باندی بڑے تیکھے لہجے میں اُس سے بولی ــــ

"پہلے مجھ سے نکاح کرو ــــ تب ہاتھ لگانا ــــ"

نواز کتنی ہی دیر تک تو دیدے پٹ پٹا کر اُسے دیکھا کیا ــــ پھر سنبھل کر

دیہاتی لہجے میں بولا :

"کیا ــــــ ؟"

"میں کہتی ہوں پہلے نکاح کرو نکاح ــــــ میں مسلمان ہوں۔ عزت کی قیمت جانتی ہوں۔ میں ایسے تو تمہیں کبھی ہاتھ نہ لگانے دوں گی ــــــ" اس کا لہجہ اتنا مضبوط اور مکمل تھا کہ دل میں تو نواز ڈر سا گیا، مگر اُسے ڈرانے کے لئے قہقہہ مار کر بولا ــــــ

"واہ ری میری چوکھٹی کی دُلہن ــــــ سچ مچ ہی دلہن بننے کے خواب دیکھ رہی ہے ــــــ" اور اُس نے جھٹ دھرمی سے ریشم کو اپنی طرف کھینچ لیا ــــــ مگر نواز جو کہ اتنا تنومند تھا کہ ناشتے میں اصلی گھی میں ڈوبے پراٹھے، انڈے۔ بادام کے حلوے، سیروں گوشت کی یخنی، اُوپر سے دُودھ پیا کرتا تھا، اور اپنے قریبی دوستوں میں رُستم کے نام سے مشہور تھا ــــــ اس کے بار بار پھسل پڑنے پر تھک کر چور ہو گیا، اور جب آخری بار اس نے زور لگانا شروع کیا تو ریشم نے ایسی بھرپور لات اس کے پیٹ میں جمائی کہ اگر وہ ذرا سنبھل نہ جاتا تو سدا کے لئے عورت ذات کے لئے بے ضرر ہو گیا تھا ــــــ اس نے گھور کر ریشم کو دیکھا، وہ بڑی بے باکی سے کمر پر ہاتھ رکھ کر کہہ رہی تھی :

"میں کبھی سے زنا بالجبر کی قائل نہیں ــــــ مجھے میاں چور ہے ــــــ وہ عورتیں آپ حرام زادیاں ہوتی ہیں جو مردوں کے آگے پسر جاتی ہیں ــــــ میں کوئی ایسی لڑکی پڑی نہیں جو اپنے آپ کو بیچ دوں ــــــ"

نواز جلبلا گیا ــــــ "ہونہہ باندی کی ذات ــــــ پانچ سِکّوں کی چھوکری ــــــ باتیں دیکھو تو اتنی بڑی بڑی ــــــ تیرے ماں باپ کے آگے، خود تیرے سامنے جب سکے پھینکے تب کیا تیری آنکھیں پھٹ گئیں، جواب اِترا رہی ہے کہ میں

لڑکی پڑی نہیں ——"

ریشم کے لہجے میں پہلی بار دکھ بھری نرمی اُمڈی " تم سمجھتے ہو وہ میرے ماں باپ ہوتے تو وہ مجھے بیچتے —— ؟ حرام زادوں نے دھندہ چلا رکھا ہے لڑکیاں اُڑا کر لاتے ہیں، اور بیچ کر دام کھرے کرتے ہیں۔ مگر میں بکنے والیوں میں سے نہیں —— میرے اپنے ماں باپ نے مجھے نماز سکھائی تھی —— خدا کو میرے دل میں بٹھایا تھا —— مذہب کی باتیں بتائی تھیں —— شریف زادیاں کہیں اپنی عصمت گنواتی ہیں —— !"

نواز اُلجھ کر بولا —— " یہ پاکدامنی صرف اس وقت تک کی ہے۔ جب تک پیٹ میں بیسن اور روٹی باقی ہے —— بھوک سے مار نہ ڈالوں تو اپنے باپ کی اولاد نہیں —— کب تک بھوکی مرنے گی —— ؟"

ریشم پہلی بار ہنسی —— "عصمت لٹانا بھی گناہ ٹھہرا، اور خودکشی بھی۔ تو پھر میں خودکشی ہی کیوں نہ کر لوں گی —— ؟" وہ چند قدم چل کر گیلری تک گئی اور بولی —— " اتنی اُونچائی تو گر کر مرنے کے لئے بہت کافی ہے۔"

وہ بڑے مضبوط ارادے کے ساتھ ہنس دی —— نواز دیکھتا رہ گیا —— اس قدر پیاری کھن کھناتی ہنسی —— جسم سونا تھا تو ہنسی چاندی تھی —— ہونٹ یاقوت تھے تو دانت ہیرے —— ایسے لعل و گہر ہیرے جواہر اور سونے چاندی کا ڈھیر سامنے تھا اور وہ اپنی ہٹ پر اڑا ہوا تھا —— کافی نامعقولیت تھی اچھا چلو میں شادی کر بھی لوں تو میرا کیا بگڑے گا —— جب جی بھر جائے گا طلاق دے دوں گا —— وجہ یہ بیان کر دوں گا کہ آبرو باختہ تھی —— نواز نے پھر سے آنکنا شروع کر دیا ——

اور ریشم کہہ رہی تھی —— "میں کچھ تمہارے روپے پیسے کی بھوکی نہیں

ہوں۔ تم شوق سے میرا مہر ایک روپیہ نہ باندھو، مگر شادی تو ہو گی ہی ـــــ تم کیا چاہتے ہو میں حرامی بچوں کی ماں کہلاؤں ـــــ؟"

نواز قہقہہ مار کر ہنسا ـــــ "بچے ـــــ اجی آپ ہیں کس خوش فہمی میں محترمہ ـــــ بچے کچوں کا سلسلہ ہی سرے سے غلط ہے۔ میں اس قسم کے معاملے اختیار کرنے سے پہلے ہمیشہ برتھ کنٹرولنگ کا خیال رکھتا ہوں ـــــ برتھ کنٹرول سمجھتی ہیں نا آپ ـــــ یعنی یہ کہ بچوں کی پیدائش پر پابندی ـــــ"

"لیکن یہ تو ان عورتوں کی بات ہے جو کرائے کی ہوتی ہوں گی ـــــ میں تو تمہاری بیوی بن کر رہوں گی ـــــ عورت بن کر ـــــ زمین بن کر ـــــ اور زمین اس وقت تک خوب صورت اور مکمل نہیں ہوتی جب تک کہ اس پر فصل نہ لہلہائے ـــــ"

"اچھا آپ شاعری بھی فرما لیتی ہیں ـــــ" نواز جل کر بولا ـــــ "کوئی دیوان بھی چھپا ہے آپ کا ـــــ؟"

ریشم کچھ نہ بولی ـــــ نواز بھی کچھ نہ بولا ـــــ بڑی دیر تک وہ ریشم کو گھورتا رہا ـــــ گھنیرے بال ـــــ کاجل سے بھرپور آنکھیں، شیشے کی طرح چمکتا بدن۔ تیکھے تیکھے نقوش ـــــ بگڑے بگڑے تیور ـــــ کیا تھا جو اس میں نہیں تھا ـــــ؟ لوگ یہ بات کیوں کر کہہ سکتے ہیں کہ خدا نے کوئی حسن مکمل نہیں پیدا کیا ـــــ ہر کسی میں کوئی نہ کوئی خامی رکھ دی ہے ـــــ ہاں ہے تو سہی ـــــ مزاج اُف، تیزی تندی کس بلا کی ہے کہ پٹھے پر ہاتھ تک نہیں دھرنے دیتی ـــــ شاید یہ بھی خوبی ہی ہے ورنہ میں کیسے اس بات پر راضی ہو جاتا کہ چلو یوں نہیں تو یوں ہی سہی ـــــ داشتہ نہیں تو بیاہتا سہی ـــــ؟

خودکشی کی بات نے نواز کو واقعی ڈرا دیا ـــــ وہ ریشم اتنے بگڑے تیوروں

کی مالک تھی کہ ذرّہ بھی یہ احساس نہ ہوتا تھا کہ بات پر بات جما رہی ہے ـــــ جو وہ کہتی تھی حقیقت سے پُر ـــــ خیر یہ تجربہ بھی بُرا نہیں ـــــ مگر یاد رکھنا ایسا بدلہ لوں گا ـــــ عصمت اور عزت کا وہ چسکا دماغ سے نکالوں گا کہ بس یاد کرتی رہ جانا ـــــ ہاں ـــــ

دوسرے دن نواز اپنے چار پانچ دوستوں کے ساتھ ایک قاضی اور مولوی کو بھی سمیٹتا آیا، اور اسی ہرے ہرے زرتار نہین جوڑے میں لپٹی ہوئی ریشم کا ایک سو پچیس روپے مہر کے عوض نواز خاں سے عقد ہو گیا ـــــ

سہاگ رات کو ریشم کے تیور ہی بدل گئے ـــــ وہ تیزی اور تندی ایک شرمیلی۔ لجاتی خود سپردگی میں بدل گئی۔ جب کہ دل نہتا بے کسی میں سما جا ـــــ اور جسم شرم سے کسماتا رہتا ہے ـــــ ریشم سرکتے سرکتے آخر پلنگ کی پٹی کے پاس پہنچ گئی ـــــ یوں کہ اب جیسے اس کو کائنات کے کسی گوشے میں جائے پناہ نہیں مل سکتی تھی ـــــ اور حالانکہ اتنا گھر وسیع تھا کہ وہ چاہتی تو ابھی نواز کو گھنٹوں چکر پھیریاں دے سکتی تھی ـــــ مگر وہ کیوں دیتی ـــــ وہ اپنی ہی آگ میں تپ کر حوا بن گئی تھی جو آدم کی پسلی بن جانا چاہتی ہے ـــــ اور نواز جو تھا تو آدم ہی ـــــ مگر کسی صورت اسے بیوی اور خود کو خاوند ماننے کے حق میں نہ تھا محض ایک بھولے مرد کی طرح ریشم کو چھوڑنے لگا ـــــ محض انتقاماً !!

چند دن تو نواز کے لئے یوں گزرے کہ دُنیا دُنیا نہ تھی ـــــ صرف جسم بن کر رہ گئی تھی ـــــ جسم جو کہ ہر خوبی سے آراستہ تھا۔ جسم جو بیک وقت چاندی بھی تھا ـــــ سونا بھی تھا ـــــ ریشم بھی تھا ـــــ گوشت بھی تھا ـــــ پھول بھی تھا۔ مچھلی بھی تھا ـــــ مگر آخر کار عورت کا تھا کہ جس سے دل بھر ہی جاتا ہے اور نواز کا دل ـــــ ؟ جو سدا نئے سے نئے کی تلاش میں رہتا تھا ـــــ ایک بار تو وہ

خود ہی اس والہانہ پن سے خائف ہو گیا کہ کہیں ریشم سے زندگی بھر نباہ کر ہی نہ بیٹھے ـــــ مگر وہ جو ذہنی اور جسمانی طور پر پورا مرد تھا۔ اور وہ بھی انتہائی کمین ! جو بدلہ لینے سے کبھی نہیں چوکتا، وہی انداز ہر محبت اور ہر جذبے پر غالب رہا، اور نواز کبھی یہ بھول نہ سکا کہ ریشم آخر کار باندی ہے ـــــ

خود ریشم کا یہ حال تھا کہ اس نے خود کو ہر ہر لحاظ سے ایک مکمل بیوی کے روپ میں ڈھال لیا ـــــ کالونی میں جتنی بھی بیبیاں تھیں وہ کسی سے کم نہ رہی ـــــ گھر کی سجاوٹ ہو یا پکوان، کسی کی خاطر داری ہو، یا خود اپنا سنگھار پہروا اوڑھاوا ـــــ وہ کسی سے ہیٹی نہ رہی ـــــ کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ یہ گاؤں کی ہے ـــــ نواز کے دوست آتے بھی تو وہ اس طرح رہتی کہ نہ تو نواز کی سبکی ہو کہ گنوارن ہے، نہ اس کی اپنی حیا میں کمی اور انداز میں بازاریت آئے ـــــ مگر نواز سانپ کی طرح پھن پھنا رہا تھا ـــــ سہاگ رات سے لے کر آج کے دن تک کئی ماہ گزر جانے پر بھی وہ اپنی ہتک کو نہ بھولا تھا کہ کس طرح اس ناگن نے اسے بے بس کر کے آخر کار عقد پر مجبور کیا تھا اور وہ ہار بھی گیا تھا ـــــ مگر وہ جیت کر بتائے گا ـــــ اس کی نام نہاد عزت اور عصمت کا پول کھول دے گا ـــــ حجام کے آئینے کی طرح، ہر مرد اس آئینے میں خود کا چہرہ دیکھے گا تب میری جیت ہو گی ـــــ

نواز کی رنگیلی اور ندیدی طبیعت تو اب بھر ہی چلی تھی ـــــ اسی لئے وہ بات بات پر اب مین میخ نکالنے لگا ـــــ کبھی کہتا سالن میں نمک زیادہ ہے۔ کبھی کہتا قمیض پر استری ٹھیک نہیں ہے ـــــ کبھی کہتا ڈرائنگ روم گندہ ہے، کبھی کہتا کہ تم خود مہترانی بنی رہتی ہو ـــــ حالانکہ وہ خود اور ریشم جانتے تھے کہ کس بات میں کتنی سچائی ہے۔

گھر میں آئے دن دوستوں کے جمگھٹ وارد ہونے لگے، اور رات گئے تک

رمی، فلیش اور الابلا چلتی ـــــ نواز جان جان کر ریشم کو ڈرائنگ روم میں بلاتا اور وہ نگاہوں سے زخمی ہوتی رہتی ـــــ ایک دن وہ اکیلے میں بولی:

"دیکھئے جی، آپ مجھے غیر مردوں کے سامنے یوں بلایا نہ کریں، مجھے بہت عجیب سالگتا ہے۔"

نواز طنز سے بولا: "یہ نہ بھولو، تم میری بیوی ہو اور بیوی کے لئے خدا کے بعد جو کچھ ہے شوہر ہے اور اس کا حکم ہے۔" بات سچ تھی، ریشم کچھ نہ کہہ سکی ـــــ

ایک دن رشید نے جو نواز کا بے حد قریبی اور بے تکلف دوست تھا۔ نواز کے سامنے ہی ریشم کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا:

"واہ بھابی، ایسے ملائم ہاتھ اور اب تک پان نہیں کھلائے ہیں ـــــ جب پیپل کے سے ان چکنے پتوں والے ہاتھوں سے بنا پان مونہہ میں گھلے گا تو کس قدر مزے نہ آئیں گے ـــــ!"

ریشم سر سے پاؤں تک تپ گئی۔ مگر نواز بے حیائی سے ہنستا رہا ـــــ اس کے بعد تو یہ ہونے لگا کہ دوستوں میں جس کے جو مونہہ میں آتا بک دیتا اور نواز مونہہ بھی نہ ہلاتا ـــــ ادھر چند دنوں سے نواز کا ایک نیا دوست آنے لگا تھا، جسے وہ اپنا "باس" بتاتا تھا۔ اس کے آگے پیچھے ہوتا۔ آنکھیں بچھاتا اور بس ہر بات میں ریشم کو حکم کہ ہمارے سامنے رہا کرو، ورنہ صاحب بور ہوجائیں گے

ریشم اس صاحب کی مصاحب گیری سے سخت عاجز آچکی تھی۔ مگر نواز کے ہاتھ میں شوہر کا وہ حق تھا کہ وہ کفر ہی نہ کر سکتی تھی کہ اُسے جھٹلائے ـــــ

ایک دن ڈرائنگ روم میں جب وہ چائے لے کر داخل ہوئی تو نواز جان بوجھ کر کمرے سے باہر نکل گیا ـــــ صاحب نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور گویا ہوئے:

"واقعی ریشم —— نواز بڑا خوش نصیب ہے کہ تم سی بیوی کا شوہر ہے"۔
ریشم نے ایک زوردار تنا کے سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور کمرے میں آ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی —— باس تو چلا گیا مگر اس کے گئے بعد سالن میں نمک کم ہونے کا بہانہ کرکے پہلے تو نواز نے چینی کے سارے برتن توڑ ڈالے اور ریشم کے اتنا کہنے پر کہ —— "میں نے تو روز کی طرح ہی پکایا ہے ——"
اُسے دھنا دھن کوٹ ڈالا —— اور اس دن جو ہاتھ اُٹھا تو پھر اُٹھ ہی گیا۔ جہاں کوئی بات مرضی کے خلاف ہوئی اور نواز نے اُسے دھنکا —— کالونی میں نواز کا گھر تماشہ بن گیا —— جہاں ان کے گھر سے ڈھول بجتے۔ رونے دھونے کی آواز آئی اور ساری کالونی اپنی اپنی گیلریوں میں سے لٹک لٹک کر گردنیں نکال نکال کر دیکھنے لگی کہ اب دیکھئے کیا ہوتا ہے ——
نواز گھر خرچ اپنے ہی ہاتھ میں رکھتا تھا —— مگر ایک دن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جب اُس نے اپنی نکٹائی ڈھونڈنے ریشم کا بکس کھولا تو اُس میں کئی نوٹ پڑے ہوئے تھے اور اس کے ساتھ اسے یہ بھی خیال آیا کہ ریشم اکثر کچھ نہ کچھ بُنائی کرتی دکھائی دیتی ہے —— تو یہ پیسے لاتی کہاں سے اور خریدتی کہاں سے ہے —— !! ہونہہ بڑی پارسا! اس نے تن تنا کر ریشم سے پوچھا:
"یہ اتنے سارے نوٹ کہاں سے بٹور لائی؟"
ریشم نرمی سے بولی: —— "اپنی محنت سے کمائے ہیں —— ایک سوئٹر بنتی ہوں تو پانچ روپے مل جاتے ہیں ——"
نواز تپ کر بولا: "سوئٹر بُنتی ہے یا جسم بیچتی ہے —— ؟"
ریشم سے یہ بے ہودگی برداشت نہ ہو سکی، اس نے ہاتھوں کی پکڑی ہوئی سلائیاں اون میں سے الگ کھینچیں اور تڑپ کر کے اتنی زور سے نواز کو دے ماریں

کہ اس کے ہاتھوں پر اَول اُمڈ آئے ۔ وہ چیخی ——

"یہ سوٹ کیس کیا تیرے باپ نے دلایا ہے؟ یہ ساڑھیاں جو مَیں پہن رہی ہوں تیرے دادا نے دِلائی تھیں —— ؟ اور جو کھا رہی ہوں کیا تیری ماں کے خصم کا دیا کھا رہی ہوں —— ؟ کمینے، ذلیل، یہ سب میری محنت ہے —— نام کا شوہر ہے، مَیں بھی مذہب ناطے عزت کرتی رہی، مگر یہ تو بتا کہ تُو نے آج تک میرے لئے کیا کیا ہے —— ؟ سوائے اس کے کہ مجھے سب کے سامنے ذلیل کرے۔ میری عزت کے پیچھے پڑا رہے —— مَیں تجھے سمجھتی کیا ہوں —— ؟"

نواز کے لئے یہ وار بالکل غیر متوقع تھا، اور بھی زیادہ متوحش وہ اس وقت ہو گیا، جب ساتھ لگے فلیٹ سے دو تین عورتوں نے سر نکال نکال کر جھانکنا شروع کر دیا، کیوں کہ ریشم اتنے زور سے چیخی تھی کہ سارا آس پاس گونج اٹھا، اور عورتوں کے لئے یہ بات بڑے اچنبھے کی تھی کہ سدا خاموش رہنے والی گیتا آج ڈکرائی تو کیسے —— ؟ ریشم کے تیور اتنے خطرناک ہو چلے تھے کہ اب نواز کے لئے خطرہ ہی خطرہ تھا —— اگر وہ اسے مارتا تو یقیناً وہ بھی جوابی کارروائی شروع کر دیتی اور کالونی والوں کے سامنے یہ بات مرجانے سے بدتر تھی کہ نواز بیوی کے ہاتھوں پٹ رہا ہے —— اس نے اپنی جھنجھلاہٹ یوں اُتاری کہ جو سامان سامنے آتا گیا، اُسے پھینکتا اور ٹھوکریں مارتا گیا۔ کیوں کہ یہ ساری چیزیں ریشم سے متعلق تھیں —— اس کے کپڑے، اس کے جوتے، اس کے تکیے —— اس کا سنگھار کا سامان —— اور آخر میں اس نے چیخ چیخ کر تین بار اعلان کر دیا ——

"مَیں تجھے طلاق دیتا ہوں —— طلاق —— طلاق ——"

اور اسی پر بس نہ کرتے ہوئے وہ ریشم کو دروازے تک کھینچتا ہوا لایا اور

باہر لوٹ دیا۔

شام کو کالونی کے ہر گھر میں یہی ذکر تھا کہ نواز نے اپنی عورت کو نکال باہر کیا ـــــ اس کے قریبی دوست اور ان کی عورتیں تعزیت کے انداز میں اس کے گھر میں جمع ہونے لگیں ـــــ نواز جھلایا ہوا ہر ایک کی باتیں سُن رہا تھا

"بھیا تم نے طلاق دے کر اچھا نہیں کیا ـــــ غریب عورت اب کہاں جائے گی ـــــ؟"

"ہے ہے نکالا بھی تو اتنے جوڑے سے ـــــ اب بے آسرا بے چاری کیا کرے گی ـــــ؟"

"دیکھ لینا پھر کے یہیں آئے گی ـــــ گھر چھوڑ کر کہاں جائے گی۔؟"

"مگر نواز میاں نے تو طلاق دے دی ہے۔ اب تو "سنگت" حرام ہوئی ـــــ"

"اونہہ چلو جی ـــــ غصے میں میاں طلاق دے تو اللہ کے پاس قابلِ معافی ہے ـــــ"

"ارے لو۔ اور سُنو ـــــ طلاق نہ ہوئی موئی زر خرید باندی ہو گئی کہ جب جی چاہا رکھا، جب جی چاہا نکال دیا ـــــ"

اب نواز جل کر بولا: "اور کیا باندی تو وہ تھی ہی ـــــ پانچ سو کی خرید کی ہوئی۔ گئی نہ اپنی اصلیت پر ـــــ اب چونکہ وہ اس سے قطعی بے دخل ہو چکا تھا۔ اور چونکہ اس کے پیٹ میں اس کی اپنی کوئی اولاد بھی نہ تھی۔ اس لئے بہتر یہی تھا کہ اس کی اصلیت کا بھانڈا پھوڑ کر اپنے جی کی تلملاہٹ کم کر لی جائے۔

"کیا کہتے ہو یار ـــــ" اور غیر یقینی انداز میں بولا ـــــ

"اور کیا جھوٹ ـــــ" وہ بُری طرح جلا بُھنا تھا۔

ایک بڑی بی بولیں ـــــ" تب تو دیکھ لینا وہ ضرور آئے گی ـــــ ڈھور ڈنگر دن بھر چاہے جہاں بھی جدھر بھی گھوم لیں۔ رین بسیرے کو تو اپنے ٹھکان پر آتے ہیں ـــــ"

نواز تلملا کر بولا ـــــ" حرام زادی اب آئے تو سہی، یہ پیر ہیں، یہ کیل والے جوتے ہیں اور اس کا سر ہے ـــــ بھیجا نہ نکال دوں تو نام نہیں میرا۔"

" مگر بے چاری کا قصور ـــــ؟"

نواز سٹپٹایا ـــــ پھر سنبھلا ـــــ" قصور ـــــ؟ یہ قصور کم ہے کہ پانچ کوڑی کی باندی میرے موہنہ کو آتی تھی ـــــ"

بیگم انور مصلح کرانے کے انداز میں کم ـــــ جلانے کو زیادہ ـــــ گویا ہوئیں ـــــ" اونہہ اب جیسی بھی تھی، زرِ خرید تھی۔ تمہاری تھی، اب کیا آئے گی اور اگر آئی تو پاؤں چھونے دینا اسی میں تمہاری بڑائی ہے ـــــ"

نواز اژدھے کی طرح پھنکارا ـــــ" اس کے ناپاک ذلیل سر کو اپنے پیروں پر پڑنے دوں ـــــ؟ کمال کرتی ہو بھابی تم بھی ـــــ"

اشتیاق احمد جو عورتوں کی نفسیات میں شُدبُد رکھتے تھے ـــــ سگریٹ پھونکتے ہوئے سوچ بچار کے بعد بولے ـــــ" اب تو وہ آنے سے رہی ـــــ عورت، چاہے وہ کیسی ہی ہو باندی کہ رانی۔ اپنی تذلیل نہیں سہہ سکتی ـــــ"

مگر دوسرے دن ایک سرے سے سبھی یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ کالونی کے سرے پر ایک سفید نقطہ سا نمودار ہوا، جو بڑھتے بڑھتے ریشم بن گیا ـــــ اتوار کا دن تھا ـــــ سبھی بے پروائی سے اپنی گیلریوں میں بیٹھے، کھڑے، اِدھر اُدھر کی تاک جھانک کے مزے لوٹ رہے تھے ـــــ اتفاقاً کسی نے دُور تک نگاہ

دوڑائی تو پتہ چلا کہ ریشم آرہی ہے —— ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں پوری کالونی میں یہ خبر گشت کر گئی کہ ریشم آ گئی —— ریشم آ گئی —— عورتیں ٹک ٹک کر ریشم کو اس انداز میں دیکھنے لگیں۔ جیسے آج سے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔ نواز جو آرام کرسی پر پڑا سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جا رہا تھا —— چونکتا ہوا پر ایک دم اس کے لبوں پر زہر خند مسکراہٹ آ گئی —— جس میں گہرا طنز پوشیدہ تھا۔ ایک ایک کر کے ٹھٹ کے ٹھٹ نواز کے فلیٹ میں جمع ہونے لگے۔ سبھی ایک بات دہرا رہے تھے ——

"دیکھو نواز، خدا کے لئے اس کے جسمِ ناتواں پر رحم کرو۔ دیکھو کس طرح مری مری چلی آرہی ہے —— اسے معاف کر دینا —— آخر عورت ذات ہے غلطی ہو ہی جاتی ہے ——"

نواز نے اپنے پیر سکیڑے، پھیلائے۔ پھر پھیلائے پھر سکیڑے جیسے —— "ہونہہ میں اسے سمجھتا ہی کیا ہوں ——"

جب ریشم دروازے کے قریب پہنچ گئی تو آوازیں، سرگوشیوں میں اور سرگوشیاں بھن بھناہٹ میں بدل گئیں ——

"خدا کے لئے نواز ——"

"دیکھو میاں . . . . ."

"معاف کرنے میں بڑائی ہے ——"

"آخر کار آ ہی گئی نا ہر پھر کے ——؟" نواز نے فخر سے سوچا۔

چر چر کی ہلکی سی آواز نکلی اور دروازہ کھل گیا —— سفید ساڑی میں ملبوس ریشم، بال بکھرے، آنکھیں سوجی —— گال سرخ —— یوں لٹی لٹی داخل ہوئی —— جیسے اب دو قدم چلنے کا بھی دم نہ ہو —— سب دم سادھے دیکھ رہے تھے۔

نواز نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے اپنے پیر اندر سکیڑ لئے کہ کہیں ناپاک سر، ان پاکیزہ قدموں سے نہ چھو جائے۔

ایک دم ریشم نے بازو میں دبا ہوا ایک سینڈل نکالا اور نواز کی طرف پھینک کر بڑی نفرت سے بولی :

"لے یہ کل تیرا دیا جوڑا پہنے پہنے چلی گئی تھی ——— اتنا احسان بھی کیوں رکھوں، ورنہ ایک ایک سے کہتا پھرے گا کہ میرے پیسوں کا جوڑا پہن کر بھاگی تھی۔ تیرا احسان رکھے میری جوتی ———"

اس نے اپنا ننھا منا خوب صورت سا پاؤں اٹھا کر سینڈل نواز کو دکھائی اور دروازہ کھول کر یہ جا وہ جا ———

نواز کرسی میں بیٹھے بیٹھے پاتال میں دھنس گیا ———

# آسمان

"پانچ اشرفیاں۔ انگشتری، ہور یہ پھولاں، بڑی آپا کی طرف کے"۔
بڑی پاشا نے حاضرین کی طرف دیکھ کر اعلان کیا ——
"ہور یہ تھالی ممانی جان بھجائے —— اس میں بھی پھولاں ہیں، اشرفیاں تو بہوت دِکھ رئے، ہور ساتھ میں کلائی پو بندھنے کی گھڑی بھی ——"۔
پھر انہوں نے سامنے کھڑی خادمہ کی طرف نِگاہ کی —— "اب تو کس کی تھالی لائی ——؟"
خادمہ مارے رُعب کے بات کرنے کی سُدھ ہی کھو بیٹھی۔ اس نے اس طرف اشارہ کر دیا، جدھر بڑے پھوپا اور پھوپی بیٹھے ہوئے تھے۔
ایک ایک خادمہ اور کنیز، خواص آتی گئی، اور ایک ایک تھالی پیش کرتی گئی —— بڑی پاشا مُسکرا مُسکرا کر، نہال ہو ہو کر چھوٹے پاشا کو نہارتی رہیں ان کی گود میں سنہری اشرفیوں، کل دار روپیوں اور حالی سکوں کا ڈھیر اونچا ہوتا

گیا۔ مگر نذریں تھیں کہ ختم ہونے میں ہی نہ آتی تھیں۔

بڑی پاشا کے پیچھے موم جیسے دو ہاتھوں نے چاندی کی ایک تھالی بڑھائی

بڑی پاشا نے پیچھے مڑتے ہوئے پوچھا: "یہ تو کس کی . . . . . ." لیکن بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ شیرنی کی طرح دھاڑیں ——

"یہ کون ایسا مبارک موقع پہ اپنے منحوس ماری رانڈ کے ہاتھ سے تھالی بھجائے جی —— کچھ عقل بھی ہے کہ نہیں —— اجاڑ یہ تو سوچنا کہ کتنا مبارک کام ہونے جارہا —— ایسی منحوس کی چھاؤں پڑی تو . . . . . ."

تھالی ایک جھناکے کے ساتھ چھوٹ گری —— چھوٹے پاشا نے بری طرح چونک کر سر اٹھایا۔ ان کی نظریں جدھر اٹھیں وہیں جم کر رہ گئیں ——

ایک ایسا حسنِ مجسم ان کی آنکھوں کے سامنے تھا کہ مثالوں، تشبیہوں کی دنیا خجل ہو کر رہ گئی تھی۔ جب وہ بہت چھوٹے سے تھے تو دادی اماں انہیں پریوں کی کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ آج انہیں یقین ہو گیا کہ پریوں کا کہیں نہ کہیں وجود ضرور ہے۔ سفید لباس، گھیر دار دامن کا سفید کرتا۔ سفید ہی پاجامہ، سفید ہی دوپٹہ —— وہ ہاتھ جن سے ابھی ابھی تھالی چھوٹ کر گری تھی، یونہی پھیلے رہ گئے تھے —— اتنے ملائم اتنے سفید کہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کرتے کی آستینیں کہاں ختم ہوئی ہیں، اور ہاتھ کہاں سے شروع ہوتے ہیں۔ کافوری لانبی لانبی بے حد نازک انگلیاں، جن کے سروں پر یاقوت دہک رہے تھے۔ اور ترشی ہوئی پنڈلیوں پر کسا ہوا پاجامہ —— اور زمین پر رکھے ہوئے دو ننھے ننھے سفید پاؤں جو ایمان کو متزلزل کر دینے کی حد تک حسین تھے اور جو خوف اور شرمندگی کے جذبات سے کپکپائے جا رہے تھے —— اور جو کبھی انسان کی آنکھوں میں تاب ہوتی اور وہ اس چہرے کو دیکھ پائیں جو اس سراپا کا مول تھا تو شاید بینائی کھو دیتیں —— صبیح، پاکیزہ اور معصومیت

کی اگر کوئی حد مقرر کی جاسکتی ہو تو اس حد سے بھی سوا معصوم ترین چہرہ. جبیں پر دو آنکھیں جگمگا رہی تھیں ــــ وہ آنکھیں، آنکھیں نہیں تھیں، آسمان کے تارے تھے جو آسمان کو اپنی انتہا نہ پاکر اس بلندی پر اتر آئے تھے ــــ آنکھیں تو آنکھیں ہی ہوتی ہیں جن سے دیکھنے اور رونے کا کام لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ آنکھیں جو زبان نہ ہو کر بھی زبان کی طرح بول رہی تھیں اور ایک ایسی اَن دیکھی طلب کی طرف لے جاتی تھیں کہ دیکھنے والا پانی، پانی کر کے پیاسا ہی جان دے دے! اور وہی آنکھیں اس وقت اتفاقاً چھوٹے پاشا کی آنکھوں سے گھبراہٹ اور خجالت میں جا ٹکرائیں ــــ

بید مجنوں کی طرح کانپتی ہوئی اس جانِ ناتواں کے لئے خود کو سنبھالنا دشوار ہو گیا ــــ خوب صورت گلابی گلابی گالوں پر موٹے موٹے آنسوؤں گرنے لگے، جیسے گلابی مخمل پر ہیرے ٹانک دیئے گئے ہوں۔ احساسِ ندامت اور شدتِ گریہ سے وہ آگے کو جھک سی گئی اور بے ترتیبی سے پیٹھ پر پڑے ہوئے جھکا جھول بال سامنے پیچھے جھولنے لگے۔ یہ ایسا وقت تھا کہ خدا بھی اپنی اس تخلیق کو دیکھ لیتا تو ششدر رہ جاتا ــــ یہ تو چھوٹے سرکار تھے۔!

سناٹے کو بڑے سرکار کی آواز نے توڑا جو اپنی بیگم سے مخاطب تھے:

"کیوں بے چاری کا دل خراب کرتے بیگم آپ؟ نصیب اپنے ہاتھاں سے بنانے کی چیز ہوتے تو کوئی بھی خراب نہ بناتا. خدا کی خدرت میں کائے کو دخل دیتے آپ؟"

"ہوہو، میں تو ایسی اِچ ظالم ہوں نا۔ آپ بڑے رحم والے ــــ پن اُنے کیا بچی ہے۔ اس کو سمجھائیں کیا کہ میں ایسی بیوہ رانڈ مونڈ ہوں تو ایسے خوشی کے موخعے پر کائے کو سامنے ناچوں ــــ" اور بڑے غصّے سے انہوں نے اُسے گھورا

اس کی بے بس نگاہیں بیگم صاحبہ کی چھوٹی نند پر جا رکیں۔

چھوٹی نند دھیمی آواز میں بولیں : ــــ "جی ہو بھابھی پاشا یہ غلطی تو میرے سے ہوئی ــــ اُجاڑ میرے کو دھیان اچ نئیں رہا کہ اُنے . . . . . ." اور انہوں نے اس کے معصوم چہرے کو دیکھ کر اپنی زبان روک لی۔

"چل جا کو مَر اپنی کوٹھری میں، ہوو‌ر یاد رکھ کبھی اِدھر پاؤں دی تو . . . . ."

جب وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اُس شان دار شیش محل سے اور ایسی بھڑک دار محفل سے چلی گئی تو محفل میں چمکنے والا ہر شیشہ ہر فانوس ہر چراغ اپنی روشنی کھو بیٹھا!

ابھی ابھی محفل کیسے شباب پر تھی ــــ اتنے بڑے شیش محل کے اتنے بڑے ہال میں یہاں سے وہاں تک ریشمیں روئی بھرے موٹے موٹے ریشمی گدیلے بچھے ہوئے تھے۔ بیچ میں کام دار زری کی مخملیں مسند بھی بچھی ہوئی تھی جس کے درمیان سلمہ ستارے ٹنکا ہوا مخمل کا گاؤ تکیہ سجا ہوا تھا ــــ تکیے کے سہارے ولایت سے ڈاکٹری کی ڈگری لے کر لوٹے ہوئے چھوٹے سرکار براجمان تھے ــــ آج ہی وہ ولایت سے واپس ہوتے تھے، اور بڑی پاشا اور بڑے سرکار نے اپنی شان دار جاگیر اور حیثیت کے مطابق ایک "کھانا" اس خوشی میں سارے رشتہ داروں اور ملنے جلنے والوں کو دیا تھا اور ماں باپ کی طرف سے اس عظیم خوشی کے عظیم موقع پر رسمِ گُل پوشی بھی تھی۔ جب ریاست کے اتنے بڑے جاگیر دار اور نواب گھرانے کا بیٹا ڈاکٹری کی ڈگری لے کر لوٹے اور وہ بھی ولایت سے، تو یہ واضح طور پر ہر رشتہ دار اور ملنے جلنے والے کا فرض تھا کہ وہ بھی اپنی اپنی حیثیت کے مطابق پھول پہنائے اور نذرانے دے ــــ سارا ہال بھرا ہوا تھا ــــ یہ ساری کارروائی اس خاص حصے میں ہو رہی تھی جو محل کے نام کی مناسبت سے واقعی شیشوں جڑا تھا۔

سروں پر رنگ برنگے فانوس لٹک رہے تھے، ہر فانوس میں گیارہ گیارہ پھول تھے۔ ہر پھول میں ایک ایک چراغ۔ اس طرح چھت پر یہاں سے لے کر وہاں تک بارہ فانوس تھے۔ ان میں سے ہر ایک میں گیارہ گیارہ چراغ۔ اور ہر چراغ کا عکس قدِ آدم آئینوں میں لہرا رہا تھا۔ محفل میں ایک آگ سی لگی ہوئی تھی۔ محل کے دروازوں پر موتیوں اور لڑیوں والے پردے لٹک رہے تھے۔ مہمان بیبیاں تھیں کہ الگ جو بڑلیوں کی دوڑ کانوں کی دوڑ کانیں اپنے جسموں پر اٹھائے ہوئے تھیں —— جامے دار، بنارسی کتان، زری، تاش، بادلے والے کھڑے دوپٹے، آڑے دوپٹے —— کم خواب مشجر، مشروع کے زری کڑھے پاجامے اور کامدانی سے جگر مگر کرتے، کارچوب کے کڑھے کُرتے۔ بس آنکھوں کی بینائی آج خطرے میں پڑی ہوئی تھی۔ ایک طرف کونے میں دُلہنوں کی طرح سجی بنی میراثنیں ڈھولک پیٹی لئے بیٹھی تھیں۔ ڈاکٹر سرکار کے ماں باپ اور بہت قریبی رشتہ دار مسند کے قریب انہیں گھیرے بیٹھے تھے۔ میراثنوں کے مبارک سلامت والے گیتوں سے پہلے آنے والوں نے پھول پہنانے کی خواہش ظاہر کی۔ اور دبدبے اور ٹھسے والی بیبیاں دستوُر کے مطابق بجائے خود اُٹھ کر آنے کے اپنی اپنی کنیزوں، اور نوکرانیوں بنی سنوری خواصوں اور پیش بندھیوں کے ہاتھوں نذرانے کی اشرفیاں، روپے اور پھول بھجوا بھجوا کر سُرخرو ہونے لگیں کہ اتنے میں چھوٹی نند نے خود بڑی پاشا کی ہی پروردہ کے ہاتھ سے نذرانے کی تھالی بھجوانے کی حماقت کر دی، اور بھری محفل میں اُلّو بول گیا۔

وہیں میراثنوں نے مصرعے دِل سے ٹھونک ٹھونک کر محفل کو رنگ پر لانا شروع کیا :

دکھایا ہے خُدا نے آج وہ دِن
گِنے جاتے تھے جس دِن کے لئے دِن

میرے مولا بہاراں کیا دِکھایا
مرا پیارا وَلایت پڑھ کو آیا

پہلے بچّوں کی توجّہ میراثنوں کی طرف اور ڈھولک کی طرف گئی۔ پھر مائیں بھی ان میں شامل ہو گئیں اور پھر تو وہ ہُلڑ مچی، تانوں اور تالیوں اور چھٹی چھٹی آوازوں سے دل سے جوڑے ہوئے گیتوں کا وہ زور بندھا کہ مرد لوگ بھی پان چباتے ہوئے اُدھر ہی متوجہ ہو گئے، لیکن چھوٹے سرکار یوں ہی اپنے آپ سے بے خبر کھوئے رہے، ان کی آنکھوں کے سامنے ایک ہی منظر تنا رہا —— وہ کافوری اُنگلیوں والے ہاتھوں نے ایک تھالی بڑھائی ہے۔ گالیوں کی بوچھاڑ میں تھالی کے رُوپے، پھُول بکھر گئے ہیں۔ ہیروں کی طرح دمکتی آنکھوں سے موتیوں کے آنسو رُل کر موسم کے پہلے پہل کھلنے والے گلابوں جیسے گالوں پر مرک رہے ہیں، گر رہے ہیں —— پھر وہ ذلت، ندامت اور خوف کے بارسے جھکی جھکی آنکھیں اُٹھتی ہیں، ان کی نگاہوں سے ایک لمحے کو ملتی ہیں ؟ اور اس ایک لمحے میں پتہ چلتا ہے کہ آج تک جتنی بھی زندگی گذری ہے بے کار ہی گذری۔ شیش محل اپنی جملہ روشنیوں کے باوجود انہیں اس قدر تاریک تو کبھی نہ لگا تھا۔

کھانے کی دھوم مچی تو مردانے زنانے میں ہنگامہ سا اُٹھ کھڑا ہوا۔ بڑے سرکار محبّت سے بولے" بٹیا آپ مردانے میں کھائیں گے یا زنانے میں ؟"

بڑی سرکار بولیں " آج دونوں محفلوں کا حج ہے —— تھوڑا ادھر کھا کو اُدھر جائیں گا میرا بچہ ——"

"چھوٹے سرکار دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بولے:" امّی جان، مجھے بہت تھکن ہو رہی ہے۔ آج آپ معاف کردیں تو احسان ہوگا۔"

اور وہ بے خبری میں یوں ہی اُٹھ کھڑے ہوتے۔ کل دار حالی روپیوں اور

اشرفیوں کا ڈھیر جو اِن کی گود میں جمع ہو گیا تھا، ایک چھنا کے ساتھ اُن کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔

ماں نے خوش ہو کر دُعا دی: "اللہ کرے تم سدا ایسے ہی اشرفیوں پو چلو۔

چھوٹے سرکار نے عجیب سی نظروں سے ماں کو دیکھا" امّی جان وہ تو خدا ہے جسے نوازے، مگر میں نے ڈاکٹری کی ڈگری ہاتھ میں لیتے وقت ایک عہد کیا تھا کہ غریبوں کا علاج مفت کیا کروں گا۔ اور آپ کو پتہ ہو گا کہ اکثر غریب لوگ ہی زیادہ بیمار پڑتے ہیں۔"

بڑے سرکار نے بے حد خوش ہو کر بیٹے کی طرف دیکھا۔

"بٹیا جس ارمان سے ہم تم کو ولایت بھیجے تھے، آج اس کا صلہ تم دے دیا۔ تمہارے خیالاں سن کے ہمارا جی کیسا خوش ہو گیا —— پوچھو نکو ——"

"کیا ہونڈی کھوپڑی ہے جی آپ کی" بڑی پاشا غصہ سے بھڑک کر بولیں "اُنے ایک فضول بات بولا۔ ہور آپ بھی اس کو اِچ پکڑ کو بیٹھ گئے —— یہ بعد کے باتاں ہیں۔ چلو کھانے کو۔" وہ بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر بولیں۔

"مجھے تو معاف ہی رکھئے امی جان۔"

"بٹیا کم سے کم دودھ تو پی لیو۔" بڑے سرکار پیار سے بولے۔

"جی، وہ میں سوتے وقت پی لوں گا۔"

جاتے جاتے اتنے بھیڑ بھڑکے میں وہ چھوٹی پھوپھی کو تلاش کرتے کرتے اُن تک پہنچ ہی گئے۔ بڑی لجاجت سے بولے "پھوپھی ماں، ایک گلاس دودھ بھجوا دیں گے آپ میرے لئے؟ مگر اسی لڑکی کے ہاتھ۔"

پھوپھی نے دہل کر انہیں دیکھا —— بھائی بھاوج دُور تھے۔ انہوں نے ذرا خائف ہو کر جلدی سے وعدہ کر لیا۔

"بھیج دیوں گی میاں —— مگر میرے چونڈے پر رحم کرنا ذرا —— بھابی پاشا کا غصہ تم کو بھی معلوم ارج ہے۔"

گیارہ سے بارہ —— بارہ سے ایک —— ایک سے دو —— کتنی صدیاں چھوٹے سرکار پر سے ہو کر گزر گئی تھیں۔

"کیا وہ آبِ حیات آج میرے لئے کبھی نہیں آئے گا؟" ان کا جسم کان بن کر رہ گیا تھا۔ ہر چاپ پر، ہر دھمک پر، وہ پوری جان سے اچھل پڑتے۔ ان کا کمرہ اوپری منزل پر تھا، شور شرابے سے دور، آدھی رات کی جانفزا ہوائیں چلنا شروع ہو گئی تھیں جو دن بھر کے طمانیت زدہ لوگوں کو تھپک تھپک کر خنک لوریاں دینے لگتی ہیں۔ اور پھر نہ آتی ہوئی نیند بھی لپک لپک آتی ہے —— لیکن نیند ان کی آنکھوں سے کہاں چھپی بیٹھی تھی —— ؟ ان کا شاندار اور ایک نواب ہی کی شان و شوکت والا کمرہ اور بستر انہیں ببول کے کانٹوں بھرا محسوس ہو رہا تھا۔ جانے کتنے گلاس پانی اب تک وہ حلق سے نیچے اتار چکے تھے، لیکن ایک ایسی آگ تھی جو بجھنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔

پھر دھیرے سے دروازہ کھلا اور وہ بستر پر بیٹھے بیٹھے مر سے گئے۔ چاندی کا طشت، اس میں دودھ سے بھرا گلاس —— وہی دو سفید سفید موم جیسے ہاتھ —— وہی سفید لباس، وہی پاکیزہ چہرہ۔ وہی جھکی جھکی آنکھیں —— لیکن روئی روئی سی۔

دودھ چھپر کھٹ سے ملی ہوئی آبنوسی میز پر رکھ کر وہ دھیرے سے باہر جانے لگی۔ جاتے جاتے مڑی اور بے حد شائستہ لہجے میں چھوٹے سرکار کو مخاطب کر کے بولی۔

"شب بخیر —— خدا کرے آپ تو میٹھی نیند سوئیں لیکن آپ کا بخت بیدار رہے۔"

"آپ کا بخت بیدار رہے۔"

"آپ کا بخت بیدار رہے۔"

چھوٹے سرکار نے پڑھا بھی تھا، سُنا بھی تھا کہ بعض لوگ بات کرتے ہیں تو مونہہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ آج آنکھوں سے دیکھ بھی لیا۔ سحرزدہ سے وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بڑے سہمے ہوئے لہجے میں اسے پکارا جو تقریباً دروازے تک پہنچ چکی تھی۔

"ذرا سُنئے۔"

وہ ٹھٹھک کر وہیں کھڑی ہو گئی۔ آئی نہیں۔ وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے لجاجت سے بولے ——

"پلیز تھوڑی دیر کے لئے یہاں آکر بیٹھ جایئے نا۔"

اس نے ایک لمحہ کو صوفے کی طرف دیکھا، پھر خود کو اور عجیب معصومانہ انداز سے بولی: "میں؟ وہاں بیٹھوں —— آپ کے قریب؟ آپ کو پتہ نہیں، زمین آسمان کبھی نہیں مِل سکتے۔"

چھوٹے سرکار کا دماغ چکرا گیا —— "یہ لڑکی اتنی نکھری ستھری شائستہ اُردو میں کیسے بات کر لیتی ہے —— میں تو اس سے ایک بات بھی نہیں کر پاؤں گا لندن میں بھانت بھانت کے دوستوں کے ساتھ رہتے اُٹھتے بیٹھتے وہ اپنی ٹھیٹ حیدر آبادی بولی تو خیر بھول گئے تھے لیکن ان کے لب و لہجہ سے اور چغلی کھانے والے چند لفظوں سے کسی اجنبی کو یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ ہوتی تھی کہ ان کا تعلق حیدرآباد دکن سے ہے، وہ اس وقت اس لڑکی سے بات کرتے ہوئے پتہ نہیں کیوں شرم سی محسوس کر رہے تھے۔

انہوں نے کچھ ہمت باندھ کر کہا "آپ کو اپنے آسمان ہونے پر بڑا گھمنڈ ہے آخر کیوں نہ ہو، اتنی حسین جو ہیں آپ۔"

ایک دم وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی: "میری زبان جل جائے جو میں نے

آپ کو زمین کہو ہو۔ زمین تو مَیں ہوں ـــــ حقیر بے مایہ جو سدا پیروں سے کچلی اور روندی جاتی ہے ـــــ آسمان تو آپ ہیں، سَربلند، سَرفراز۔۔۔۔۔"

انہوں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "خُدا کے لئے چپ بھی رہئے ـــــ کیا آپ ایک ہی ترازو میں سب کو تولنے کی عادی ہیں ـــــ مجھے امی جان کی حرکت پر بہت دُکھ ہے۔"

اس نے یقین نہ آنے کے انداز میں اپنی مقناطیسی کشش والی جگ مگ جگمگ کرتی آنکھیں پھاڑ کر چھوٹے سرکار کو دیکھا ـــــ بولی کچھ نہیں۔

"مَیں آپ کی زندگی کے بارے میں جاننا چاہوں گا ـــــ برسوں پہلے جب مَیں لندن گیا تھا تب تو آپ اس شیش محل میں نہیں تھیں نا؟"

اس نے سر کے اشارے سے "نہ" کہا۔

بہرحال چھوٹے سرکار مرد تھے۔ فطری شرارت ایک لمحے کو جاگ ہی گئی ذرا مُسکرا کر بولے۔" وہی تو مَیں بھی کہہ رہا تھا۔ پہلے تو شیش محل میں اتنا اُجالا کبھی نہیں دیکھا تھا۔"

ایک اُجالا اس کے اپنے چہرے پر بھی چھا گیا۔ اس نے وہ اُجالا ـــــ وہ مُسکراہٹ چھُپانا چاہی، لیکن سر جھکانے کے باوجود نور کا ہالہ سا اس کے چاند ایسے چہرے کے گرد بنا رہ گیا۔

"آپ حیدرآباد کی ہیں بھی نہیں نا؟" وہ رُکتے رُکتے پوچھ رہے تھے۔

اس نے پھر سر کے اشارے سے "نہ" کہا۔

"پھر آپ کا وطن کون سا ہے؟"

اس نے بڑے دُکھ بھرے لہجے میں دھیرے سے کہا۔ "مجھے بھی آپ ایسی بدنصیب دہلی کی طرح سمجھ لیجئے جو کئی بار اُجڑی اور کئی بار بسی ـــ اور پھر بس کے اُجڑ گئی۔"

چھوٹے سرکار کا دِل دُکھ گیا —— اس کی آنکھیں پھر بھر آئی تھیں —— وہ یوں ہی بے دھیانی میں اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

"تو آپ دہلی کے ہیں —— لیکن حیدر آباد دکن کیسے آنا ہُوا؟"

"انسان وقت کی آندھی کے سامنے ایک بے بس تنکا ہے قبلۂ عالم۔" اس نے آنسو روکنے کی قطعی کوشش نہ کی۔

بڑی دیر تک چھوٹے سرکار یوں ہی سُن بیٹھے رہے۔ بڑی دیر بعد بولے:

"امی جان آپ کو منحوس کہہ رہے تھے۔ میں یہ ... ..."

وہ اُن کی بات کاٹ کر بولی۔ "غلط تو نہیں کہہ رہی تھیں —— دراصل جس دن میں پیدا ہوئی تھی اسی دن میری امی کا انتقال ہو گیا تھا۔"

"اور آپ کے شوہر ... ..."

وہ کچھ جھجک کر تذبذب کے ساتھ بولی۔ "جی میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔"

"جی —— ؟" حیرت کے مارے چھوٹے سرکار صوفے سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"جی ہاں —— جس رات ہماری شادی ہوئی ہے اُسی رات برات سسرال لوٹتے ہوئے ایک حادثے کا شکار ہو گئی۔" وہ حلق میں آئے ہوئے آنسوؤں کے پھندے کو پیتے ہوئے بولی: ان کی لاش اس قدر بڑھ چکی تھی کہ لوگ کہتے تھے پہچانی نہیں جاتی تھی —— میں نے تو انہیں اس ہاتھ سے پہچانا تھا جو منزل تک پہنچنے کے لئے میرے بابا نے میرے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ جب وہ ہاتھ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا تو ہر پہچان میرے لئے آنسو بن کر رہ گئی۔

ایک دردناک سناٹا کمرے میں چھا کر رہ گیا —— اس سناٹے کو توڑتی ہوئی مرغوں کی آوازیں ابھی تک ہوا کے دوش پر آ جاتی تھیں، ورنہ دروازے بند ہونے کی وجہ سے اوپری محل ساری دُنیا سے اس وقت الگ ہو گیا تھا۔

"اس خرابے میں آپ کیسے پہنچ گئے، لیکن؟"

وہ کچھ نہیں بولی —— بس آنسو رہ رہ کر چمکتے رہے۔

"میں نے آپ کا نام بھی نہیں پوچھا ابھی تک ——"

"ایک ستارہ، جو سدا گردش میں رہتا ہے۔" وہ ایک دکھی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"آپ کی بات چیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ بہت پڑھے لکھے ہیں۔"

"اللہ کے بعد —— بابا کی مہربانی سے کچھ پڑھ لکھ لیتی ہوں۔"

"بابا کہاں ہیں آپ کے؟"

"یہیں —— اسی محل میں —— باہر نوکر خانے میں رہتے ہیں، میں اندر رہتی ہوں۔" پھر وہ دروازے کے شیشوں کے پار باہر شیشوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "اب آپ مجھے اجازت نہ دیجئے گا؟ رات بیتی جا رہی ہے —— لوگ رات کو سیاہ اور تاریک کہتے ہیں۔ اور مقدّر کی خرابی کو رات کی سیاہی سے تشبیہ دیتے ہیں لیکن میرے لئے رات ایک مہربان ماں کی طرح ہے جو میرے سارے دکھوں کو اپنے آنچل میں سمیٹ کر مجھے پناہ میں لے لیتی ہے —— لوگ سویروں کے لئے ترستے ہیں میں بھی سویروں کو برا نہیں سمجھتی، اس لئے کہ یہ گزرتے ہیں، تب ہی تو رات آتی ہے —— خدا حافظ!"

وہ چلنے کو ہوئی تو چھوٹے سرکار کچھ جھجکتے ہوئے آگے بڑھے۔

"میں ایک بہت بڑی جسارت کر رہا ہوں، آپ برا تو نہیں مانیں گے؟ لیکن آپ کی اجازت کے بغیر میں یہ جسارت کروں گا بھی نہیں۔" وہ رکتے رکتے بولے۔ "گناہ تو ہے لیکن میں... میں آپ کے اس بے پناہ پاکیزہ اور خوب صورت چہرے کو پیار کرنا چاہتا ہوں..."

وہ جیسے نیند سے جگانے والے لہجے میں بولی۔" لوگ گناہ تو کرتے ہیں، لیکن خدا کی عظمت یہ ہے کہ توبہ کے دروازے بھی ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ لیکن ایک چھوٹی سی بات آپ کو یاد دلا دوں —— نیچے اس ہنگامہ خیز محفل میں آپ کی منگیتر بھی بیٹھی ہوئی ہیں جنہیں آج نہیں تو کل، اسی محفل میں آنا ہے جن کے قرب کی تمنا آپ کے لئے گناہ نہیں ہوگی۔"

ایک دَم وہ دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

"میں غموں کی عادی ہو چکی ہوں —— خُدا کے لئے مجھے خوشیاں نہ دیجئے —— یہ سب میں سنبھال نہیں پاؤں گی۔"

چھوٹے سرکار سُن کھڑے تھے، نہ ہلنے کی سکت تھی، نہ بات کرنے کی سُدھ۔ رات کے گجرنے ٹن ٹن چار بجائے تو وہ چونکی۔ جانے کے لئے مُڑی، تو چھوٹے سرکار نے اسے شانوں سے پکڑ کر اپنی طرف گھما لیا —— اپنے عام نرم لہجے سے ہٹ کر پہلی بار ذرا وہ تلخی اور تیزی سے بولے: "سُنئے —— میری کوئی منگیتر ونگیتر نہیں ہے۔ امّی جان نے اگر اپنی خوشی کے واسطے میری منگنی کر بھی دی تو انجام وہی بھگتیں گے۔" وہ اس کے چہرے پر جھکتے جھکتے پھر سنبھل گئے۔ اور یہ وعدہ رہا کہ یہ ہونٹ آپ کے اس پاکیزہ چہرے کی کبھی بے حرمتی نہیں کریں گے چاہے کتنا ہی مچلیں، کتنا ہی تڑپیں —— تاوقتیکہ آپ اس محفل میں دُلہن بیگم کی حیثیت نہیں پالیتے۔"

اُس نے اپنی آنسو بھری آنکھیں اُٹھا کر بڑی مشکل سے کہا۔

"میرا نام شمع ہے —— کیا آپ مجھے جلنے سے بچا سکیں گے۔"

چھوٹے سرکار کے آجانے سے شیش محل کے دِن پھر گئے۔ وہی لوگ

تھے، وہی محفلیں، وہی ہنگامے۔ لیکن جیسے ہر چیز میں جیسے جان سی پڑ گئی ہو ——
بڑی پاشا کے ہونٹوں سے ہنسی جدا نہ ہوتی تھی۔ بڑے سرکار کا چہرہ خوشیوں سے دمکتا رہتا تھا۔ تین بیٹیاں اور بھی تھیں لیکن اپنے اپنے گھروں کی۔ یہ اکلوتے بیٹے تھے اور اتنی مدت بعد پار پردیس سے، نیلے پانیوں کے دیس سے زندہ سلامت اور کامیاب ڈاکٹر بن کر لوٹے تھے، اور بڑی بات یہ کہ کوئی میم ساتھ نہیں لائے تھے۔ جتنی بھی خوشیاں کی جاتیں کم تھیں۔

چھوٹے سرکار بڑی بیٹی کے بعد کے بیٹے تھے۔ دو بہنیں چھوٹی تھیں، سب بیاہی جا چکی تھیں۔ یہ بڑے ہو کر بھی اس لئے کنوارے تھے کہ انہوں نے خود ہی کہا تھا کہ جب تک میں اپنی تعلیم پوری نہیں کر لیتا بیاہ اور گرہستی کے جھنجٹ میں نہیں پڑوں گا۔ بڑے سرکار اس بات سے خوش بھی تھے۔ حیدر آباد دکن کے عام نواب گھرانوں کے برعکس جہاں لڑکے گھر کی اصیل باندیوں، پیش بندھیوں سے عشق لڑاتے اور بستر گرم کرتے پھرتے تھے۔ بڑے سرکار نے اپنے بیٹے کو تعلیم سے سنوارنا اپنا فرض جانا تھا دولت گھر کی باندی سہی، مگر وہ چاہتے تھے لڑکا کوئی ہنر سیکھے، اور زندگی میں کبھی برا بھلا موقع آئے تو کسی کا دستِ نگر نہ بنے۔ اب خدا نے سارے ارمان پورے کر دئیے تھے اور وہ اسی ایک دن کے انتظار میں تھے۔ جو اُن کی ساری ذمہ داریوں کی آخری حد تھا ——

تینوں بہنیں اپنے اپنے شوہروں، بچوں کے ساتھ آئی ہوئی تھیں۔ چھوٹی پھوپھی تو اسی گھر میں رہتی تھیں۔ دوسری پھوپھیاں، ممانیاں، ماموں سب ہی جُڑے ہوئے تھے —— محل اتنا بڑا تھا کہ اتنے سارے لوگوں کو سمو لینے کے بعد بھی بانہوں کے لئے آغوش وا کئے رہتا۔ ایک دن چھوٹے پاشا اپنے کسی انگریز دوست کو محل کی سیر کرانے کے لئے لائے تھے۔ صبح کے گیارہ بجے سے شام کے پانچ بج گئے، مگر

محل کی حدیں ختم نہ ہوئیں۔ اتنے بڑے محل کا ایک فائدہ یہ بھی تو تھا کہ سب کی نگاہیں بچا کر وہ چاہتے تو کسی بھی گھڑی محل کے اُوپری حصّے میں جو سب سے الگ تھلگ تھا، اپنی دُنیائے محبت آباد کر سکتے تھے۔

شمع سے ان کی اب تک صرف ایک ہی ملاقات ہوئی تھی —— ایک ملاقات جو زندگی بھر کی خوشیوں کا حاصل بن کر رہ گئی تھی۔ وہ کسی دوسری ملاقات کے خواہش مند ہی تھے کہ ایک دن ایک چھوٹی سی واردات ہو گئی۔

محل کے سارے لڑکے لڑکیوں نے پروگرام بنایا کہ اب تو چند دن میں ہی آفتاب بھیا اپنی ڈسپنسری سنبھال ہی لیں گے۔ اور پھر مریضوں اور دواؤں میں ہی اُلجھے رہیں گے، اس لئے کیوں نہ اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے "گنڈی پیٹھ" کی زوردار پکنک منائی جائے۔

بڑی پاشا کو خدا ایسا موقع دے —— وہ تیاری اور ہنگامہ مچایا کہ اتنے خرچ میں ایک چھوٹی موٹی شادی ضرور رچ جاتی —— بڑے سرکار کے پاس سیاہ فورڈ تھی —— وہ کہیں آتے جاتے تو اسی کو استعمال کرتے۔ خاص خاص موقعوں کے لئے بیگم اور بچوں کو بھی اجازت تھی۔ عام محل والوں کے لئے شکرامیں اور تانگے تھے جو محل ہی کے تھے۔ تلن، پکن، تیاریوں اور ہنگاموں کے بعد طے ہوا کہ محل کے سارے لوگ تو صبح سے ہی شکراموں اور تانگوں میں بھر بھر کر گنڈی پیٹھ چلے جائیں، اور ان سب کے وہاں پہنچتے پہنچتے موٹر میں بڑے سرکار، بڑی پاشا، چھوٹے پاشا اور بہنیں چلی جائیں گی۔

سب سامان چلا گیا —— لوگ چلے گئے۔ بس محل میں چند بوڑھی نوکرانیاں چند دربان اور کچھ غریب رشتہ دار رہ گئے —— جب سب موٹر میں بیٹھ گئے تو اندر سے شمع تیزی سے پاندان لئے لپکی آئی، اور موٹر کے قریب آ کر بڑی پاشا سے بولی۔

"پاشا سلامت —— آپ پاندان بھولے جارہی تھیں۔ ناگاہ میری نظر پڑگئی۔ آپ تو تمباکو کی بھی عادی ہیں، دن بھر کتنی پریشان ہو جاتیں"۔

بڑی پاشا نے جھپٹ کر پاندان لے لیا اور اسے ان الفاظ سے نوازا: "تو منحوس ماری جاتے وقت ضرور اپنی اُجاڑ صورت بتائے گی، چل ہٹ سامنے سے"۔

چھوٹے سرکار نے بڑی حیرت سے یہ سب کچھ دیکھا۔ شمع سر جھکائے جانے لگی تو انہوں نے ماں سے کہا "امی جان جہاں سب ہی لوگ تفریح کے لئے گئے ہیں۔ آپ شمع کو بھی کیوں نہیں لے لیتے ——" اور انہوں نے ماں کے جواب کا انتظار کئے بغیر باپ سے بھی پوچھ لیا "کیوں ابا حضور، میں غلط تو نہیں بول رہا ——"

"ہاں ہاں بیٹے۔ آخر اُنے بچہ ہی تو ہے ——"

"ہو ہو۔ ایسی اِچ بچہ ہے تو اسے اپنی گود میں بھر لیو نا ——" بڑی پاشا چلائیں —— جگہ تو ہے نہیں ہور ساتھ لے جائیں گے بڑے"۔

"ماں کی بات پر کان دئے بغیر چھوٹے سرکار موٹر کا پٹ کھول کر کھڑے ہوگئے بہنوں نے ذرا ذرا کھسک کر جگہ بنا دی —— شمع نے دونوں ہاتھ جوڑ دئے اور سنجیدہ لجاجت سے بولی "مجھے معاف کیجئے گا۔ محل میں بہت سارے کام پڑے ہوئے ہیں"۔

وہ پیٹھ پھیر کر مڑی تو بڑے سرکار نے نرمی سے پکارا۔ "آجاؤ بیٹی —— کام تو زندگی بھر انسان کے ساتھ لگے ہوئے ہیں"۔

اس محل میں بڑے سرکار نے اسے باپ کا سا پیار دیا تھا۔ وہ ان کی کوئی بات نہیں ٹالتی تھی۔ بڑی پاشا کی خونخوار نگاہوں سے بچتی بچاتی وہ موٹر میں بیٹھی ہی تھی کہ وہ زور سے چلائیں "اگے میں مرگئی گے، اِتنے لوگاں اِتی سر کی گاڑی میں ٹھونسیں گے تو مردہ نہیں نکلے گا کیا دوسروں کا"۔ اور وہ دھڑ سے دوسری طرف کا پٹ کھول کر نیچے اُتر گئیں "لے جاؤ اپنی ہوتی سوتی کو، میں رہوں گی یہیں اِچ محل میں"۔

اُن سے زیادہ تیزی سے شمع اُتر گئی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر چھوٹے سرکار سے بولی "للہ آپ مجھے جانے دیجئے۔" اور تیزی سے اندر چلی گئی۔

بڑی پاشا گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولیں "اچھا ہُوا چلی گئی تو۔ موٹر میں وزن کتنا بڑھ گیا تھا اُجاڑ ـــــ موٹر ٹوٹ ووٹ جاتی تو؟ حیدرآباد میں اب تک کا بس دس گاڑیاں ایسے آئے، ان میں کی ایک ہے یہ۔ ایسی سواری میں ایسے فالتو لوگاں کو بٹھاتے بھلا؟"

رات کو جب سب تھک تھکا کر بے حال ہو کر لوٹے تو اپنے اپنے بستروں پر گرتے ہی سو گئے مگر چھوٹے سرکار کو رات گئے تک نیند نہ آئی ـــــ مدد کے لئے انہیں پھر چھوٹی پھوپی یاد آئیں۔

شمع آئی تو وہ چور بنے کتنی دیر تک یوں ہی کھڑے رہے۔

"گنڈی پیٹھ میں کتنا بے حساب پانی ہے شمع بی بی۔ مگر ہم کو اس میں سے ایک چلو تک نصیب نہ ہوا کہ اپنی بے غیرت زندگی کا خاتمہ کر لیتے۔"

شمع انہیں ایک ٹک دیکھے گئی۔

"ہم سچ کہہ رہے ہیں۔ ہم اپنے لئے نہیں، آج تو صرف آپ کے لئے جی گئے۔"

شمع نے حیرت سے آنکھیں اٹھا کر انہیں دیکھا، وہی آنکھیں ـــــ وہی آنکھیں ـــــ انہوں نے گھبرا کر مونہہ پھیر لیا۔

"صرف ایک ہی خیال نے ہم کو مرنے سے باز رکھا کہ ہم مر گئے تو آپ کے لئے دُنیا کتنی تنگ ہو کر رہ جائے گی۔"

شمع کی سسکی پر وہ پیچھے مُڑے۔

"شمع بی بی آج ہم نے امّی جان کے دل میں آپ کے لئے وہ بے پناہ نفرت

دیکھے ہیں کہ لگتا ہے کہ ان کا بس چلے تو آپ کو زندہ جلوا دیں۔"

"سو تو میں جل ہی رہی ہوں۔" وہ دھیرے سے بولی۔

وہ اس کے قریب آکر کہنے لگے "ہم سوچتے ہیں، آنے والا مورخ کبھی ہماری داستان رقم کرے گا تو آنے والی نسلیں کس قدر حیرت کریں گے کہ محبت کی یہ کیسی عجیب عمارت تھی جو پہلی ہی نظر میں اتنی استوار ہو گئی ——— ہم آپ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکیں گے شمع بی بی۔"

"جب سے اس محل میں بابا اور میں آئے میں نے یہاں سے جانے کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔ لیکن اب سوچتی ہوں کہ ہمیں یہاں سے چلا جانا چاہیئے۔" وہ اپنے پیروں کے ناخنوں سے قالین کو کرید رہی تھی۔

"یہ بات ہم سے نظر ملا کر کہیئے۔"

شمع نے سر اوپر نہیں کیا۔

"ہمیں پتہ ہے کہ آپ سے زیادہ آپ کی آنکھیں سچی ہیں۔"

شمع دونوں ہاتھوں سے مونہہ چھپا کر زور زور سے رونے لگی۔

آنے والے چند دنوں میں چھوٹے سرکار نے اپنی ماں کا شدید عتاب کئی بار شمع پر نازل ہوتے دیکھا۔ انہیں فکر تھی تو صرف یہ کہ اتنی بڑی، ایسی خوف ناک آندھی کا مقابلہ کس صورت سے کریں۔ یہ تو وہ طے کر ہی چکے تھے کہ اب جئیں گے تو شمع کے لئے، مریں گے تو شمع کے لئے۔ انہوں نے سوچا کہ امی جان سے پہلے ڈھکے چھپے اور پھر صاف لفظوں میں اپنی محبت کا اظہار کرنا زیادہ مناسب ہوگا، تاکہ وہ دھیرے دھیرے عادی ہوتی جائیں۔

اُس دِن صُبح ہی صُبح جب وہ اپنی ماں کے پاس بیٹھے تھے تو چاندی کی طشت میں سلیقے سے چائے سجائے شمع آگئی ———

تسبیح پٹخ کر بڑی پاشا بولیں ــــــ "صنوبر، نو بہار، گل چمن، سوسن کاں مر گیاں
کہ تو اپنی منحوس صورت صبح اچ صبح میرے سامنے لے کو آ گئی ـ"
وہ سہم کر بولی: "جی پاشا سلامت کے ذہن سے شاید اتر گیا ہو کہ محل میں
بہت سارے مہمان آئے ہوئے ہیں، وہ سب اُن ہی کے ناشتے کے انتظام میں
منہمک ہیں ـ"
"اُجاڑ، یہ نزاکت کی باتاں، ہور گلابی لاڑاں میرے کو نکّو ــــــ اپنی دتی کو
پٹخو سِل بٹّے پو، ہور نکلو میرے سامنے سے ـ"
وہ یوں ہی جھجکی کھڑی رہی ــــــ چائے پیالیوں میں انڈیل دوں پاشا سلامت ـ"
"اپنے کھوپڑے پر انڈیل لو ـ" یہ گویا چائے بنانے کی اجازت تھی ـ وہ اپنے
بیٹے سے مخاطب ہو گئیں ـ "تم بیٹا صبح صبح اس کا موہنہ مت دیکھا کرو ـ ایسی منحوس ہے جس
دن یہ محل میں داخل ہوئی، میرے آنگن کی اچھی بھلی گلاب کی جھاڑی مرجھا گئی ـ پورے
کلیاں جل گئے ـ"
چھوٹے سرکار نے پہلی بار لب کھولے: "امی جان کلیاں اپنے سے زیادہ
خوب صورت اور حسین کلی کو برداشت نہیں کر سکے ـ اس لئے مارے حسد کے
جل کے رہ گئے ـ"
پیالی گرم گرم چائے سمیت بڑی پاشا کے جسم پر گر گئی ـ

مخملیں گدّوں اور تکیوں والے شان دار دیوان پر پڑے نواب صاحب
بیٹھے پیچواں گڑگڑا رہے تھے ـ سامنے لگے ہوئے دبیز صوفوں اور کوچوں پر ان
کی بہنیں بیٹھی تھیں ـ ایک صوفے پر پاندان سنبھالے بڑی پاشا تمکنت سے
بیٹھی ہوئی تھیں ـ

"اب آپ کیا سوچے بیٹے کی شادی کے بارے میں؟"

نواب صاحب حیرت سے بولے "سوچنا؟ سوچنا کیا ہے؟ آپ تو خود اچ بچپن سے منگنی کر کو بیٹھے ہیں۔"

"وہ تو میں توڑ دی۔" انہوں نے بے پروائی سے کہا۔

"جی؟" انہوں نے جھٹکے کی نئے چھوڑ دی "ایسے کیسے توڑ دئے آپ بلا وجہ؟"

"بلا وجہ کائے کو ــــ وہ نواب اقتدار یار جنگ حضور نظام کی شان میں قصیدہ پڑھے۔ تو وہ ایک ہور جاگیر اُنوں کو بخشے نا؟ میں پتہ چلائی اُن کی ایک اچ بیٹی ہے، ہور اِتی دولت پہلے سے تھی، ہور اب ایک پوری جاگیر مل گئی۔ تو ان کے مرے پیچھے تو وہ ساری جائداد بیٹی کو اچ تو جہیز میں ملنے والی نا ــــ تو میں وہ ٹھیکرے کی مانگ توڑ دی ــــ" بات کی شدت کم کرنے کو وہ بولیں "ہور اُجاڑ ٹھیکرا توڑنے کو دیر بھی کیا لگتی، اٹھاؤ ہور پھینک دیو ــــ بات ختم ــــ!"

مگر بات ختم نہیں ہوئی، بڑے سرکار سناٹے میں آ گئے۔ سنبھل کر بولے "بیگم ہم کو ایک بات بتایئے ــــ آپ جب دنیا میں آتے تھے تو آپ کے ہاتھاں میں کچھ تھا کیا؟ نہیں نا؟ ہور جائیں گے بھی تو کچھ بھی نئیں رہیں گا۔ پھر کائے کو آپ اتے توڑ جوڑ کرتے؟ کچھ خدا کا بھی خوف ہے کہ نئیں؟"

چھوٹے سرکار دور ایک صوفے میں چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے اپنی جگہ دہل کر رہ گئے۔ دولت ــــ دولت ــــ دولت ــــ آخر کتنی دولت؟ انہیں پتہ تھا کہ رشتہ داری میں ہی کہیں ان کی منگنی ہو چکی تھی۔ اسی ایک بات پر کہ گھرانے برابری کے ہیں۔ دولت گھر کی لونڈی ہے اور اب پھر مزید دولت

کے لئے پہلی بات توڑ دی گئی ہے کہ دوسری جگہ وہاں سے پیسہ زیادہ ہے تو کس طرح اُمید رکھی جائے کہ امی جان ایک غریب لڑکی سے جو اسی محل کے ٹکڑوں پر پرورش پا رہی ہے، شادی کرنے دیں گی ؟

اُنہوں نے بزرگوں کے بیچ میں دخل دینا مناسب تو نہ جانا مگر چپ رہنا بھی ٹھیک نہ سمجھا، دھیرے سے باپ کو مخاطب کر کے بولے "ابا حضور میں ابھی چند سال شادی کرنا ہی نہیں چاہتا۔"

بڑے نواب محبت سے ہنسے۔ "چند سال؟ بیٹے آپ کے پاس شادی ملتوی کرنے کی کوئی معقول وجہ ہے ؟ تعلیم آپ پا چکے، ڈاکٹر آپ بن چکے، خدا کے کرم سے آپ کے پاس گھر ہے، جائداد ہے، شاندار ڈسپنسری تیار ہو رہی ہے۔ پھر اب کیا اعتراض ہے آپ کو ؟"

یہ اتنا مدلل سوال تھا کہ وہ کچھ بھی جواب نہ دے سکے۔ ماں بولیں "ہور چھوٹے بہناں بال بچوں والے ہو گئے۔ ایک ایک آنے جانے والا پوچھتا کہ کب ولیمے کا کھانا کھلاتے۔ ہور بیٹے تو منہ میں لڈو بھر کو بیٹھے۔" پھر شوہر کی طرف مڑ کر بولیں : "میں کل اچ اختدار یار جنگ کے وہاں بات لے کر جاتیوں۔ آپ اکیاون اشرفیاں اُجلوانے کو سنار کنے بھجوا دیو۔"

"نہیں ـــــ نہیں" چھوٹے پاشا اپنے لہجے کی تیزی اور بدتمیزی پر خود ہی خائف ہو گئے۔ سب نے انہیں چونک کر دیکھا ـــــ وہ جس تیزی سے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے، اسی تیزی سے پھر بیٹھ گئے۔ بڑی پاشا غصے میں پیر پٹختی چلی گئیں۔ اُن کے جاتے ہی سب ایک ایک کر کے اُٹھ گئے۔"

بڑے سرکار پیچوان ایک طرف ہٹا کر اُٹھ گئے۔ دھیرے دھیرے چل کر بیٹے تک آئے اور اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بے حد نرمی اور پیار سے بولے "بیٹے،

ہم نا عیر مت سمجھو، یو یو، آپ کے دل میں کیا بات ہے —— آپ کے دِل کا حال آپ کے چہرے سے ظاہر ہے۔"

"ابّا حضور —— "انھوں نے اپنی ساری ہمت اور طاقت جمع کی لیکن آواز مونہہ سے نہ نکلی۔

"کیا آپ ولایت میں کسی سے وعدہ کر کو آ گئے ہیں۔ شرماؤ مت بیٹا، جوانی کے گُناہ تو خُداوند تعالیٰ بھی معاف کر دیتے ہیں، ہم تو باپ ہیں —— خیر بندے اس کے۔"

"جی نہیں ابّا حضور —— آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔"

"پھر بھی بٹیا —— آپ کا انداز اور اضطراب بلا وجہ کا نہیں۔"

"ابّا حضُور، ایسی انہونی خواہش کا اعتراف نہ کرائیے جس کے بارے میں سوچا بھی نہ جا سکے۔" اور وہ تیزی سے اُٹھ کر، باپ کو حیران و ششدر چھوڑ کر دیوان خانے سے چلے گئے۔

لیکن بڑے سرکار کو اس دن آپ ہی آپ پتہ چل گیا کہ وہ انہونی خواہش کیا ہو سکتی تھی۔

عید کا دِن تھا —— دُنیا بھر کے ہنگامے آج محل میں اُٹھ رہے تھے۔ لڑکیوں نے رات ہی سے مہندی لگا لی تھی۔ صبح سے منہارن آنگن میں آ بیٹھی تھی۔ زیورات کے ڈبّے نکل رہے تھے —— یہاں وہاں بھڑکیلے، جگر مگر کپڑوں کے ڈھیر نظر آ رہے تھے۔ باورچیوں اور ماماؤں نے ایک طوفان اُٹھا رکھا تھا۔ بقرعید عید الفطر کے مقابلے میں ایسی کوئی ہنگامہ خیز عید نہیں ہوتی۔ لیکن بڑی پاشا دونوں ہی عیدوں پر اتنی ہی تیاریاں کرتیں —— بقرعید پر بھی وہ میٹھی عید کی طرح شیر خورمہ

سوتیاں پکواتیں کہ گوشت اور بریانی، کباب کھاتے کھاتے جی مُوا اُوب جاتا تو اوبدا کر میٹھے کی یاد آتی۔ اُسی چاؤ سے پورے محل والوں کے کپڑے سِلتے ——— اور پھر یہ عید تو اُن کے جان کے ٹکڑے کی آمد کے بعد کی پہلی عید تھی، جو عید الفطر سے بھی بھاری تھی۔ انہوں نے لس لس کر کے رول دار اطلس کا سفید پاجامہ بیٹے کے لئے سِلوایا تھا۔ ہلکے گلابی جامہ دار کی اچکن اور اسی کپڑے کی ٹوپی سلوائی تھی ——— آفتاب بیٹے تھے بھی تو ایسے وجیہہ، یہ جوڑا پہن کر تو پتہ نہیں محل میں کتنوں کا قتل کرواتے۔

شمع روز کی طرح آج بھی ویسے ہی سفید کپڑوں میں تھی ——— نہ کنگھی، نہ چوٹی ——— نہ کاجل، نہ مہندی ——— بیوہ کے لئے سنگھار ضروری بھی کیا ہے؟ عیدگاہ چلنے سے پہلے، شمع سونے کی تھالی میں ہرے ہرے پان لئے آئی تو بڑے سرکار نے بڑے افسوس سے اسے دیکھا ——— بے چاری روز کی طرح آج بھی اُسی سفید جوڑے میں ہے۔ پان اُٹھا کر کمرے سے نکلے تو بیٹے عیدگاہ جانے کے لئے تیار کھڑے تھے، وہ انہیں دیکھ کر چونک سے گئے۔

" بیٹے آپ کی امی جان تو آپ کے واسطے گلابی اچکن اور گلابی ٹوپی تیار کروائے تھے، اور اطلس کا پاجامہ۔ آپ تو سادے ہرک کے پاجامے اور ہکور ململ کے کُرتے میں ہیں۔"

چھوٹے پاشا اُداس سی ہنسی ہنس کر بولے۔" کچھ نہیں ابا حضور ——— خوشی سب مِل کر منائیں تو خوشی لگتی ہے ——— کوئی اُداس اور ملول ہو تو اندر سے دِل گناہ گار محسوس ہوتا ہے۔"

اُسی دم پان کی تھالی لئے شمع اندر سے نکلی تو بڑے سرکار کی سمجھ میں سب کچھ آگیا ——— بیک وقت دونوں کے لئے ان کے دِل میں بے پناہ غم جاگ اُٹھا۔

"ہم اس محل کے حاکم ضرور ہیں، مگر بیگم کے سامنے ہماری آواز میں کیا دم ہے؟ کاش ہم تمہارے لئے کچھ کر سکتے بچہ۔" انھوں نے کرب سے سوچا۔

کھانے کی چوکیوں کے گرد محل کے سب لوگ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ سرخ سرخ دسترخوان پر رنگ برنگے کھانے چنے ہوئے تھے۔ فرش کے کناروں سے لگی چاندنیوں سے ہٹ کر کنیزیں چاندی کی کشتیوں میں چاندی کے گلاس سجائے پانی لئے کھڑی تھیں —— اچانک چھوٹے سرکار کو ٹھسکا لگا۔ شمع تیزی سے پانی لئے لپکی —— گھبراہٹ میں گلاس ہاتھ سے چھوٹ گرا۔ نرم چاندی کا گلاس زمین پر گرتے ہی ٹیڑھا ہو گیا۔

"ہو ری، چھوٹے پاشا کو ٹھسکا لگا تو تیرے کو کائے کو بچھو کاٹا کرا تی زور سے دوڑی کہ گلاس چپکا کو رکھ دی۔"

شمع ندامت سے چور لہجے میں بولی: "پاشا سلامت زور سے اچھو لگ جانا کبھی کبھار خدا نہ کرے مہلک ثابت ہوتا ہے۔ میں اسی خیال سے تیزی سے لپکی تھی۔"

بڑے سرکار، چھوٹے سرکار کے رنگ بدلتے چہرے کو دیکھ رہے تھے، بات سلجھانے کو بیگم سے کہنے لگے۔ "آپ کیوں خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنائے دیتے، گلاس چپکا تو کیا ہوا، سناراں مر گئے کیا؟ سیدھا کر دیں گے۔"

"ہو ہو —— میں اندھی نئیں۔ دیکھتی نئیں کیا؟ ایک سرے سے ساروں کو اِچ اس مال زادی کا درد آتا۔" انھوں نے خاص طور سے بیٹے کو سنایا۔ پھر شوہر کی طرف ہاتھ چلا کر بولیں: "منع کون کرتا؟ سلا لیو نا اپنے سنگات —— کیا کیا تماشے کرلے کو بیٹھے۔ یاد نئیں کیا میرے کو؟ اب بھی کیا گیا۔ . . . . ."

"بیگم ــــ بیگم !" نواب صاحب اپنی پوری طاقت سے چلّائے "زبان کو رو کئے۔ یہ خاندان گراوٹ کی کئی حدیں پار کیا۔ مگر آج تک کوئی شوہر اپنی بیوی پر ہاتھ نہیں اُٹھایا۔ ہمارے عتاب کو مت للکاریئے ــــ ہو ر ایسی ذلیل بات موہنہ سے نکالنے سے پہلے آپ کی زبان جل جاتی ہو ر ہمارے کان بہرے ہوجاتے تو اچھا تھا ــــ" انہوں نے اپنے غصّے کو دباتے ہوئے دھیرے دھیرے کہا۔ "بیگم سب ہی پھول اس لائق نہیں ہوتے کہ اُنہیں بستروں میں روندا جائے ــــ بعضے بعضے پھول گلدان میں بھی سجائے جاتے ہیں۔"

اس رات چھوٹے پاشا حیران رہ گئے۔ آدھی رات کے وقت شمع بن بلائے ان کے کمرے میں تھی!

اس نے بڑی بے بسی سے انہیں مخاطب کیا۔ "قبلۂ عالم ــــ میں آپ سے کچھ مانگنے آئی ہوں۔"

انہیں اس کے اندازِ تخاطب پر غصّہ آ گیا۔

"نہ میں کوئی بادشاہ ہوں نہ آپ کنیز۔ یہ آپ مجھ کو قبلۂ عالم کیوں پکارتے ہیں ــــ"

"میں کنیز ہوں یا نہیں، لیکن آپ بادشاہ ضرور ہیں۔ اتنا بڑا محل اتنی ساری دولت، اتنے نوکر چاکر، اتنے عیش، بڑی بڑی جاگیریں، اور بادشاہ کیسے ہوتے ہیں؟"

"ساری دُنیا ہمیں جلا رہی ہے۔ ایک آپ رہ گئے تھے، آپ بھی جلا لیجئے ــــ"

وہ مسکرا دی ــــ اسے چھوٹے سرکار کے اندازِ گفتگو پر کبھی کبھار ہنسی آجاتی تھی۔ کبھی خود کو 'ہم' بولتے کبھی 'میں' اُسے ــــ اس طرح مخاطب

کرتے جیسے کسی مرد سے بات کر رہے ہوں —— اس کو مسکراتا دیکھ کر وہ بولے "آپ ہماری زبان کی ہنسی اُڑاتے ہیں نا۔ اسی لئے آپ سے بات کرتے ہم ڈرتے ہیں۔"

"خُدا نہ کرے جو مَیں آپ کی کسی بات پر ہنسوں۔"

وہ بھی مُسکرائے "خیر ابھی تو آپ ہنس لیجئے مگر آپ کے ساتھ رہیں گے تو آپ کی سی میٹھی بولی بھی بولنے لگیں گے۔"

"آپ کے ساتھ؟" شمع کا چہرہ اُتر گیا، وہ دُکھ سے بولی "آپ کتنے بھولے ہیں۔ کیا واقعی آپ سمجھتے ہیں کہ زندگی میں ہم کبھی ساتھ رہ سکیں گے۔"

"کم سے کم آج تک تو ہم نے جو بھی سوچے وہی کئے ——" وہ ایک عزم کے ساتھ بولے۔

"قبلۂ عالم" وہ رنجیدہ ہو کر بولی "مَیں آپ کو ایک بات بتاؤں؟ جس دن دیوان خانے میں آپ کی شادی کی بات چل رہی تھی کہ مَیں مشروبات کا طشت لئے داخل ہو ہی رہی تھی کہ آپ کی شادی کا ذکر کانوں سے جا ٹکرایا۔ پھر مَیں اندر داخل نہیں ہوئی۔ الگ ہٹ کر ساری باتیں مَیں نے سُنیں۔ چھُپ کر باتیں سُننا کوئی بڑی اچھی حرکت نہیں، لیکن مَیں نے اس لئے جان کر سُنیں کہ چھوٹے خوابوں کے سحر سے خود کو آزاد کر سکوں۔"

چھوٹے سرکار حیرت سے اُسے دیکھ رہے تھے، اور وہ کہے جا رہی تھی "اور آج مَیں آپ سے یہی مانگنے آئی تھی کہ آپ —— آپ نواب اقتدار جنگ کی بیٹی سے شادی کر لیجئے۔" وہ منہ پھیر کر بولی "آنکھوں کا ایک کام دیکھنا ہے، ایک کام رونا اور ایک کام خواب بُننا۔ اب مَیں مزید خواب نہیں بُن سکتی۔"

"آپ ہمیں ارادوں کا اتنا کچا سمجھتی ہیں؟"

"جی نہیں —— یہ مَیں نے کبھی نہیں کہا۔ لیکن آپ نے کبھی اس بات پر غور

بھی کیا کہ پہلی بات تو یہ کہ آپ کو اس بات کی اجازت ہی نہیں ملے گی کہ آپ مجھے اپنی زندگی کا ساتھی بنائیں —— بالفرضِ محال آپ نے ضد میں آکر ایسا قدم اٹھا بھی لیا تو آپ میری جگہ خود کو تصور کیجئے۔ جس لڑکی پر اتنی مدّت سے اس محل میں گالیاں، جھڑکیاں اور طرح طرح کی اُفتادیں پڑتی رہیں ہوں، اُسے دُلہن بیگم کے رُوپ میں کبھی قبول کیا جا سکتا ہے؟ نوکرانیاں مجھ پر ہنسیں گی۔ بیش بندھیاں طعنے دیں گی۔ خادمائیں مجھے دیکھ کر دِل ہی دِل میں مُسکرائیں گی۔ کیا میں یہ سب کچھ سہہ سکوں گی؟ اور پھر سارے رشتہ دار۔۔۔۔۔"

"ہم اس محل سے ہی چلے جائیں گے۔ ایک ڈاکٹر اتنے پیسے تو کما سکتا ہے کہ دو انسانوں کا پیٹ پال سکے۔"

"اور آپ سمجھتے ہیں کہ میں اتنی گری ہوئی لڑکی ہوں کہ ایک اکلوتے بیٹے کو ایک چاہنے والی ماں اور مر مٹنے والے باپ کی آغوش سے کھینچ لوں؟"

"ہم ابا حضور سے بات کریں گے، وہ بہت نرم دِل ہیں۔"

"ابا حضور کی اجازت سے کیا ہو گا؟ اتنی ساری نِگاہوں کا سامنا تو مجھ کو کرنا ہو گا نا؟" وہ تیزی سے بولی "میں آپ سے کہہ رہی ہوں کہ میں خود آپ سے شادی نہیں کرنا چاہتی —— یہی میرا فیصلہ ہے۔

اور دونوں ہاتھوں سے مونہہ چھپائے روتی ہوئی باہر نکل گئی۔

اُس رات شمع اپنے بابا کی کوٹھری میں گئی اور جاتے ہی بچّوں کی طرح پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔

"بابا، مجھے دولت چاہیئے بابا —— میں نے آج تک کبھی کسی چیز کی آپ سے ضد نہیں کی۔ لیکن بابا اب میں آپ سے سونے کے ڈھیر مانگتی ہوں۔"

مرزا صاحب نے حیران ہو کر اُسے دیکھا۔ وہ روئے جا رہی تھی۔

"بابا اتنے برسوں سے آپ اس محل کی زمین داری کے حساب کتاب دیکھ رہے ہیں۔ بابا اتنی ایمان داری کی بھی کیا ضرورت تھی۔ آپ چاہتے تو محلے دو محلے کھڑے کر سکتے تھے، مگر آپ کو اپنی بیٹی سے زیادہ اپنی عاقبت عزیز تھی ......"

"بیٹی —— بیٹی" وہ جاگتی ہوئی بیٹی کو یوں جھنجوڑ رہے تھے، جیسے وہ گہری نیند میں ہو" تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا بیٹی؟"

ایک دم شمع چونک سی گئی۔ "بابا —— میں اچھی ہوں بابا —— میں کچھ پاگل سی ہو گئی ہوں۔ مجھے معاف کر دیجئے بابا —— آپ میری کسی بات کا بُرا نہ مانیے گا۔ آپ ایک ہی تو ہیں دُنیا میں، جسے میں جو چاہوں کہہ سکتی ہوں —— لیکن آپ سے کیا کہوں بابا —— سب کچھ کہہ کر آپ کا دِل دُکھاؤں تو کیسے"۔ اچانک وہ اسی تیزی سے اُٹھی اور" بہت رات بھیگ گئی بابا —— آپ کو نیند آ رہی ہو گی سو جائیے" کہہ کر، انہیں حیران چھوڑ کر وہ اسی بدحواسی کے عالم میں باہر نکل گئی۔

دُوسرے دِن —— پہلی بار چھوٹے سرکار مرزا منصور احمد سے ملے۔

"بابا میں بہت شرمندہ ہوں کہ آپ سے اس سے پہلے نہ مِل سکا۔

"بابا؟" انہوں نے حیرت سے اس عالی شان محل اور بے پناہ جاگیر کے ولی عہد کو دیکھا —— سارا محل انہیں منصور میاں کہہ کر پکارتا تھا۔ اس میں بچے بوڑھے کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ آج چھوٹے سرکار کے مُنہ سے اپنے لئے "بابا" جیسا محبت بھرا لفظ سُن کر وہ پگھل سے گئے۔

"آپ بھی کمال کرتے ہیں سرکار۔ آپ مجھ سے معافی مانگ رہے ہیں! کیوں مجھے گناہ گاروں میں شامل کئے دیتے ہیں آپ"

"بابا۔ آپ تو دہلی کے رہنے والے ہیں نا —— پھر آپ حیدر آباد دکن میں کیسے

چلے آئے ؟"

"سرکار ـــــ آپ کے والد صاحب ایک بار دہلی تشریف لائے تھے۔ اُس زمانے میں سابق دیوان صاحب نے ایک عظیم رقم خُرد بُرد کر دی تھی جس کی وجہ سے بڑے نواب صاحب حد درجہ پریشان تھے اور اپنی پریشانی کا اظہار انہوں نے میرے مالک سے کیا تھا ـــــ محمد ضیاء الدین میرے مالک، بڑی خوبیوں کے حامل بُزرگ تھے۔ انُہوں نے نواب صاحب سے کہا تھا۔" ہم آپ کو ایک ایسا ایماندار آدمی دیتے ہیں جس پر آپ اپنی ذات کی طرح بھروسہ کر سکتے ہیں۔" ان الفاظ نے میری قدر و قیمت میری نگاہوں میں بھی اُونچی کر دی۔"

"اور یوں آپ اپنے خاندان سمیت یہاں چلے آئے۔

"خاندان کیسا بیٹا۔" وہ دُکھ سے بولے۔" میری اہلیہ کا انتقال تو مدت ہوئے ہو چکا تھا۔ ہماری شادی کے کئی برس بعد اللہ نے ہمیں ایک بچی سے نوازا تھا ـــــ اس وقت وہ بارہ سال کی تھی ـــــ تب سے ہم یہیں ہیں ـــــ سات برس سے۔"

"ہم نے سُنے تھے کہ آپ کی بیٹی کی شادی ہو چکی ہے ؟"

"جی ہاں حضور ـــــ اور وہ شوہر کا مونہہ دیکھنے سے پہلے بیوہ بھی ہو گئی برات عقد خوانی ہوتے ہی روانہ ہو گئی تھی۔ ابھی دُلہن دُولہا نے ایک دوسرے کو آنکھ بھر کر دیکھا بھی نہیں تھا ......" وہ مونہہ پھیر کر آنکھیں خشک کرنے لگے ـــــ " اللہ نواب صاحب کو اچھا رکھے ـــــ انہوں نے ہی شادی کے لئے پانچ سو روپے کی خطیر رقم عنایت فرمائی تھی۔ شادی ہم نے وطن جا کر کی تھی۔ نواب صاحب کو اس حادثے کا علم ہوا تو انہوں نے پھر ہم دونوں باپ بیٹی کو واپس بلوا لیا۔"

تھوڑی دیر بڑی دردناک خاموشی چھائی رہی۔ پھر منصور احمد ہی بولے :

"تب سے بٹیا بڑی اُداس زندگی گزار رہی ہے۔ پہلے ہی اُسے یہ احساس مارے ڈالتا تھا کہ اس کے پیدا ہوتے ہی ماں مرگئیں ——— دوسرا داغ اس کی زندگی پر یہ لگا ——— مگر بٹیا بڑی صابر بچی ہے ——— زندگی غریبی میں گزار دی — کبھی کسی چیز کی فرمائش کی، نہ کسی کمی کا گلہ ———" پھر وہ ذرا غم ناک سی ہنسی ہنس کر بولے " لیکن پتہ نہیں کل رات اُسے اچانک کیا ہوگیا تھا۔ میرے گلے لگ کر رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ بابا مجھے سونے کے ڈھیر چاہئیں۔"

چھوٹے سرکار دہل کر کھڑے ہو گئے۔ " بابا " وہ اتنا ہی کہہ سکے۔

" آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا حضور"۔ منصور احمد پریشانی سے بولے۔

" بابا ہمیں آپ کی بیٹی بہت پسند ہے!" وہ جلدی سے کہہ گئے۔

بابا کا دِل ڈوب گیا ——— سارا معاملہ ان کی سمجھ میں آگیا ——— سونے کے ڈھیر کی انہونی فرمائش ان کے دِل و دماغ پر ہتھوڑے چلانے لگی ——— بٹیا رانی کی رات والی آہ و زاری اور کشمکش ان کی سمجھ میں آگئی۔ انہوں نے سوچا۔ جھوٹے دلاسوں سے اچھا ہے کہ بات یہیں ختم کر دی جائے:

" لیکن حضور آپ نے کبھی اپنی آسمان جیسی عظیم شخصیت کو بھی دیکھا ہے؟"

" ہم آپ کا مطلب سمجھتے ہیں بابا۔ لیکن آپ نے بھی کبھی آبشار دیکھا ہے؟ سربلند سرکش، کتنی اُونچائی سے نکلتا بہتا ہے، لیکن سر پٹختا ہے نیچے آکر زمین کے قدموں میں!" اور وہ تیزی سے اُٹھ کر چلے گئے۔

بابا نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔

بڑے سرکار کی شان دار خواب گاہ میں صرف تین نفوس بیٹھے ہوئے تھے۔ خود بڑے سرکار، بڑی پاشا اور چھوٹے سرکار۔

بڑے سرکار نے سرسری انداز میں بات شروع کی۔ "بیگم آپ بول لیے تھے کہ چھوٹے پاشا کی شادی اب کرہی ڈالنا۔"

"ہور نئیں تو کیا —— میں تو اب شگن کے اشرفیاں ہور مٹھائی لے کو اختدار یار جنگ کے وہاں جا اچ رئی ہوں۔"

"بیگم ——" انہوں نے کنکھار کر گلا صاف کیا۔ جو پہلے ہی سے صاف تھا "مگر کبھی چھوٹے پاشا کو کوئی لڑکی پسند ہوئی تو؟"

"خاندان برو بر ہوا، ہڈی خون ہمارے جیسا برابری کا ہوا، لڑکی آنکھ ناک سے درست رہی ہور پیسہ جاگیرا اپنے جیسے توڑ کا ہوا تو کیوں نئیں ان کی بات سنوں گی؟"

"ان میں سے ایک بھی بات نئیں ہوئی پر لڑکی پڑھی لکھی، سلیقہ مند، حسین و جمیل ہور مگر غریب ہوئی تو؟"

"تو مٹی ڈالو اس پو —— ہم نا کیا بیٹیاں کی کمی ہے کیا؟" وہ چلائیں۔

"مگر میں سنا ہوں کہ اختدار جنگ کی بیٹی اتی خوب صورت تو نئیں۔" نواب صاحب دھیرے سے بولے۔

"رنگ تو کتنا گورا ہے، بس ذرا موٹی ہے، جس کی وجہ سے ناک گالوں میں دب کو لگتی ہے۔ پر اس سے کیا فرخ پڑتا جی —— ہم نا اس کی ناک سے شادی کرنا ہے کیا؟"

چھوٹے سرکار کے تصور میں وہ تیکھی، اونچی اور غیور ناک ابھر آئی جو دو صبیح، ملائم اور گلابی گلابی گالوں کے بیچ، ان کے ایمان کو رہ رہ کے ڈگمگاتی رہتی تھی۔

"پیسے کی تو اللہ نے ہمیں کبھی کوئی کمی نہیں رکھا۔ کیا مضائقہ ہے اگر ہم دونوں باپ بیٹے کی مرضی دیکھتے ہوئے شمع کے بارے۔۔۔۔"

دھڑسے بیگم صاحبہ اپنے چاندی کے بڑے سے پاندان پر لڑھک پڑیں۔ ان

کی حیرت کا یہ شدید ردِعمل تھا کہ مونہہ سے کوئی بات ہی نہ نکلی۔ اور وہ بے ہوش سی ہوکر گر پڑیں ــــ اُدھر سے باپ، ادھر سے بیٹے دونوں لپکے اور اُنہیں سہارا دے کر اُٹھایا۔

"امی جان ــــ امی جان! آنکھیں کھولیے۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے"

"بیگم ــــ بیگم! ذرا ہوش میں آیئے... ...بات تو سُنیئے"

بڑی پاشا نے اپنے جاتے ہوتے ہوش وحواس کو پھر سمیٹ لیا۔ اپنے گلے کا دوپٹہ اُتار کر پھر گلے میں یوں ڈالا کہ اس میں پیچ پڑ گیا۔ پھر اُنہوں نے دوپٹے کا ایک سرا شوہر کے اور دوسرا سرا بیٹے کے ہاتھوں میں دے کر کہا۔ "خوب زور زور سے اپنی اپنی طرف کھینچو، اِتا کہ میرا دَم نِکل جائے ــــ ہور جب میں مرجاؤں تو پھر جس کو جی چاہے بیاہ کر لاؤ ہور رانی بنا کو یہ محل میں بٹھاؤ"

چار مجبور نگاہیں آپس میں ملیں اور جھک کر رہ گئیں۔

ڈرتے ڈرتے پھر بڑے سرکار نے زبان کھولی "مگر بیگم، آفتاب میاں مونہہ سے ادب کے مارے نہیں کہہ سکتے، پر وہ ان کو بہت پسند آ گئی ہے..."

بڑی بیگم نے بات کاٹ دی۔ "اُ نی پسند آ گئی تو اس میں کیا خباحت ہے؟ اس کو رکھیل بنا کر رکھ لیو۔ مذہب سے بھی لونڈی باندی کی اجازت ہے ــــ دیوان صاحب سے ہزار پانچ سو دے کو خرید لیو"

"امی جان" چھوٹے پاشا اتنی زور سے چلائے کہ خواب گاہ تو خواب گاہ پورا شیش محل تھرا اُٹھا ــــ نواب صاحب پیٹھ پھیرے کھڑے تھے۔

"تو اتی سی بات کے واسطے بیٹا تم اتنے دِنوں سے شادی سے بھاگ رہے تھے ــــ؟" وہ اسی بے حسی سے بولے گئیں: "محل کے لونڈیاں باندیاں تو مالکوں کی اِچ ملکیت ہوتے۔ دیکھنا تھوڑے دِناں بعد اِچ تمہارا اس سے دِل بھر جائیں گا۔

آخر کو بیا بتا بیا بتا ایچ ہوتی ـــــ میں کل شگن لے جارہی۔" وہ اُٹھ کر چلی بھی گئیں، مگر آفتاب یوں ہی بیٹھے رہے، اور نواب صاحب یوں ہی پیٹھ پھیرے کھڑے رہے۔ بیگم کے جانے کے چاپ سن کر انہوں نے اپنا چہرہ گھمایا، اور بیٹے سے بولے "بیٹا آج تمہاری ماں جس اخلاقی گراوٹ کا ثبوت دیتے اس کے سامنے ہم اور تو کچھ نہیں کر سکتے، مگر ہم کو اپنے دبدبے اور شاہی خون کی قسم ہے کہ آج سے ہم زنانے میں جانا موقوف کرتے ہیں۔ وہ مکروہ الفاظ ہم زبان سے نکالنا بھی نہیں چاہتے، مگر یہ سمجھ لو کہ آج سے ہم سارے رشتے توڑ ڈالے۔"

دوسرے ہی دن بڑی پاشا خوشی خوشی شگون کی اشرفیاں، گیارہ جوڑے بے سلے اور مٹھائی اور پان لے کر نواب اقتدار جنگ کے ہاں پہنچ گئیں۔

اس رات دودھ لے کر شمع چھوٹے سرکار کے کمرے میں پہنچی تو وہ ٹھٹک گئی ـــــ چھوٹے سرکار جلدی جلدی بے چینی کے سے عالم میں ایک سوٹ کیس میں اپنے کپڑے بھر رہے تھے۔

وہ بناوٹی مسکراہٹ کے ساتھ بولی: "سفر کی تیاری ہو رہی ہے؟"

وہ چونک کر پلٹے "ہاں شمع ـــــ" وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولے "ہم اس محل سے جا رہے ہیں ـــــ پہلے سوچے تھے کہ اس دُنیا سے ہی چلے جائیں لیکن پھر خیال آیا کہ ممکن ہے کہ خُدا کو کبھی رحم آجائے اور زندگی میں وہ کبھی نہ کبھی ہمیں ملا ہی دے۔ اسی ایک کشش نے موت کی چاہ کو دُور کر دیا۔"

"اور یہ بھی ایک لمحے کو سوچا کہ آپ کے جانے کے بعد میرا کیا ہوگا؟ سب ہی سوچیں گے نا اور غلط نہیں سوچیں گے کہ میری ہی وجہ سے آپ کو دیس نکالا ملا ـــــ کیا میں زندہ رہ سکوں گی؟"

شمیض چھوٹے سرکار کے ہاتھ سے چھوٹ گری ـــــ وہ بچوں کی طرح سسک پڑے۔

"تم بتاؤ شمع میں کیا کروں؟ ـــــ میں کیا کروں ـــــ؟ خدا نے ہمیں یہ کس امتحان میں ڈال دیا۔"

"آپ شادی کر لیجئے ـــــ سب سے اچھی بات یہی ہے۔ ماں کا دل توڑ کر آپ کو اس دنیا میں خوشی ملے گی، نہ عاقبت ہی سدھرے گی۔"

"اور امی جان کو میرا دل توڑ کر خوشی اور عاقبت دونوں مل جائیں گے وہ طنز سے بولے۔

"ماں کا درجہ اس سے کہیں بلند ہے قبلۂ عالم۔" وہ دکھی لہجے میں بولی۔ "میں نے ماں کی محبت نہیں دیکھی تو کیا ہوا، اس محبت کو محسوس تو کرسکتی ہوں ـــــ محبت کی اس کمی نے ہی اس عظمت کو سوچنے کا حوصلہ دیا ہے۔"

وہ غصے سے بولے "تو مطلب یہ کہ میں شادی کر لوں۔ دولہا بن کر تمہاری آنکھوں کے سامنے گھوموں، دلہن کے ساتھ کمرے میں بند ہو کر رنگ رلیاں مناؤں اور باہر آکر تمہیں جلاؤں۔"

"قبلۂ عالم ـــــ جلنا تو میرا بھی مقدر ہے اور آپ کا بھی ـــــ آپ آفتاب ہیں اور میں شمع ـــــ دونوں ہی جلنے کے لئے ہیں ـــــ" پھر وہ کچھ رک کر بولی۔ "مگر ایک خوشی پھر بھی ہے کہ جلتے ہیں مگر دوسروں کو روشنی بھی تو دیتے ہیں۔"

اور وہ روتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

**شادی** کے دوسرے دن قاعدے کے مطابق دلہن کے سہاگ ـــــ کا جوڑا نندوں میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ دوپٹہ، کرتا، غرارہ ـــــ نندیں بھی تین ہی تھیں، مگر

بیگم صاحبہ کڑک کر بولیں "شمع بھی تو آفتاب میاں کی بہن اچ ہے۔ دوپٹہ بہت لمبا ہے اس کے دو ٹکڑے کر کے ایک اس کو بھی دیلو۔"

دُلہن کی نگاہوں سے بے پروا ہو کر آفتاب میاں بولے "معاف کیجئے امی جان شمع میری بہن نہیں ہے، نہ اُسے اس اترن کا حق دار سمجھئے۔"

ساس، نندوں، سسرالیوں کا لحاظ ادب کئے بغیر دُلہن نے دھیمی مگر تلخ آواز میں دُولہا سے پوچھا: "بہن نہیں تو کون ہے وہ اُجاڑ ماری؟"

"جو بھی سمجھ لو ——" انھوں نے دھیرے سے جواب دیا اور مسند سے اُٹھ گئے ——

شادی کا پہلا ہفتہ تو اس طرح گزرا کہ چونکہ شمع بیوہ تھی اور نئی دُلہن پر بیوہ کی منحوس پرچھائیں تک نہیں پڑنا چاہئے۔ اس لئے اسے دُلہن کے کمرے تک پھٹکنے بھی نہیں دیا گیا —— دُلہن نے نویں دِن اُسے دیکھا —— اور جس دِن دیکھا اس طرح دیکھا کہ سلفچی اور لوٹا لئے اسے دُولہا دُلہن کے ہاتھ دھلوانے بھیجا گیا تھا۔ نیچے سلفچی رکھے جب وہ لوٹے سے پانی کی دھار انڈیل رہی تھی تو دُلہن ایک ٹک اسے مبہوت ہو کر دیکھے جا رہی تھی۔ لوٹا لئے وہ جھکی کھڑی تھی۔ لانبے لانبے بال جھکنے کی وجہ سے زمین سے چھو رہے تھے —— سفید پاجامے، سفید کرتے سفید دوپٹے میں اس کا سفید اور گلابی چہرہ تمتما رہا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں نیچی تھیں، مگر آنکھیں نیچی رہنے سے کیا ان کا جادو دوگنا نہیں ہو جاتا۔ جن ہاتھوں میں اس نے لوٹا پکڑ رکھا تھا ان ہاتھوں کی انگلیاں مومی شمعوں کی طرح فروزاں تھیں اور شاید یہ سرخ سرخ نگینوں اور یاقوتوں جیسے ناخنوں کی سرخی ہی تھی جو اس کے چہرے کو آنچ دے رہی تھی۔

دُلہن ہاتھ دھلوا رہی تھی، لیکن اس حال میں چہرہ جو اوپر اٹھا تو بس شمع کو

تیکے ہی گیا ـــــ پانی بہہ بہہ کر کہنیوں تک جا پہنچا، اور لانبی آستینوں والے کُرتے کا کارچوب اور گوٹا تربتر ہو گیا ـــــ گیلے پن کو محسوس کر کے وہ چونکی اور جھلا کر بولی " اندھی ہے کیا؟ دِکھتا نئیں کیا۔ میرا اِتا بھاری کارچوب کا کُرتا ستیاناس کردی اُجاڑ ماری "

سرکار آفتاب دیوان پر بیٹھے تھے، وہیں سے بولے " تم تو کُرتے کی بات کرتے حسن میں وہ طاقت ہوتی ہے کہ دیکھنے والوں کی اُنگلیاں بھی کٹوا دیتا ہے "

دُلہن نے بھنّا کر اپنے دُولہا کو دیکھا اور بھڑ سے وزنی سلیفچی اٹھا کر شمع کے پیروں پر دے ماری ـــــ

" یہ حرام زادی اِتّی پیاری تھی تو پھر میرے کو کائے کو لائے بیاہ کو ـــــ جب ہی اس دن بولے کہ شمع کو دوپٹہ مت دیو، اُنے میری بہن نئیں ـــــ جس کے سنگات بستر گرم کرے سو بہن ہوئیں گی بھی کیسی ـــــ "

شمع دونوں ہاتھوں سے مونہہ چھپائے، روتی ہوئی تیزی سے بھاگ گئی

چھوٹے سرکار بے پناہ ضبط کے ساتھ بولے " شہزادی پاشا ـــــ وقت مہربان بھی ہے اور جلاد بھی ـــــ اس لمحے سے ڈرو کہ وقت تم پر نامہربان ہو جائے اور اپنے انصاف کی تلوار تمہاری گردن پر چلا دے "

**بڑی پاشا** اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکی تھیں۔ بیٹے کی شادی ان کی زندگی کی اصل خوشی تھی، سو وہ پوری ہو چکی تھی ـــــ ان کا فرض پورا ہو چکا تھا اور بہو کو انھوں نے بیٹے کا نگراں بنا دیا تھا ـــــ اس طرح گھریلو زندگی کی پکڑ بھی انھوں نے ڈھیلی کر دی تھی۔ یوں بھی بہوئیں آجاتی ہیں تو ساسیں آپ ہی گدّی چھوڑ دیتی ہیں ـــــ سب کچھ دُلہن بیگم کے ہاتھوں میں آیا تو سب سے پہلے ہستی جو اُن کے

عتاب کا نشانہ بنی وہ شمع تھی۔ بڑی بیگم کا شمع سے جلنا، چڑنا، خفا رہنا اس لئے تھا کہ وہ اسے منحوس سمجھتی تھیں اور ہر مبارک کام سے اُسے دُور دُور رکھنا چاہتی تھیں۔ وہ دیوان کی بیٹی تھی، اور دیوان صاحب سرکار کے ایک اہم کارکن تھے۔ اس لئے بڑی پاشا اُسے نکالنے کی تو سوچ ہی نہیں سکتی تھیں۔ گالی گلوچ دے کر ہی تسلی کر لیتی تھیں۔ پھر ایک ڈر بیٹے کی آمد کے بعد پیدا ہوا تھا کہ اُسے کہیں بیوی کا درجہ نہ دیدے۔ سو وہ خدشہ بھی دُور ہوا —— اب دُلہن بیگم کے ہاتھوں میں جو باگ ڈور آئی تو ان کی نظر میں تو شمع ان کی زندگی کا کانٹا جیسی تھی —— دن رات کی وہ چخ پخ شروع کی کہ شمع کے لئے جینا مشکل ہو گیا۔ شمع پہلے ہمیشہ زنان خانے میں اور اپنی کوٹھری میں ہی رہتی تھی لیکن چھوٹے سرکار کی شادی اور دُلہن بیگم کی خوف ناک نگاہوں سے بچنے کے لئے اس نے اپنے بابا کی آغوش میں پناہ ڈھونڈھ لی تھی۔ وہ چادر اوڑھ کر مردانے میں ہوتی ہوئی بابا کے کمرے میں پہنچ جاتی۔ اور اکثر وہیں پڑی رہتی —— روتے روتے اکثر باپ سے پوچھتی:

"بابا مجھے بہت سارا روپیہ کیوں نہیں دیا آپ نے؟"

منصور احمد ترس بھری نگاہوں سے اسے دیکھتے، مگر کچھ بول نہ پاتے۔ چھوٹے سرکار کی ان کی بیٹی سے والہانہ محبت، مگر مجبوریوں کے آگے سر جھکا دینے کی بے بسی اُن پر ظاہر تھی —— مگر جس دھوم دھڑکے سے اکلوتے بیٹے کی شادی بڑی بیگم نے کی تھی۔ اس نے انہیں سر سے پاؤں تک ہلا کر رکھ دیا تھا —— ایسے امیر کبیر گھرانے میں ان کی بیٹی زبردستی قبول بھی کر لی جاتی تو کیا حشر ہوتا؟ اس کی کیا عزت ہوتی؟ وہ دِل کو یہی سمجھاتے —— "جو کچھ کرتا ہے خُدا کرتا ہے اور خُدا جو کچھ کرتا ہے اچھا ہی کرتا ہے۔" لیکن بیٹی پتہ نہیں کس انداز سے سوچتی تھی اور اب اس کے اس مطالبے میں بھی شدت آتی جا رہی تھی۔ پہلے وہ یہ پوچھا کرتی

تھی۔ بابا آپ نے مجھے سونے کے ڈھیر کیوں لاکر نہیں دیئے کہ میں اپنے دل کی خوشی خرید سکتی؟" اب وہ کہتی تھی بلکہ ضد کرتی تھی "بابا مجھے دولت چاہیئے —— بابا مجھے دولت چاہیئے —— بابا مجھے اتنی دولت چاہیئے کہ میں سونے چاندی کے ڈھیر میں ڈوب کر، دب کر رہ جاؤں۔"

بابا کا دل دکھ جاتا۔ سوچتے بچپن سے جوانی تک ہر ہر قدم پر ناکامیوں اور نامرادیوں کے داغ ہی بٹیا کو ملے۔ ایسے میں دنیا کی سب سے انمول اور عظیم خوشی ایک کنوارے مرد کی پہلی محبت اس نے پائی تو اس کے دل کی خوشی کا کیا ٹھکانا۔ لیکن افسوس کہ غربت نے وہ خوشی بھی چھین لی —— آج اگر اسی حسن، سلیقے اور تعلیم کے ساتھ دولت بھی ہوتی تو بڑی سرکار شمع کو رد کر دیتیں؟ شاید بٹیا کا مطالبہ بجا بھی ہے لیکن اب —— اب سب کچھ اجڑ جانے، لٹ جانے کے بعد اسے سونے چاندی کے ڈھیر مل بھی جائیں تو ان سے وہ کیا خرید سکے گی؟"

ان کے اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اور یہ سوال وہ بیٹی سے کر بھی نہ سکتے تھے "بیٹی جسے خریدنا چاہتی تھی، وہ بک گیا —— اب اگر تو قارون جیسی دولت بھی جمع کرلے تو کیا خریدے گی بٹیا!"

لیکن شمع کی وہ رٹ بدستور قائم تھی۔ ایک دن تو مرزا منصور احمد دہل اٹھے شمع محل سے ہو کر آئی تھی، پتہ نہیں وہاں دلہن بیگم سے کچھ بات ہو گئی تھی یا بڑی پاشا سے کہ اس کا رواں رواں سلگ رہا تھا۔

"بابا اگر میں امیر ہوتی یا اگر آپ دولت مند ہوتے تو مجھے یہ سب کچھ دیکھنا نہ پڑتا۔ اب تو سب کچھ کھو گیا بابا لیکن دل کی ابھی بھی یہی حسرت ہے کہ کاش میں پیسے والی ہوتی بابا" وہ سسک سسک کر رونے لگی۔

بابا نے اب تک زندگی میں جتنے ضبط اور صبر کا مظاہرہ کیا تھا، برداشت کی

جن حدوں تک وہ پہنچ سکے تھے، آج اس کی انتہا ہو گئی تھی۔

"میری بیٹی نے آج تک کوئی خوشی نہیں دیکھی، کوئی سکھ نہیں پایا۔ اب جب کہ اس کا سب کچھ ہی ختم ہو چکا ہے، وہ دولت کی خواہش کرتی ہے، تو میں اُسے کم سے کم یہ خواہش تو ضرور دوں گا، اور اسی کی بدولت دوں گا۔"

رات کی خاموشی میں اُنھوں نے اپنا سامانِ سفر تیار کیا اور اپنے محسن اور مالک بڑے سرکار کے نام ایک چٹھی چھوڑ کر روانہ ہو گئے:

میرے آقا ـــــ میرے محسن!

رات کے اندھیرے میں آپ سے مونھ موڑ کر جا رہا ہوں خدا کا شکر ہے کہ آپ سے کسی معاملے میں شرمندہ نہیں، کتنی ہی بار ایمان ڈگمگایا، کتنی ہی بار شیطان نے ورغلایا، لیکن آپ کی ایک پائی کو بھی میں نے ہاتھ نہیں لگایا۔ دس روپے ماہانہ اور سالانہ دو جوڑے اور پیٹ بھر کھانا، میرے اور میری بیٹی کے لئے زندگی کی معراج بنے رہے۔ میں آج بھی مطمئن ہوں۔ لیکن اب میں اپنی بٹیا کا دامن ہیرے موتیوں سے بھرنا چاہتا ہوں ـــــ آپ سے ملے بغیر رات کے اندھیرے میں جانے کی صرف ایک ہی وجہ ہے کہ آپ کے سامنے جاؤں گا تو آپ اپنے جاں نثار کو روک لیں گے۔ اب میں یہاں رہنا بھی نہیں چاہتا اور بھیک پر خوشیاں سمیٹنا بھی نہیں پسند کرتا ـــــ خدا گواہ ہے اور شاید اسی بات پر وہ مجھے بخش بھی دے کہ آپ کے ساتھ میں نے کوئی بے ایمانی نہیں کی ـــــ"

امراؤ جان کی محفل اپنے پورے شباب پر تھی۔ جب دروازے پر دستک ہوئی ـــــ

بڑے سے ہال کمرے میں سلیقے سے گدّوں پر مخملیں مسندیں بچھی ہوئی تھیں۔ چھتوں پر دیوار گیریوں کے ساتھ فانوس جگ مگ کر رہے تھے۔ معززینِ شہر اس در پر جبہ سائی کرتے تھے۔ ان کے قدموں کے لئے فرش گیریاں سرخ مخمل کی بچھائی گئی تھیں۔ ایک کونے میں ایک مخصوص گدیلے دار مسند پر امراؤ جان کی نشست تھی۔ چاندی کے پاندان اور اگالدان کے ساتھ ایک تجوری بھی تھی، جس میں رات بھر کی آمدنی محفوظ کی جاتی۔

اونچے اونچے سُروں، سازوں کے شور، ڈھولک کی تھاپ اور واہ واہ کے نعروں میں بھی دستک اتنی زور سے دی گئی تھی کہ امراؤ جان چونکی ہوگئیں ـــــ ہاتھ کا ایک اشارہ ہوا۔ ساز موقوف ہوئے اور امراؤ جان بذاتِ خود دروازے پر تھیں ـــــ موتی دار لڑیوں والا پردہ چھن چھنایا اور دروازہ پاٹوں پاٹ کھل گیا امرائے شہر بھی مڑ مڑ کر دیکھنے لگے۔

ایک باریش بزرگ جھکی ہوئی نگاہوں کے ساتھ کھڑے تھے۔ ساتھ میں چادر میں لپٹی ہوئی کوئی خاتون تھیں۔

امراؤ جان نے ایک لمحے کو بڑے غور سے اجنبی کی طرف دیکھا ـــــ پھر ان کی آنکھوں میں پرانی جان پہچان کی چمک پیدا ہوئی اور ہونٹ مسکرانے پر آمادہ ہوئے ـــــ

"آپ مرزا صاحب؟"

"جی بیگم صاحبہ؟" وہ مشکل سے آنکھیں اوپر کر سکے۔ "حیرت ہے اتنے برس بعد بھی آپ نے پہچان لیا۔ آپ کی ذہانت قابلِ قدر ہے؟"

امراؤ جان نے تجسس اور اشتیاق کے ساتھ پردہ دار خاتون کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "میرے لئے کوئی تحفہ؟"

مرزا صاحب نے جھجک کر جواب دیا "جی۔ جی ہاں۔"

"کون ہے؟"

"وہ بڑی تکلیف سے بول سکے "جی میری اکلوتی بیٹی ——"

"بیٹی؟ آپ کی بیٹی؟" امراؤ جان چیخنے کے سے انداز میں بولیں۔"مرزا صاحب یہ میں کیا سن رہی ہوں؟"

"آپ غلط نہیں سن رہی ہیں۔ بیگم صاحبہ" وہ نیچے دیکھتے ہوئے بولے۔

امراؤ جان نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا: "مرزا صاحب سر کو اونچا کیجئے اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیجئے —— کیا آپ یہاں اپنی خوشی سے آئے ہیں؟"

مرزا صاحب خاموش ہو گئے۔ امراؤ جان نے چادر کھینچ لی —— اور جیسے سیاہ ابر میں سے چودھویں کا زرد چاند طلوع ہو گیا، سرتاپا نور کا بدن —— آنکھیں جھکی جھکی سی —— ہونٹ کپکپاتے ہوئے —— کالے کالے بالوں کا ہالہ چہرے کے گرد نور میں اضافہ کئے ہوئے —— دونوں ہاتھوں سے اپنا بدن چھپائے ہوئے۔

امراؤ جان نے پیچھے پلٹ کر تیزی سے معززین سے کہا۔ "یہاں ایک پردہ دار دوشیزہ کھڑی ہے براہِ کرم اپنی نگاہیں سمیٹ لیجئے۔"

پھر وہ مرزا صاحب سے مخاطب ہو گئیں۔" مرزا صاحب —— اس دہلیز پر خدا گواہ ہے جسموں کے سودے ہوتے ہیں، ایمانوں کے نہیں۔ بتائیے آپ کو کس مجبوری نے اس دروازے پر لا کھڑا کیا ہے؟"

مرزا صاحب لڑکھڑاتی زبان سے بولے "کوئی مجبوری نہیں ——"

اُمراؤ جان نے اپنے بال ہاتھ میں جھُلا کر کہا۔ "جانے کتنے ماہ و سال کی کڑی شدّت کو ان بالوں نے محسوس کیا ہوگا، تب کہیں جا کر اپنے رنگ کو کھویا ہے —— میں آج سے بیس برس پہلے کی وہ رات اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہی ہوں کہ آپ محمد ضیاء الدین کو سہارا دے کر میرے کوٹھے پر لائے ہیں۔ آپ کے بُشرے سے ان کے لئے رحم ظاہر ہو رہا ہے اور میرے لئے نفرت اور کراہیت پھر رات بھیگ گئی ہے۔ آپ نے دالان کے پرلے کونے میں اپنے ساتھ لایا ہوا مصلّے بچھا کر عشاء کی نماز پڑھنی شروع کی ہے —— نماز اور طوائف کے کوٹھے پر! مرزا صاحب شرافت اگر دولت سے خریدی جانے والی شے ہوتی تو آج سارے رئیس شریف بھی نظر آتے۔ لیکن یہ دولت، شرافت کی یہ دولت خُدا داد ہوتی ہے اور آپ کی دولت آج تک کوئی ڈاکو نہیں لُوٹ سکا ہے۔"

مرزا صاحب نے گھبرا کر انہیں دیکھا تو وہ نرمی سے بول رہی تھیں!

"مجھے پتہ ہے آپ کو اس دروازے تک آپ کے قدم لائے ہیں، صرف قدم، دِل نہیں۔ بتلایئے یہ قدم ادھر کیوں آئے —— کیوں کہ مجھے پتہ ہے کہ جو سر طوائف کے کوٹھے میں بھی خُدا کے حضُور جھُک جاتا ہے اتنا سر بلند ضرور ہوتا ہے کہ چٹّان کو بھی ٹھوکر مار سکے۔"

مرزا صاحب نے بے بسی سے کہا "مجھے دولت کی ضرورت ہے۔ مجھے پتہ تھا آپ بٹائی پر لڑکیوں کے مجرے کراتی ہیں۔ پانچ سو روپے فی رات بھی آپ طے کرالیں تو ڈھائی سو روپے روز کی آمدنی تھی۔"

اُمراؤ جان نے نفرت سے مرزا صاحب کو گھُورا۔ نیچے پڑی چادر اٹھا کر پھر شمع کے جسم پر ڈالتے ہوئے بولیں۔ "یہ لڑکی —— سیپی میں بند اس پاکیزہ موتی کی

طرح ہے جس پر ابھی تک سورج کی کرنیں بھی نہیں پڑی ہیں۔ آپ سمجھتے ہیں میں اس پر انسانوں کی حریص اور ناپاک نگاہیں پڑنے دوں گی؟ مرزا صاحب جسموں کا کاروبار تو زندگی بھر سے کرتی آ رہی ہوں، آج مجھے ایمان کی دولت خرید لینے دیجئے ـــــ بیٹی آؤ میرے ساتھ ـــــ" انہوں نے اس کے چہرے پر چادر برابر کی اور اسے برابر کے دالان میں لے کر چلی گئیں ـــــ "مجرا جاری رہے۔" جاتے جاتے انہوں نے آواز دی۔

ایک کمرے سے دوسرے میں، دوسرے سے تیسرے میں، تیسرے سے چوتھے میں پہنچیں، تب کہیں جا کر ان کی تسلی ہوئی۔

"بیٹی ـــــ اس کمرے تک گانے بجانے کی آواز نہیں آئے گی تم یہیں رہا کرو ـــــ اور سنو ادھر کے کمرے کی طرف رخ نہ کرنا۔ شریف بیبیاں ایسی جگہوں پر نظر بھی نہیں ڈالتیں۔"

شمع کی ہچکی بندھ گئی۔ وہ اس کے قریب آئیں "روتی ہو؟ پگلی مصیبتیں کس پر نہیں پڑتیں؟ ہنسی ہمیشہ آنسوؤں کی پالکی میں سوار ہو کر آتی ہے۔ ہنسنے کے لئے پہلے رونا بھی پڑتا ہے۔ خدا تمہاری مصیبتیں ضرور ٹال دے گا۔ اپنے باپ کو دیکھو، تمہاری وجہ سے وہ کتنی بری طرح دکھی ہیں . . . ." وہ اس کے آنسو پونچھنے لگیں تو گھبرا کر بولیں "ارے تمہیں تو سخت بخار ہے بیٹی۔"

اب ضبط کے سارے بندھ ٹوٹ گئے تھے ـــــ وہ ان سے چمٹ گئی۔

"امی ـــــ میری اچھی امی! میری محبت والی امی!"

"امی۔" امراؤ جان لرز گئیں ـــــ امی ـــــ ماں تو محبت کرنے والی وہ عظیم ہستی ہوتی ہے بٹیا کہ اس کی محبت ہی اس کی عظمت کا باعث ہو جاتی ہے۔ اس کے پیار کی ایک نگاہ، اس کی خدمت ہی اسے جنت کا اہل بنا دیتی ہے۔ میں بڑی

گُناہ گار ہستی ہُوں بٹیا۔ مَیں تو اپنا دامن کتنا بھی جھٹکوں، وہ گُناہ آلودہ ہی رہے گا —
تُم کیوں مجھے ماں جیسا مقدّس خطاب دے کر مجھے جنّت سونپ رہی ہو — میں
دوزخی اس لائق نہیں بیٹی — مجھے اتنا اونچا نہ اُٹھاؤ بیٹی ... ...“ لمبے
لمبے آنسو ان کی آنکھوں سے بہنے لگے۔

”دو مہینے ہو گئے مرزا صاحب۔ بٹیا کی حالت میں ذرا بھی سُدھار نہیں۔
کاش آپ پہلے ہی مجھ سے مِل لئے ہوتے — میں اپنی جان لُٹا دیتی لیکن شمع کی شادی
آفتاب سے کرا کے چھوڑتی۔“

مرزا صاحب سَر جُھکائے بیٹھے رہے ”مجھے نہیں پتہ تھا بیگم صاحبہ کہ دَیر کی
تلاش میں نکلا تھا۔ مگر مجھے کعبہ مِل جائے ... ...“

اُمراؤ جان نے اپنا ہاتھ ان کے مُونہہ پر رکھ دیا ”خُدا کے لئے اس کے
آگے کچھ نہ کہئے۔ اس سے آگے کچھ نہیں۔“

مرزا صاحب بے بسی سے بولے ”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا بیگم صاحبہ۔
مَیں کِس طرح شمع کے چہرے پر ہنسی لاؤں۔“

”دُکھوں کے بیج بو کر ہم آنسوؤں کی فصل ہی اُگا سکتے ہیں، مرزا صاحب،
اس بے چاری بچّی نے ایسا عظیم غم دِل میں پالا ہے کہ ہنسی چھوڑ مُسکراہٹ بھی نہیں
آسکتی —“ پھر وہ پریشانی سے بولیں: ”دو مہینے نِکل گئے — اب اور کچھ
دن دیکھ لوُں — پھر حکیم صاحب کا علاج چھوڑ کر مَیں کسی قابل ڈاکٹر سے رجُوع
کروُں گی۔“

اس عرصے میں اُمراؤ جان اور مرزا صاحب کو ایک عجیب و غریب پریشانی

سے دوچار ہونا پڑ رہا تھا ——— جمع کو روپیہ جوڑنے کی کچھ ہوس سی ہو گئی تھی ———
اُمراؤ جان موسمبی لانے کے لئے نوکر کو پیسے دیتیں تو وہ عجیب سی لجاجت سے پوچھتی
"امی ——— موسمبی کتنے پیسوں میں آجائے گی ؟"
"یہی کوئی ڈیڑھ دو روپے میں"
"تو امی وہ پیسے مجھے دے دیجئے نا ——— موسمبی کھا کر کیا فائدہ ۔ میں اچھی ہونے سے تو رہی"
امراؤ جان آنسو پونچھتے ہوئے پیسے اس کے حوالے کر دیتیں اور چپکے سے دوسرے پیسوں سے موسمبی منگوا کر رکھ لیتیں ۔
باپ دوا لانے کے لئے باہر جاتے دکھائی دیتے تو کہتی "بابا وہ پیسے میرے پاس جمع کرا دیجئے نا ۔ دوا کھا کر میں اچھی تو ہونے والی ہوں نہیں"
اس کے تکئے کے نیچے رفتہ رفتہ نوٹوں، اٹھنیوں، چونیوں کا ڈھیر سا لگ گیا ——— اُمراؤ جان نے پلنگ کے برابر میں ایک میز لگوا کر اس پر ایک چھوٹی سی خوب صورت تجوری رکھوا دی، اور اس سے کہا "لو بیٹی، اب اس میں پیسے جمع کرتی رہنا ۔ تکئے کے نیچے رکھنے سے تمہاری نیند میں خلل پڑے گا"
"نیند تو آتی ہی نہیں امی، پھر خلل کاہے میں پڑے گا ؟" وہ دکھی لہجے میں بولی ———
ایک دن اُمراؤ جان اس کے جسم کا ناپ لینے لگیں تو وہ حیرت سے بولی :
"ناپ کس لئے ؟"
"میں اپنی بٹیا کے لئے کپڑے جو سلوا رہی ہوں ———"
"امی ——— وہ پیسے آپ مجھے دیدیجئے نا ۔ میں اپنی تجوری میں رکھ دوں گی"
اپنے دل کے درد کو چھپا کر اُمراؤ جان بولیں "اگر میں تمہاری تجوری کو ہی

موہنہ تک بھر دُوں تو ؟"

"تو پھر مَیں آپ سے دوسری تجوری مانگ لوں گی اور پھر اسے بھی موہنہ تک بھروں گی ۔"

"مرزا صاحب ——" اس رات اُمراؤ جان نے پریشانی سے کہا "مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ بٹیا کا دماغ جگہ سے بے جگہ ہو رہا ہے —— اب مَیں ڈاکٹر کا ہی علاج شروع کرا دوں گی —— شہر میں ایک نئے ڈاکٹر آئے ہیں ۔ کچھ سَر پھرے ہیں ، صرف غریبوں کا ہی علاج کرتے ہیں —— مفت ۔ خُدا نے ہمیں دو چار پیسے سے خوش رکھا ہے —— ممکن ہے نہ آئیں ، اس لئے مَیں غریبانہ لباس پہن کر جاؤں گی ۔ سُنا ہے کہ اتنے قابل ہیں کہ لوگ مسیحا کہتے ہیں —— خُدا کرے کہ اُن کی دوا بٹیا کو لگ جائے اور اسے شفا ہو جائے ۔

مریضہ کے کمرے میں ڈاکٹر آفتاب داخل ہوئے تو دونوں ایک ٹک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے —— دواؤں کا بکس کب ان کے ہاتھ سے چھُوٹ کر گرا کب کِس نے انہیں کرُسی پر پکڑ کر بٹھایا ۔ کب ان کے موہنہ پر پانی کے چھپکے مارے گئے ، انہیں کچھ پتہ ہی نہ چلا ۔

مرزا صاحب اُمراؤ جان کو باہر لے کر چلے گئے ۔

"قسمت کی خوبی یا خرابی دیکھئے بیگم صاحبہ ، جس سے بچنے کے لئے بٹیا کو لئے یہاں وہاں بھاگا بھاگا پھر رہا تھا ، وہی بادل یہاں بھی بھگونے آ موجود ہوا ——"

"ہر کام میں خُدا کی مصلحت ہوتی ہے ۔ آپ اس وقت دخل نہ دیجئے ۔ اور مدتوں کے بچھڑوں کو کم سے کم جی بھر کر رو تو لینے دیجئے ۔"

شمع تو ایسے ایسے حادثے دِل پر جھیل چکی تھی کہ برداشت کی عادی سی ہو گئی تھی ـــــــ چھوٹے سرکار کو دیکھ کر وہ حیرت زدہ ضرور ہوئی لیکن حواس سے بیگانہ نہیں۔ کتنا وقت یوں ہی بیت گیا۔ پھر وہ دھیرے سے اُٹھے، اور کُرسی چھوڑ کر اس کے چھپر کھٹ کی پٹّی سے لگ کر بیٹھ گئے

"تمہیں یوں مجھے اکیلا چھوڑ کر آتے دُکھ نہیں ہوا شمع؟ کتنی ظالم ہو تُم؟"

وہ مُسکرا کر بولی "اکیلا؟ آپ اکیلے ہیں؟"

ایک غم کا سایہ اِن کے چہرے سے ہو کر گزر گیا ـــــــ "بعض لوگ اس دُنیا میں اکیلے ہی جیتے ہیں اور اکیلے ہی مر جاتے ہیں۔"

"لیکن آپ بمبئی کیسے تشریف لے آئے؟" شمع نے موضوع بدل کر کہا۔

"تمہارے اور بابا کے جانے کے دوسرے ہی دن میں ابّا جان سے پچاس ہزار روپے لے کر بمبئی چلا آیا ـــ یہاں ایک ڈسپنسری کھول لی، اور اپنے غم کو دوسروں کو صحت بانٹ کر ہلکا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ خُدا کا شُکر ہے کہ پریکٹس چل نکلی۔ یہ بھی مالک کا کرم ہی ہے کہ جسے بھی دَوا دیتا ہوں صحت مند ہو جاتا ہے، بس اپنے ہی دُکھوں کا علاج نہیں کر سکا۔" آنسو ان کی آنکھوں میں چمکنے لگے۔

"آپ کو مجھے ایسے ماحول میں دیکھ کر حیرت نہیں ہوئی؟"

چھوٹے سرکار کچھ نہیں بولے، بس اُسے دیکھے گئے۔

"اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ میں ایک طوائف بن گئی ہوں، مجرے دِکھا کر پیسہ کھینچنے والی، جسم بیچ کر طرح طرح کی بیماریاں مول لینے والی تو ـــــــ تو آپ مجھ سے نفرت کرنے لگیں گے؟"

"نہیں ـــــــ کبھی نہیں۔" بڑے عزم کے ساتھ چھوٹے سرکار نے جواب دیا۔ "گُناہ کرنے والوں کے چہرے اتنے معصوم نہیں ہوتے۔"

شمع تکیے میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ "آپ یہاں کیوں آ گئے ——— کیوں آ گئے ہیں آپ میرا صبر لوٹنے کے لئے۔ میری عاقبت خراب کرنے کے لئے، آئندہ سے آپ یہاں کبھی نہ آیئے گا ——— کبھی نہیں؟"

"نہیں آؤں گا ——— لیکن کیا آپ ہمیں اپنے دِل سے کبھی نکال سکیں گی؟" وہ دُکھ کے ساتھ بولے۔

وہی ——— بالکل وہی ——— ذرا بھی تو نہیں بدلے تھے وہ، وہی چہرہ مُہرہ، وہی کبھی 'ہم'، کبھی 'میں'، کہہ کر بات کرنے کا دل موہ لینے والا انداز، ہائے اس دِل کو کیسے اپنے سینے سے نکال سکتی ہوں میں ——— اس نے تڑپ کر سوچا۔

چھوٹے سرکار چلنے کو ہوئے تو وہ بڑی آس کے ساتھ بولی "اب کب آئیں گے آپ؟"

"کل" وہ جاتے جاتے بولے "شام کو۔"

"یہ بھی بتاتے جایئے کہ کل کی شام کتنی صدیوں بعد آئے گی؟"

ایکس رے کی رپورٹ دیکھ کر چھوٹے سرکار سر پکڑ کر بیٹھ گئے ——— شام کو وہ اُمراؤ جان کے گھر آئے تو بابا کو الگ لے جا کر بولے "بابا، غور سے سوچ کر بتایئے گا، آپ کی بیگم صاحبہ کو کبھی دق کی شکایت رہی تھی؟"

بابا نے اپنا تجربہ کار سر اُوپر اُٹھایا اور بولے:

"بٹیا میری بیٹی کو ورثے میں کیا کیا ملا ہے، اس کی تفصیل مجھ سے کیا پوچھتے ہو ——— بہرحال اتنا یقین دلا دوں، کم از کم یہ تحفہ ورثے میں نہیں ملا ہے، یہ شیش محل کے مکینوں کی دین ہے۔"

چھوٹے سرکار ندامت سے سنتے رہے ——— اور بٹیا یہ بھی میں تمہیں بتا دوں کہ اسے دِق ہو گئی ہے، اور آج کل سے نہیں، جب سے اُس نے اپنے سینے

میں تمہاری محبت کا روگ پالا ہے تب ہی سے۔ میں باپ تھا، ماں نہیں جو اولاد کا غم بانٹ لیتی ہے، لیکن پھر بھی آنسوؤں کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے جو باپ ہو یا ماں، سب سے گفتگو کر سکتی ہے —— اور آخری بات یہ بھی بتا دوں کہ تمہاری دوائیں اب بٹیا پر کوئی اثر نہیں کر سکیں گی —— وہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو چکی ہے۔ آدھا راستہ طے بھی ہو چکا ہے۔۔۔۔۔۔"

"نہیں بابا نہیں ——" چھوٹے سرکار چلائے :" ایسی بات موںہہ سے نہ نکالئے بابا۔ میں اپنے فن کا آخری لمحہ بھی اس کی بھینٹ پڑھا دوں گا۔ اور اسے بچا لوں گا۔"

" اور بچا کر کیا کرو گے؟" بابا نے دُکھی لہجے میں پوچھا " مزید غم جھیلنے کے لئے اسے اچھا کرو گے؟ تمہاری تو شادی ہو چکی ہے —— وہ اب کسی اور سے شادی کرے گی نہیں۔ پھر ایسی زندگی کا فائدہ ؟" اور وہ آستین میں موںہہ چھپا کر رونے لگے۔

کچھ دن اور گزرے۔

چھوٹے سرکار نے جب اُمراؤ جان سے شمع کو سینی ٹوریم میں لے جانے کی اجازت چاہی تو وہ بولیں "شمع اگر چاہتی ہے تو شوق سے لے جاؤ۔ میں صرف اس کی خوشی چاہتی ہوں ——"

" شمع میں تمہیں ایک بہت اچھے ہاسپٹل میں رکھ کر تمہارا علاج کرانا چاہتا ہوں ——" انہوں نے جان بوجھ کر سینی ٹوریم نہیں کہا۔

"ڈاکٹر صاحب، ہاسپٹل کا خرچ کیا آئے گا؟" پھر کچھ رُک کر خود ہی بولی —— " میں اچھی ہونے سے تو رہی، آپ وہی پیسے مجھے دیدیجئے نا —— میں جمع کروں گی۔"

چھوٹے سرکار کا دل اندر ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گیا —— ماحول بڑی دیر تک سناٹوں کا شکار رہا —— پھر وہ اُمراؤ جان کی طرف مُڑ کر بولی " امّی میں آپ سے ایک درخواست ابھی سے کرتی ہوں مجھے کفن بھی سستے، ہلکے کپڑے کا دیجئے گا۔ اور جو پیسہ بچے وہ میری تجوری میں رکھ دیجئے گا۔"

اُمراؤ جان، مرزا صاحب، ڈاکٹر صاحب سب ایک دوسرے سے آنکھیں بچا کر اپنی آنکھیں خشک کر رہے تھے۔

"پاگل نہ بنو شمع۔" چھوٹے سرکار بناوٹی خفگی سے بولے "علاج شروع کرو —— تم جلد ہی اچھے ہو جائیں گے۔"

"اچھی ہو کر کروں گی کیا؟" اس نے کرب ناک انداز میں پوچھا۔

ڈاکٹر آفتاب روتے ہوئے باہر نکل گئے۔

"آپ نے مجھے بتایا نہیں ڈاکٹر صاحب آپ اس طرح محل سے چلے آئے تو ابا حضور اور بڑی پاشا سلامت پر کیا گزری۔"

"میں ان سے یہ کہہ کر تو نہیں آیا تھا کہ کہاں جا رہا ہوں۔ بعد میں جان پہچان والوں سے پتہ چل گیا۔"

"پاشا سلامت کے خط تو آتے ہوں گے۔"

"ہاں ——" انہوں نے ہاں، کو کھینچتے ہوئے بے پروائی سے کہا: "کل بھی آیا ہے۔ مجھے بُلائے ہیں —— یہ دیکھو۔" انہوں نے خط اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا —— بڑی محبت اور خوشی سے انہوں نے لکھا تھا۔

میرے پیارے بچے —— خدا تم کو بہت ساری خوشیاں بتائے —— تم گئے جب سے کوئی خط نہیں لکھے، ماں باپ کو

بھول گئے کیا بیٹا؟ تمہارے جانے سے محل سُونا دِکھتا۔ بڑے
سرکار بھی محل کے اندر نہیں آتے، اُس سے اور بھی اِتا بڑا
محل اُجاڑ دِکھتا۔ تم کو یہ سُن کر خوشی ہوگی کہ دُلہن بیگم کو پانچواں
مہینہ چل رہا ہے —— ایک آدھ چکر ضرور لگاؤ بیٹا ——
زچگی کے بعد دُلہن بیگم کو سمدھن بول رہے تھے کہ بمبئی کو
بھجوا دیں گے۔"

خط پڑھ کر اس نے تکئے کے پاس ڈال دیا —— "مُبارک ہو ——" اس
نے کمزور سی آواز میں کہا۔

بڑی دیر بعد چھوٹے سرکار بولے۔" شمع، تم مجھے ایک جھوٹا آدمی
سمجھتے ہو یا سچا؟"

"سچا۔" وہ ایمان داری سے بولی۔

"تو آج میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں آج تک شہزادی پاشا کی اُنگلی تک
نہیں چھوا۔"

"جی ——" شمع حیرت کے مارے تکئے سے ذرا اُونچی ہو گئی۔"پھر
یہ بچہ ؟"

"جب مجھ پر خوشیوں کے دروازے بند کر دئے گئے، اور زبردستی
شادی کر دی گئی تو میں نے طے کر لیا کہ زندگی میں تمہیں ملے تو ہر عورت میرے لئے
حرام ہے۔ اور خُدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں آج بھی اپنے عہد پر قائم ہوں۔"

"نہیں —— نہیں —— نہیں۔" وہ سر پٹخ پٹخ کر چلائی۔ "آپ کو
برباد کرنے والی میں ہوں —— صرف میں۔ خُدا مجھے کبھی معاف نہ کرے۔"

"پاگل نہ بنو شمع —— تم کچھ نہیں کئے۔ قسمت میں جو لکھا تھا وہی ہُوا۔

اپنے آپ کو ہلکان نہ کرو، ورنہ اور بھی صحت خراب ہو جائے گی۔
مگر شمع کے آنسو رُکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

ڈاکٹر آفتاب نے اپنی ڈسپنسری کے اوقات بدل دئے ـــــ پہلے وہ صبح دس سے ایک بجے تک اور شام کو پانچ بجے سے رات کے دس بجے تک کام کرتے تھے۔ لیکن اب انہوں نے صبح کے آٹھ سے دوپہر کے دو بجے تک کی بس ایک ہی شفٹ کر دی تھی۔ باقی سارا وقت وہ شمع کے پاس گزارتے۔ ایک بار انہوں نے بابا سے اجازت چاہی تھی کہ شمع کو اپنے گھر لے جائیں۔ سمندر کے کنارے کھلی ہوا بھی رہے گی تو شاید وہ نسبتاً جلد صحت مند ہو جائے۔ مگر بابا نے کہا تھا "بٹیا، بیگم صاحبہ نے جو کچھ کیا وہ صرف خدا ہی جانتا ہے۔ وہ شمع کو اتنا چاہنے لگی ہیں کہ اس کی دوری برداشت نہیں کر سکیں گی ـــــ کیا تم یقین کرو گے کہ صرف اس لئے کہ بٹیا کی بیماری شور و غل سے بڑھے گی۔ انہوں نے رات کی محفلیں تک برخاست کر دی ہیں؟؟"

چھوٹے سرکار پھر کچھ نہ بول سکے۔ مگر وہ یہ دیکھ دیکھ کر ہی کڑھتے تھے کہ شمع اندر ہی اندر گھلی جا رہی تھی۔ ایک رات اس کا بخار اتنا تیز ہو گیا کہ بے سُدھ ہو گئی، ذرا سُدھ آئی تو کھانسی کا ایسا شدید دورہ پڑا کہ سانس اُلٹ گیا، اور ساتھ ہی سفید چادر پر خون کی قے ہو گئی ـــــ اُمراؤ جان، مرزا صاحب، چھوٹے سرکار تصویرِ غم بنے دیکھتے رہے ـــــ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ شمع نہ دوا کرنے دیتی نہ انجکشن لگانے دیتی، نہ پھل کھاتی، بس ایک ہی رٹ تھی، انجکشن کتنے پیسوں میں آتا ہے ڈاکٹر صاحب؟ چار روپے چھ آنے میں؟ میرے اللہ اتنی بڑی رقم! لائیے وہ روپے مجھے دیدیجئے، میں اچھی ہونے سے تو رہی۔"

چھوٹے سرکار اس کے ہاتھ پر پیسے رکھ دیتے اور کہتے "اچھا اب تم نے

پیسے تو لے لئے نا —— اب ہم دوسرے پیسوں سے انجکشن لاتے ہیں تب تو انجکشن لگا لیں گے نا تم ؟"

وہ نحیف سی مسکراہٹ سے جواب دیتی —— "لایئے وہ پیسے بھی دے دیجئے —— مرنے والوں کا علاج ہی کیا ——"

ڈاکٹر صاحب کا دل رو اٹھتا ——

اس دن بابا چھوٹے سرکار سے اپنے پرانے دنوں کی پوری داستان سنا رہے تھے —— "بیٹا آپ سے کیا بتائیں وہ کیا تھیں اور ہمارے لئے کیا بن گئیں —— ہمارے پرانے مالک محمد ضیاء الدین ایک بار اپنے کاروبار کے سلسلے میں دہلی سے بمبئی تشریف لائے تھے۔ ساتھ میں ہم بھی تھے کسی نے امیر جان کا پتہ دیا، ہمارے مالک شوقین تو تھے ہی، پہنچ گئے۔ امیر جان نے غزلیں سنائیں —— بڑی شائستہ گفتگو کی۔ سیٹھ صاحب نے کہا "آپ عادات و اطوار میں مرزا رسوا کی امراؤ جان سے ملتی ہے، آج سے ہم نے آپ کا نام بدل کر امیر جان سے امراؤ جان کر دیا ——" پھر تو بمبئی بھر میں وہ مشہور ہو گئیں کہ پوچھئے نہیں —— سارا زمانہ قدموں میں سر جھکاتا تھا اور یہ ہر ایک کو ٹھکراتی تھیں —— ہمارے سیٹھ صاحب ان کے پیچھے کنگال ہو گئے، سننے میں آیا تھا کہ پائی پائی کو محتاج ہو گئے۔ سب امراؤ جان کو "کھائی" کہتے تھے، جسے کتنا ہی بھرو، بھرتی ہی نہیں۔ پھر عمر ڈھلی تو جوان لڑکیاں نچانی شروع کر دیں، ٹائی پر جسموں کا کاروبار کیا، اور خدا کی شان دیکھئے کہ اسی لالچی عورت نے جس نے ایک بار ہمیں اپنے کوٹھے پر نماز پڑھتے دیکھ لیا تھا، ہماری بیٹی کی خاطر کہ اس کے آرام میں خلل نہ پڑے اپنا کاروبار ہی موقوف کر دیا۔ عورت ایسی بھی عظیم ہو سکتی ہے بیٹے ......"

مگر چھوٹے سرکار کو اچانک اپنی امی جان یاد آگئیں ـــــ انہوں نے تلخی سے دِل ہی دِل میں انہیں یاد کیا ـــــ امی جان نے کیسے ارمان بھرے دو جوان دلوں کو آگ لگائی ہے ۔ انہیں شمع پر ترس بھی آیا، اور فخر بھی محسوس ہوا ۔ امی جان کے ہاتھوں دُکھ اُٹھا کر آج بھی اس کے مونہہ سے کوئی بُرا کلمہ ان کے لئے نہیں نکلتا ۔

سامنے سے حواس باختہ اُمراؤ جان چلی آ رہی تھیں ۔" بٹیا ذرا جلدی سے چل کر شمع کو دیکھ لیجئے ـــــ پتہ نہیں کیا ہونے والا ہے " وہ آنسو پی کر بات کر رہی تھیں ۔

" مرزا صاحب اور چھوٹے سرکار جلدی سے دوڑے ۔ شمع کو کھانسی کا دورہ پڑا تھا ۔ خون کی چھینٹیں یہاں وہاں بکھری پڑی تھیں ۔

" خُدا کے لئے شمع میری بات مانو ـــــ انجکشن لگوا لو ـــــ" ڈاکٹر آفتاب ہاتھ جوڑ کر بولے ۔

شمع نے ہاتھ سے انہیں ٹھہرو کا اشارہ کیا ۔ ذرا دم برابر ہوا تو بولی :

" مرنے والے کو اپنی موت کا پتہ چل جاتا ہے ـــــ یہ بات آپ میں سے کوئی نہیں جان سکتا ۔ یہ صرف مَیں جان سکتی ہوں ۔ کیوں کہ موت کو مَیں خود سے لمحہ بہ لمحہ قریب تر محسوس کرتی ہوں ـــــ مَیں علاج کیوں نہیں کرواتی ۔ ؟ جب قسمت میں جینا ہی نہیں تو پیسہ کیوں ضائع کیا جائے ـــــ اور بابا آپ مجھ سے ہمیشہ پُوچھتے تھے نا کہ مَیں " پیسہ پیسہ " کیوں کرتی رہتی ہوں ۔ بابا مَیں یہ چاہتی تھی کہ خُوب ساری دولت جمع کر لوں اور کسی بھی ایک غریب لڑکی کے لئے چھوڑ جاؤں تاکہ وہ اپنے چاہنے والے سے، اپنے محبت کرنے والے دُور نہ کی جا سکے ـــــ کم سے کم میری روح کو تو یہ خوشی ملے کہ دُنیا میں کوئی

ایک تو غریب لڑکی اس پیسے کی وجہ سے اپنے محبوب سے مل سکی ۔۔۔۔۔۔
امی آپ کسی ایسی لڑکی کو ضرور ڈھونڈھ نکالئے گا ۔ اس کے موتھہ پر شرم و حیا اور رسم و رواج کے تالے پڑے ہوں گے ـــــ لیکن آپ اپنائیت سے اس سے پوچھئے گا ـــــ جب وہ اپنے دِل کے بھید آپ کے آگے کھول دے تو اس سے کہئے گا کہ تمھاری ہی طرح کی تمہاری ایک غریب بہن تھی جن نے پائی پائی کر کے یہ دولت جوڑی ہے کہ تم دُنیا میں خوشی خوشی زندگی بسر کر سکو ۔۔۔۔۔۔"

اُتھل پُتھل سانسوں نے اسے خاموش کر دیا ۔ اور وہ تھک کر چپ رہ گئی ـــــ کوئی بھی کچھ نہیں بول پا رہا تھا ۔ چھوٹے سرکار آسمانوں سے پرے پتہ نہیں کدھر دیکھ رہے تھے ۔

پھر وہ دھیرے سے اُٹھے ، دوسرے کمرے میں جا کر انہوں نے اپنا دواؤں والا بکس کھولا ۔ ایک سرنج میں ایک سیال دوا بھری اور اپنے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں انجکشن لگا لیا ۔

دھیرے دھیرے چلتے ہوئے چھوٹے سرکار پھر شمع کے کمرے میں آئے اور اس کے پائنتی بیٹھ کر آہستہ سے بولے :

" شمع میں نے تم سے کبھی وعدہ کیا تھا کہ کبھی اس مقدس جسم کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا ـــــ ایک بار ہاں لگایا تھا ، صرف نبض دیکھنے کے لئے ـــــ خُدا گواہ ہے آج بھی اپنے عہد پر قائم ہوں ۔ لیکن ابا حضور ایک بار کہے تھے کہ خدا جوانی کے گناہ بخش دیتا ہے ۔ سو آج خُدا سے رحم اور بخشش کی دُعا کرتے ہوئے

ان قدموں کو ہاتھ لگاتا ہوں۔ ان پیروں کو ہاتھوں میں لے کر زندگی سے وداع لیتا ہوں ـــــ شمع میری شمع . . . . . . "

زندگی نے آگے کچھ کہنے کی مہلت نہ دی اور وہ شمع کے قدموں کو تھامے تھامے ڈھیر ہو گئے۔

شمع انہیں یوں گرتے دیکھ کر کمزوری کے باوجود اٹھانے کے لئے خود اُٹھی، لیکن صرف ان کے ہاتھ ہی تھام سکی تھی کہ خود بھی لڑکھڑا کر گر پڑی۔ صرف دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھوں میں جکڑے رہ گئے۔

---

# ہنسی کہاں پہ کھو گئی

خدا اور رنڈی کے گھر کے دروازے ہر کسی کے لئے کھُلے ہوتے ہیں۔ خدا کے گھر میں کوئی بھی داخل ہو جائے وہ کسی کو نہیں دھتکارتا ــــــ،

رنڈی بے چاری کی آغوش بھی ہر ایک کے لئے کھُلی ہوتی ہے۔

لیکن خدا کے گھر میں داخل ہونے کے لئے مرد عورت، بچہ بوڑھے کی کوئی تخصیص نہیں ــــــ

اور ظاہر ہے رنڈی کے پاس جانے کے لئے مرد ہونا لازمی ہے ــــــ

بھلا عورت، بچوں اور بوڑھوں کا ایک رنڈی کے پاس کیا کام؟

اور سارا جھگڑا تو یہی تھا کہ میں جو ایک عورت تھی، یعنی کہ عورت ہوں، مجھے ایک رنڈی کے ہاں جانے کی سخت ضرورت آن پڑی تھی۔

لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیسے اور کس بہانہ سے جاؤں؟

ویسے یہ بات قطعاً نہ تھی کہ مجھے کوئی رنڈی میسر نہ تھی۔ بمبئی جیسی بستی، یہاں

پیشہ ور عورت کی بھلا کون کمی ـــــ؟ ایک ڈھونڈو ہزار مِل جائیں ـــــ!

میرے گھر کے آس پاس ہی کتنی عورتیں کھُلے بندوں بھی، اور چوری چھپاری سے بھی، یہ دھندہ چلاتی تھیں، لیکن بہانہ ؟؟

مَیں کیا بہانہ ڈھونڈتی ؟

اپنے میاں سے مَیں نے ذکر کیا کہ مَیں کسی رنڈی سے ملنا چاہتی ہوں۔ تو وہ دیدے پھاڑ کر چلّائے۔

"تُم ... ... تُم کسی پیشہ ور عورت کے گھر جاؤ گی ؟"

"کیوں، اس میں اتنا چیخنے چلّانے کی اور حیرت کرنے کی کون بات ہے کیا وہ انسان نہیں ہوتیں ؟"

"ارے ہوتی ہیں بابا ... ... لیکن شریف عورتیں ایسی جگہوں پر جانے کے بارے میں سوچتی بھی نہیں ہیں، اگر کسی نے دیکھ لیا تو ؟"

"دیکھ لے گا تو میرا کیا بگاڑ لے گا۔ اور مَیں کون سے ایسے جنسی تقاضوں سے مجبور ہو کر جا رہی ہوں ... ... مجھے تو بس ایک اسکیچ بنانا ہے۔"

"اسکیچ ـــــ ؟!"

وہ جھلّائے ـــــ "اور اگر اسکیچ بنانا ہی ہے تو وہ ایک رنڈی کا ہی کیوں! وہ تو کسی کا بھی بنایا جا سکتا ہے۔"

"ارے بھئی آپ نہیں سمجھیں گے۔ وہ جو فنِ مصوری کا آل انڈیا مقابلہ ہو رہا ہے کہ نہیں اس کے لئے مَیں چاہتی ہوں کہ ایسی نادر انمول اور اچھوتی تصویر بناؤں کہ دیکھنے والے دنگ رہ جائیں۔ مَیں نے سوچا ہے کہ ایک طوائف کی تصویر ایسی رنگ ڈھنگ سے بناؤں، جیسے وہ رہتی ہے ـــــ!"

دُنیا والے دیکھیں تو سہی، ایک رنڈی کی زندگی کیا ہوتی ہے۔ وہ کیسے

رہتی بستی ہے۔

"اِس کی زندگی میں جو کرب ہوتا ہے، وہ کرب میں رنگوں کے ذریعہ اُس کے چہرے پر اُجاگر کرنا چاہتی ہوں"

"بڑی مصیبت ہے"

وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بولے "آرٹسٹ خواتین سے زیادہ سخت مشکل ہے۔۔۔"

میں چل گئی۔

"آپ خواہ مخواہ خود کو اہمیت نہ دیجئے۔۔۔ میں یہ کام آپ کے بغیر بھی کر سکتی ہوں۔ پیشہ کرنے والی عورت، اپنے ہر ہر انداز سے پہچانی جاتی ہے۔ میں ایک آدھ دن کسی کے بھی گھر میں گھس جاؤں گی"

وہ کچھ نہ بولے۔

اب میں انہیں کیا سمجھاتی کہ میں کتنا بڑا اور کتنا اہم کام کرنے جا رہی تھی۔ مرد اور عورت کے سوچنے کا انداز کتنا الگ الگ ہوتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مجھے نہ تو اس مقابلے میں ملنے والے ایک ہزار روپے کی لالچ تھی، نہ نام و نمود کی، نہ شہرت کی۔ میں بس صرف اتنا چاہتی تھی کہ میں عام ڈگر سے ہٹ کر کوئی "یونیک" چیز پیش کروں، ایسی کہ جو بھی دیکھے ایک لمحہ کو سہی ٹھٹک کر رہ جائے۔۔۔

میں نے طے کر لیا کہ مجھے ہر حال میں ایک طوائف کی زندگی پیش کرنی ہی ہے۔۔۔ اور یہ بھی سوچ لیا کہ میں کہاں جاؤں گی۔۔۔

میرے گھر کے قریب، بہت قریب تو نہیں لیکن تھوڑے فاصلے پر میں نے چند گھر اور ان گھروں کی خواتین دیکھی تھیں جو چہرے مہرے سے صاف پہچانی

جاتی تھیں کہ وہ کون ہیں، اُن کے چہرے چلتے پھرتے اشتہار تھے کہ ہاں ہم بکنے والی چیز ہیں ——

اتنا تو خیر مَیں بھی جانتی ہی تھی کہ رنڈیوں کا "کاروبار" رات کو چلتا ہے۔ دن میں وہ خالی ہوتی ہیں۔ مگر دن چڑھے تک سوتی ہیں۔ مطلب یہ کہ گیارہ بارہ بجے سے پہلے ان کے ہاں جانا حماقت ہی ہے۔ دوپہر کے وقت ٹھیک رہے گا میں نے طے کرلیا۔

اس دن لنچ کے وقفہ میں آئے ہوئے میاں کو کھانا کھلاکر، بچّوں کو اسکول روانہ کرکے میں بھی ایک بیگ میں اپنا ضروری سامان رکھ کر ایک ٹیکسی کرکے اپنی منزل تک پہنچ گئی۔

ٹیکسی رُکنے کی آواز کے ساتھ اندر سے ایک آواز آئی :

"چنتو، جاکر دیکھ تو کس کے دروازے پر ٹیکسی رُکی ہے ؟"

اور اس آواز کے ساتھ ہی چار پانچ سال کا ایک دُبلا پتلا سا بچہ نمودار ہوا۔

اپنے دروازے پر ٹیکسی کھڑی دیکھ کر قدرے فخر اور خوشی کے جذبات سے مغلوب۔ اندر بھاگ گیا۔ ٹیکسی کا بِل ادا کرکے میں دروازہ تک کچھ جھجکتی ہوئی پہنچی ہی تھی کہ اندر سے ایک عورت نکلی۔

مجھے کئی کئی بار بے حد غور اور حیرت سے دیکھنے کے بعد وہ کچھ اٹکتے رُکتے ہوئے لہجے میں بولی ——

"آپ . . . . . . آپ کو کِس سے مِلنا ہے ؟"

میری کچھ ہمت بندھی۔ مُسکرانے کی کوشش کرتی ہوئی بولی۔

"آپ ہی سے۔"

"مجھ سے . . . . . !؟"

اس نے اپنے سینے پر انگلی رکھ کر بے حد غیر یقینی لہجے میں کہا۔

"مجھ سے!"

"جی ہاں ——"

اب کی بار میں ذرا جی کھول کر مسکرائی۔

"کیوں، آپ کو یقین نہیں آتا۔"

اور میں نے کچھ اس انداز سے قدم بڑھائے کہ وہ ذرا ہٹ کر مجھے اندر داخل ہونے کے لئے راستہ دے دے۔

مگر وہ تصویرِ حیرت بنی ابھی تک یوں ہی کھڑی تھی۔ بڑے تذبذب کے ساتھ وہ بالآخر اتنا بولی۔

"مگر آپ —— آپ عورت ہو کر . . . . ."

اب میں نے سوچا کہ اسے خواہ مخواہ سسپنس میں رکھ کر کوئی فائدہ نہیں۔ اس لئے میں صاف صاف بولی۔

"مجھے دراصل آپ کی ایک تصویر بنانی ہے مجھے پتہ ہے کہ آپ لوگ —— بہت مصروف رہتی ہیں (میں نے لفظ مصروف پر خاص طور سے زور دیا) لیکن میں آپ کا کوئی نقصان نہیں کروں گی —— ویسے آپ کا جو بھی ریٹ ہوگا —— میں اس سے کچھ زیادہ ہی دوں گی۔"

اس نے جھٹ سے زبان کھولی۔ "میں ایک رات میں بیس روپے تو کما ہی لیتی ہوں۔"

میں نے پرس کھول کر اسے چالیس روپے پیشگی گن دیئے۔ کیوں کہ مجھے یہ بھی پتہ تھا کہ رنڈیاں اپنی رقم ہمیشہ پہلے ہی لے لیتی ہیں۔

کوئی گاہک اپنا کام کر کے چلتا بنے اور پیسہ نہ دے تو بعد میں عورت ذات کر ہی کیا سکتی ہے ـــــ

بہرحال میرا سلسلہ کچھ اور طرح کا تھا۔ لیکن میں خواہ مخواہ اسے غلط فہمی کا شکار کیوں بننے دیتی۔

چالیس روپے دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ غیر یقینی انداز سے کبھی روپوں کو اور کبھی مجھ کو دیکھتی رہی۔

پھر جیسے جاگ کر بولی :

"ارے بی بی، آپ اندر تو آیئے"

اس کی آواز میں ہنسی گھلی ہوئی تھی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے گھر میں داخل ہوئی۔ گھر ـــــ ؟ گھر اسے کہنا میری دریا دلی ہے، ورنہ اس میں گھر جیسی کیا بات تھی ـــــ ؟

سڑا مارا کمرہ جس میں الگنی ڈال کر دو چار ملگجی نائلون اور سستے ریشم کی ساڑیاں لٹکائی ہوئی تھیں۔ ایک بوسیدہ سا نواڑ کا پلنگ۔ اس کے نیچے ایک صندوق، پلنگ سے لگ کر ایک میز، جس کی ایک ٹانگ کو اینٹ کے ذریعہ سہارا دے کر باقی تین ٹانگوں سے جوڑ کر سنگار میز کا درجہ دیا گیا تھا۔

اس پر پاؤڈر، ایک دو لپ اسٹک، کاجل کی کجلوٹی، تیل اور اسی قسم کی بلا بتر رکھی ہوئی تھیں۔

اسی کمرے کے ساتھ اسی چھوٹی سی جگہ میں کچھ برتن بھانڈے اس جگہ کے کچن ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔ بے دُھلے چند برتن، دو چار رکابیاں بے ترتیبی سے پڑی ہوئی تھیں۔

چولھا مٹی کا بنا ہوا تھا جس میں چند ادھ بجھے کوئلے کبھی کبھی دہک جاتے۔

ہانڈی کی خوشبو سے اندازہ ہُوا کہ ارہر کی دال اُبل رہی ہے۔
اس نے جو اس قدر غور سے مجھے حالات حاضرہ کا جائزہ لیتے ہوئے دیکھا تو کچھ شرمندہ سی ہو کر ایک رسی پر جھولتا ہوا ملگجا سا پردہ کھڑے کھینچ دیا، اور نادم سی ہو کر بولی:
"میں ابھی ابھی اُٹھی ہوں، گھر بھی صاف نہیں کیا۔ آپ بیٹھئے تو۔"
پھر خود ہی بے حد صاف دلی سے کہنے لگی۔
"اصل میں رات کو میں نے کئی دنوں بعد چار چار گاہکوں کو نپٹایا ہے، اسی لئے بہت تھک گئی تھی۔"
میں نے دہل کر اُسے دیکھا۔
رنڈی پن کی گہری چھاپ ہونے کے باوجود اس کے چہرے پر یہ تاثر کہیں نہیں تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ نے اس کے چہرے کو ڈھانپ رکھا تھا۔
"اتنی تھکن میں صبح ہی اٹھ کر صفائی وفائی اور کھانے پکانے پر کون دھیان دیتا ہے۔"
اسی لئے جب چار پیسے زیادہ بن جاتے ہیں تو میں تو ہوٹل ہی سے کھانا منگوا لیتی ہوں۔ انسان آخر اپنے آرام کے لئے ہی تو پیسہ کماتا ہے۔"
وہ پھر مسکرائی ——
میں جواباً مسکرا نہ سکی۔!
ایک عجیب ہی گھٹن کا احساس مجھے وہاں بیٹھے بیٹھے ہو رہا تھا ——
افلاس —— افلاس —— کمرے کی ہر چیز پر افلاس کی شدید چھاپ تھی۔
میں نے دل ہی دل میں اندازہ لگایا کہ یہ بدنصیب عورت رات بھر میں

بمشکل چار پانچ روپے نیا باقی ہو گی۔

بہر حال میں یہاں غم کھانے نہیں آئی تھی۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی، دو بج رہے تھے۔ میں نے نرمی سے اُسے سمجھانا شروع کیا۔

"دیکھو...." میں رُکی "تمہارا نام؟"

"میرا نام تو ویسے عائشہ ہے، آپ چاہیں تو آشا کہہ سکتی ہیں۔ میرے نام سے مجھے بڑا فائدہ ہوتا ہے، ہندو گاہک آئے تو مجھے آشا کہہ لیتا ہے، اور مسلمان ہو تو عائشہ۔ اصل میں عائشہ اور آشا سُننے میں ایک سے ہی لگتے ہیں نا ——؟"

وہ مسکرائی۔

"لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"ارے بی بی، بہت فرق پڑتا ہے۔"

وہ بڑے بے تکلفی سے ہنسی۔

"بعض بعض گاہک ایسا سر پھرا ہوتا ہے کہ چلا تو ہے وہ عیاشی اور گناہ کرنے، مگر مذہب سر پر سوار ضرور رہے گا۔"

وہ تو یہی چاہے گا —— کہ اپنی ذات کی عورت کے ساتھ ہی سوئے ——

"ایسے میں میرا نام مجھے فائدہ دے جاتا ہے۔ ویسے مجھے نام سے کیا غرض —— اپنے کام سے کام اور دام سے مطلب؟"

اس کی باتوں سے گھبرا کر میں نے سانس لی۔ اور اس سے بولی:

"اچھا تو عائشہ، تم پندرہ بیس منٹ کے لئے اس پلنگڑی پر جوں کی توں بیٹھ جاؤ۔ مجھے تمہاری تصویر بنانی ہے —— ہلنا چلنا نہیں۔ بس جیسی ہو ایسی ہی بیٹھی رہو۔"

"کنگھی نہ کروں۔ بال تو جھاڑ جھنکاڑ سے ہو رہے ہیں"۔
"ارے نا نا نا، سنگار پٹار کی ضرورت نہیں"۔
"کمرہ صاف کر دوں۔؟"
وہ پھر بولی ــــــــ
"مَیں نے کہا نا۔! مجھے ہر چیز اسی طرح چاہیئے، تم بھی۔ تمہارا کمرہ بھی۔ تمہارا سامان بھی"۔
اصل چیز ماحول اور بیک گراؤنڈ ہی تو تھا، جس سے مَیں چہرے کا کرب اور تاثر گہرے سے گہرا کر سکتی تھی۔
"کم سے کم ساڑی بدلنے دیجئے بی بی، دیکھئے تو کیسی گنجل گئی ہے"۔
"دیکھو عائشہ"۔
مَیں نے اُسے سمجھایا ــــــــ
"مجھے تمہاری یہ تصویر ایک مقابلے میں بھجوانی ہے، اور تصویر کی ساری خوبی، اس کی سادگی میں ہوگی، اس لئے تم سجنے و جنے کے چکر میں نہ پڑو۔ بس چند منٹ کے لئے چپ چپکی بیٹھی رہو ــــــــ"
"چپ چپکی"۔ وہ چلائی ــــــــ "نا نا بی نا۔ میری تصویر چپ چپکی نہ بنانا ــــــــ ہنستی ہوئی بنانا۔ آپ کو پتہ ہے، ایک عورت ــــــــ میرا مطلب ہے مجھ جیسی پیشہ ور عورت کے لئے مسکراہٹ کتنی ضروری ہوتی ہے ــــــــ چہرے پر ہنسی نہ ہو تو گاہک بھی لات مار کر چلا جائے گا ــــــــ"
"ارے بی بی کوئی اپنا پیسہ خرچ کرے گا تو اس لئے نا کہ وہ گھڑی دو گھڑی جی بھی خوش ہو، روتی بسورتی صورت سے کوئی مرد پیار کرے گا۔۔۔؟"
اسی لئے تو اتنے دُکھ سہہ کر بھی مَیں نے کبھی اپنی مسکراہٹ نہیں کھوئی ــــــــ

مجھے تو یاد بھی نہیں کہ زندگی میں میں کبھی ایک منٹ کو بھی اپنی ہنسی سے بچھڑی ہوں،
آپ کو ایک بات سناؤں ——
" ہوں تو میں دُبلی پتلی سی عورت، ایسی عورتیں مرد کے لئے کیا ہوتا ہے۔
کچھ بھی تو نہیں۔
بعض جگہوں پر تو عورت کو مرد کے لئے ابھرا ابھرا ہونا ہی چاہیئے۔ میرے
ساتھ بھی یہی مصیبت تھی بی بی، سو آپ جانیں۔
میں نے ربر کے کپس والی چولی پہننی شروع کر دی۔ اس سے کچھ تو ابھار
میرے میں پیدا ہوا۔ لیکن ایک رات ایک گاہک نے جذبات میں آ کر جب
مجھے دبوچنا شروع کیا تو مجھ میں کیا دھرا تھا۔ بس میری ربر کی چولی اُس
کے ہاتھ میں آ گئی۔
کوئی اور عورت ہوتی تو اپنی ایسی دردناک ذلت پر رو رو مر جاتی، مگر
میں تو ہنسے ہی گئی، ورنہ وہ تو یوں ہی میرے پہلو سے اٹھ کر چلا جاتا۔ ایک
اچھی عورت کا کام ہی یہ ہے کہ مرد اس کے پاس سے خوش خوش جائے "
" اُفوہ عائشہ، تم کس قدر باتونی ہو "
میں نے دل ہی دل میں گھبرا کر سوچا، بولی کچھ نہیں۔ پتہ نہیں بےچاری
کو اپنا دِل ہلکا کرنے کے لئے کتنے دِنوں بعد ایک ساتھی جڑا تھا۔
موضوع بدلنے کو میں بولی :
" تم بمبئی کی تو نہیں معلوم ہوتیں "
" جی نہیں، میں یوپی سائڈ کی ہوں، اب تو بمبئی میں رہتے رہتے اپنی بات
چیت پر بھی یہیں کا رنگ چڑھ گیا ہے۔ ویسے شہر بدلنے سے قسمت تھوڑی بدل
جاتی ہے بی بی، میری قسمت میں صرف جسم بیچنا تھا، سو جہاں بھی رہوں گی بیچتی

رہوں گی ۔"

"اچھا عائشہ اب تم پلنگ پر اس طرح بیٹھو کہ تمہارا جسم پوری طرح میری نظروں کی زد میں رہے لیکن خود تمہاری آنکھیں مجھ پر مرکوز نہ ہوں ۔"

اسی دم وہی چھوٹا سالڑکا جو اتنی دیر سے جانے کہاں غائب ہو گیا تھا، آن ٹپکا ــــــ

"اماں مجھے بھوک لگی ہے روٹی دو ۔"

میں نے حیرت سے عائشہ کو دیکھا ۔" یہ ــــــ یہ تمہارا بچہ ہے ؟"

"ہاں، بی بی جی ــــــ !" اور وہ پلنگ پر سے پھدّ سے کودی ۔

"رنڈی کو اولاد خدا نہ دے ۔ اور جو دے تو پھر لڑکی دے کہ بڑھاپے کا آسرا ہو ۔"

"یہ کم بخت مارا پیدا ہو کر ہی رہا ۔ حالانکہ میں نے پیٹ گرانے کی کتنی دوائیں گرم ٹھنڈی کھائیں کہ کوئی جیسا غیرت دار ہوتا تو پانی بن کر نکل جاتا ــــــ لے مر ــــــ "

اِس نے اسی رَو میں ہانڈی میں سے دال اُلٹ کر ایک رکابی اس کے سامنے پٹخی ، اور جانے کب کی سوکھی ماری ایک روٹی نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دی ۔

میں بے بسی سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہی !

" عائشہ مجھے صرف آدھا گھنٹہ سلیقے سے بخش دو ــــــ

میں نے دِل ہی میں التجا کی ، مونھ سے نہ کہہ پائی ۔

"اب جلدی سے کھا اور مر چک ۔"

بچہ ممنایا ــــــ

"دال میں نمک نہیں ہے، اور روٹی کتنی کرڑک ہے ——"

"ہاں، تیرے باپ نے تو ہوٹل کھول رکھی ہے نا کہ تازہ بہ تازہ آئے گا، جو بھی ہے جلدی سے کھا اور غائب ہو!"

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو گئی۔

"ارے بی بی، اس حرامی سے بھی میرے کام میں اس قدر حرجہ پڑتا ہے کوئی کوئی ضرورت کا مارا دِن میں بھی آجاتا ہے تو یہ موا ٹلتا ہی نہیں، جب تک کہ دس پانچ پیسہ ہاتھ پر نہ دھرو ——

"مہنگائی اس غضب کی، اس سؤر کے جنے کے لئے کہاں سے دس پیسہ روز لاؤں"

"تم تو کہتی تھیں یں روزانہ بیس کما ہی لیتی ہوں"

میں نے کہنا چاہا لیکن خاموش رہ گئی۔

مصلحتاً بے چاری نے کہا ہو گا، ورنہ وہ تو اس کے حال حُلئے اور رہن سہن سے ہی ظاہر تھا کہ کیا کماتی ہو گی اور کیا گنواتی ہو گی۔

اسی دم دوُ انگل کی انگنائی میں سے ہوتا ہوا ایک مُسٹنڈا سیدھا وہیں چلا آیا، جہاں ہم دونوں بیٹھے تھے اور بے انتہا لاپروائی سے بولا:

"اری او عائشہ، دلاری کے پاس گاہک آیا تھا، لیکن آج اس کو تیسرا ہی دِن تھا، تو نپٹ نے ——"

اور جیسے آیا تھا ویسے ہی چلتا بنا۔

اُس کے جاتے ہی ایک اور مَرد گھر میں داخل ہوا۔ میں لرز اُٹھی۔

"اللہ —— ! میں بھی یہ کس مصیبت میں پھنس گئی آج —— !"

میری موجودگی سے بے نیاز عائشہ خوشی سے جھومتی ہوئی اُٹھی، بچے کے

سر پر پہلے تو ایک ٹھونگ ماری، کھانا جلدی ختم کرنے کے لئے ایک گالی
سے نوازا، اور پھر میرے پاس آکر بڑی لجاجت سے بولی :

"آپ تو بی بی جی بڑی اچھی ہیں۔ جہاں اتنی دیر ٹھہریں، تھوڑی دیر
اور سہی، یہ ہمارا پرانا گاہک ہے۔ اس کی بیوی بڑی لڑاکا ہے۔
رات کو دیر سے گھر جائے تو مارنے سے کبھی نہیں چوکتی۔ اس لئے اکثر
بے چارہ دن میں ہی چلا آتا ہے۔ بس دس منٹ لوں گی، اتنے میں آپ کو انگنائی
میں کرسی ڈال کر بٹھائے دیتی ہوں۔ برا نہ مانئے گا۔"

"میں پھر کل وَل آؤں گی۔"

میں گھبرا کر بولی :

"یا ان صاحب سے کہہ سکو تو کہہ دو کہ کل یا کبھی اور تشریف لائیں
تو لے آئیں۔"

"ارے بی بی، مرد ذات کو جب بھوک لگ آئے تو وہ کل وَل کی راہ
نہیں تکتا، وہ اب ٹلنے والا نہیں، اور آپ کو کیسے ناں بولوں ——
بس چند منٹ ——"

اور وہ کھٹاک سے پردے کے پیچھے غائب ہو گئی۔

چند منٹ بعد اس نے سر نکال کر جھانکا —— اب وہ پکی طوائف
نظر آرہی تھی۔

پوڈر، لپ اسٹک، کاجل، مِسّی یعنی ہر ہر چیز کا اس نے بافراط استعمال
کیا تھا۔ اور چہرے پر ملنسی بکھیرے آواز دے رہی تھی :

"اے سبحان۔ جلدی کرو، مجھے اور بھی کام ہیں۔"

چنتو کو اس نے ایک دھپ مار کر اٹھایا۔ اور پانچ پیسے کا سکہ پکڑا کر

دروازے سے باہر کر دیا۔
میں نے زندگی میں کبھی اتنی پریشانی محسوس نہیں کی تھی۔ نہ تو اچھا ہوا کہ میری اسکیچ بک میرے پاس تھی۔
میں بیٹھی آڑی ترچھی لکیریں کھینچتی رہی ——— ورنہ اللہ جانے میرا کیا حشر ہو جاتا۔
چند منٹ خاموشی سے گزرے، پھر لڑنے جھگڑنے جیسی آوازیں آنے لگیں۔
عائشہ اونچے لہجے میں بول رہی تھی ———
"ارے تیری گرہ سے تو کچھ نہیں جاتا ——— بس ریلوے اسٹیشن پر بیٹھے بابو لوگ کی کتاب میں دستخط کرو اور جتنے چاہے اٹھا لاؤ۔ اس میں بھی تیری جان نکلتی ہے ———"
"تو تو خود ہی کیوں نہیں لے آتی؟"
مرد بھی چڑ گیا ———
"ارے واہ وہ کوئی عورتوں کے استعمال کی چیز ہے، جو وہ بابو مجھے دے دے گا ———"
"تو پھر مول خرید کر لے آیا کر ———"
"اور جو تو ہی لے آیا کرے تو؟ پندرہ پیسے میں تین تو ملتے ہیں، کچھ تیرا خاندان تو نہیں چلا جاتا پندرہ پیسوں میں!" وہ تڑخ کر بولی۔
مرد نے بھن کر کے پندرہ پیسے کے سکے فرش پر اچھالے اور پتلون سنبھالتا ہوا باہر چلا گیا۔
عائشہ پھر میرے پاس آ بیٹھی، اور معذرت کے سے لہجہ میں بولی:

"بی بی جی، اب قسم سے کوئی حرج نہیں ہوگا"
لیکن اسی لمحہ چنو پھر روتا ہوا آن مرا، اب کی بار وہ غبارہ کی ضد لگائے ہوئے تھا۔
عائشہ پھر سے اُٹھ کر اندر لپکی۔ تھوڑی دیر میں وہ سفید پنی میں لپٹا ہوا ایک غبارہ لے آئی۔
ہونٹوں سے لگا کر اس نے جو زور سے پھونک ماری تو وہ سفید ربڑ کا غبارہ پھولتا ہی گیا، اور پھولتے پھولتے تربوز جتنا بڑا ہو گیا۔
"فیملی پلاننگ زندہ باد"
میں نے دِل ہی دِل میں سوچا۔
پھر وہ ایک دھاگہ لائی اور اس نے اس کا موتھہ کس کر باندھ دیا۔
اور چنو کو ڈانٹ کر بولی:
"اب پھوڑا تو دوسرا نہیں دوں گی! یاد رکھنا، مفت نہیں ملتا۔ پانچ پیسے میں ایک آتا ہے حرامی"
وہ پھر میری طرف دیکھ کر ہنسی۔
"ویسے پانچ پیسے کا بھی ہے تو میری گرہ سے کیا جاتا ہے۔ میں نے تو اپنے ہر گاہک سے بات پکی کی ہوئی ہے کہ جو بھی میرے پاس آئے گا، دس بارہ "نرودھ" ضرور لا کر دے گا"
وہ بے حد خوش دِلی سے ہنسی۔
"اور کیا بی بی جی، بازار سے رنگین غبارہ لو تو موا پندرہ پیسے سے کم کا نہیں ملتا۔ اور اتنے چھوٹے کہ بس! خدا حکومت کا بھلا کرے۔ فیملی پلاننگ کے سامان سے کتنی آسانی ہے۔ میرے ساتھ والیوں کے بھی بچے انہیں غباروں

سے کھیلتے ہیں——"

میں نے اپنے آپ کو کوسا۔

"اگر تصویر بنانے کے چکر میں نہ پڑتی تو کون سی اُفتاد آن پڑتی۔ مگر اب تو بُری طرح کھپ چکی تھی۔

اسے شاید میری بات یاد تھی —— "ایک منٹ" کہہ کر گئی اور کنگھی بگاڑ کر، پوڈر، لپ اسٹک پونچھ پانچھ کر وہ پھر پہلے جیسی عائشہ بن کر میرے سامنے آکر بیٹھ گئی —— میری کرسی اس نے پہلی والی جگہ پر رکھ دی تھی۔ اور کہنے لگی:

"بس اَب میں بالکل نہیں بولوں گی بی بی —— مگر تصویر ذرا مُسکراتی ہوئی بنائیے——"

"ٹھیک ہے"

میں مرے دِل سے بولی، وہ تو مُسکرا رہی تھی۔ مگر میرا دِل بڑا بجھا بجھا سا تھا۔ کم سے کم وہ خوشی بالکل مفقود ہو چکی تھی جو کسی فن کار کے دِل میں کسی تخلیق کو اُبھارتے ہوئے پیدا ہو جایا کرتی ہے۔

بہرحال میں جلدی جلدی پنسل چلانے لگی۔ میں نے سوچ لیا تھا، اس ماحول میں کیا خاک رنگ آمیزی ہو گی۔ بس یہ ہے کہ اسکیچ بنا لوں، گھر جا کر اطمینان سے مَن چاہے رنگ بھروں گی۔

مگر عائشہ! وہ بولے بِنا رہ سکتی تھی! آپ ہی آپ پھر بک بک کرنے لگی۔

"حرامزادہ صرف دو ہی روپے پکڑا کر چلتا بنا، میں نے سوچا تھا، پُرانا گاہک ہے، کاہے کو پیشگی کا مُطالبہ کروں، مگر مطلب پورا ہوتے ہی حرامی

شک گیا۔"

"عائشہ پلیز ..... "

میں نے اسے بڑی منت سے دیکھا۔ وہ حسبِ عادت مسکرا رہی تھی۔

میں نے غور سے اسے پہلی بار بھی دیکھا۔ کھلتا ہوا رنگ۔ گھنے گھنے سیدھے بال، کافی بڑی اور روشن آنکھیں، تیکھی سی ناک، بالش کی کھچّی سا چپکا ہوا جسم، لیکن سب سے نمایاں چیز ہنسی اور مسکراہٹ میں ڈوبے ہوئے لس لس کرتے دو ہونٹ! اگر گردن سے نیچے کوئی اُسے نہ دیکھے تو اس صورت اور مسکراہٹ پر قربان ہو جائے۔

عائشہ جھوٹ نہیں کہتی تھی، اس کا سارا مول اس ہنسی میں ہی پوشیدہ تھا۔ جو اس نے کڑے حالات میں بھی کبھی نہیں بیچی، کبھی نہیں کھوئی۔

واقعی اس مسکراہٹ کو کاغذ پر بھی زندہ رہنا ہی چاہیئے۔

میں پورے انہماک سے ہونٹ بنانے لگی۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد میں نے سر اٹھایا، جیسے بڑے بوجھ سے مجھے چھٹکارہ ملا ہو۔

"عائشہ! یہ میرے لئے چند منٹوں کا کام ہے۔ لیکن تم نے میرے کتنے گھنٹے ضائع کئے۔"

وہ خوش دلی سے مسکرائی: "چلئے آپ کا کام تو نپٹ گیا۔ مگر ایک نظر مجھے بھی تو دکھائیے۔"

اور اس نے میرے ہاتھ سے اسکیچ بک لے لی۔

لیکن ایک دم اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ہمیشہ ہنستے مسکراتے رہنے والے چہرے کا سارا انداز ہی دوسرا ہو گیا۔ وہ چیخی:

"میں نے آپ سے آگے ہی کہا تھا بی بی کہ سب کرنا لیکن میری صورت ہنستی ہوئی بنانا، آپ کو پتہ بھی ہے کہ ہنسی کا کیا مول ہوتا ہے۔ اب آگے کسی نے میری بگڑی صورت اور بھینچے ہوئے ہونٹ دیکھے تو میرے دھندے کا کیا ہوگا۔ آپ تو جب سے آئی ہیں مجھے ہنستا ہوا دیکھ رہی ہیں۔ پھر آپ نے میری ہنسی کہاں پہ کھو دی؟" اور اس نے جھلا کر اسکیچ زور سے پٹخ دی۔

میں نے مرے مرے ہاتھوں سے اسکیچ بک اٹھائی اور جھک کر غور سے دیکھنے لگی۔

واقعی عائشہ تو ہمیشہ مسکراتی رہنے والی ایک ہنسی کا نام ہے۔ پھر میں نے ایسی تصویر کیسے بنا ڈالی۔ لیکن ایک اچھی بھلی ہنستی صورت کو اُجاڑنے میں کیا واقعی میرا ہاتھ تھا؟ میں نے تو یہ مسکراہٹ نہیں چھینی ——— پھر میں کسے دوش دوں؟

---

الیاس سیتاپوری
کے قلم کی جادوگری کا چوتھا شاہ کار
چاند کا خدا
اُن انسانوں کی کہانیاں جو بادشاہ تھے، وزیر تھے، مصاحب تھے، امیر تھے، فن کار تھے، پرستار تھے، عاشق تھے، محبوب تھے، رقیب تھے، جھوٹے تھے، سچے تھے۔ انسانوں کے وہ سارے رُوپ جو ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ گرنت، نشہ، سحر، سوز و گداز وہ سب جو آپ چاہتے ہیں۔ قیمت: پندرہ روپے۔
الیاس سیتاپوری کے دیگر شاہ کار، جو شمع بک ڈپو نے عمدہ کاغذ پر آفسیٹ سے شائع کئے ہیں:
عجائب خانۂ عشق
پندرہ روپے
اندر کا آدمی
دس روپے
راگ کا بدن
دس روپے
آج ہی ایک پوسٹ کارڈ لکھ کر گھر بیٹھے وی پی سے منگوا لیجئے، یا اپنے اخبار فروش سے طلب کیجئے
شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
ایجنٹ حضرات اپنے آرڈر جلد از جلد بھیجیں!